ماہنامہ

پگڈنڈی امرتسر

سیّد سجّاد حیدر

یلدرم نمبر

قیمت: چار روپے

[T]itle, Pictures & Advertisements Printed at PIONEER PRESS, Hall Bazar, Amritsar. Phone 359

اُمید، حرکت اور روشنی کا پیامبر

ماہنامہ

پگڈنڈی

امرتسر

جلد ۹ ‏‏‏‏‏ شمارہ ۵

مدیر
امریک آنند

قیمت سالانہ ‏‏‏‏‏ ‎-/6

قیمت خاص نمبر ‏‏‏‏‏ ‎-/4

سجاد حیدر یلدرم نمبر

ٹیلی فون

گھر (ایڈیٹر) ۴۷۹۳

دفتر ۲۲۲۴

ادارہ ادبستان اُردو ہال بازار امرتسر

اے-ایس آنند ایڈیٹر پرنٹر پبلشر و مالک نے کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ پگڈنڈی ہال بازار امرتسر سے شائع کیا۔

سجاد حیدر یلدرم نمبر

مرتبہ

سید مبارز الدین رفعت ایم۔اے
[اُستاد گورنمنٹ سائنس اینڈ آرٹس کالج گلبرگہ (میسور اسٹیٹ)]

فہرست مضامین

سجاد حیدر یلدرم نے "خانی خان" کے قلمی نام سے بھی مضامین لکھے ہیں - ان میں ایک مضمون جو حسرت موہانی کے بارے میں ہے میں نے رسالہ نگار [illegible] کے شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء میں شائع کیا تھا - [illegible]

امریک آنند

جانِ سخن

ہم نے فروری ۱۹۶۱ء میں یلدرم نمبر پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن یہ اب تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عین وقت پر ہمیں بہت سے اچھے مضامین ملتے رہے، جن میں خواجہ غلام السیدین صاحب اور محترمہ قرۃ العین حیدر کے مضامین لائق ذکر ہیں۔ اس نمبر میں کچھ مضامین تو وہ ہیں جو مختلف اوقات میں یلدرم کی شخصیت پر لکھے گئے اور اب یہاں دوبارہ پیش کئے جا رہے ہیں۔ کچھ مضامین خاص اسی نمبر کے لئے لکھوائے گئے ہیں۔ پھر سید سجاد حیدر مرحوم کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریریں شامل ہیں۔ بعض اہم تصاویر کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ جس سے نمبر کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔

ہم ادارے کی طرف سے سید مبارز الدین رفعت کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ایسی محنت اور عرق ریزی سے یہ مفید نمبر ترتیب دیا اور ادارۂ ادبستان اُردو کو اشاعت کے لئے مرحمت فرمایا — جناب نثار احمد فاروقی اور محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ نے اس کی ترتیب و طباعت کے سلسلے میں جو مفید مشورے دیئے، ہماری اعانت کی اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کے لئے کوشش کی اس کے لئے بھی ادارۂ ادبستان اُردو کی طرف سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد ”منافع خوری“ یا ادب کے نام پر کاروبار کرنا نہیں ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اردو کی اہم تاریخی شخصیتوں کے بارے میں (خصوصاً ایسی شخصیات جن کی خدمات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے) کم سے کم سال میں ایک نمبر اسی شان کے ساتھ پیش کر دیا کریں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی سجاد حیدر یلدرم نمبر' کے رُوپ میں آپ کے سامنے ہے۔ اگر آپ حضرات نے اسے پسند کیا اور ہماری حوصلہ افزائی کی اور اسے اردو پڑھنے والے حلقوں میں، اپنے شہر کے

کتب خانوں میں اور کالجوں میں اچھی طرح روشناس کرایا تو اُردو کی خدمت کا یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے ورنہ اس گرانی کے زمانے میں کوئی ضخیم نمبر چھاپ دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کا جُوا ہے جس میں ہار اور جیت کا مساوی امکان ہے۔ اگر ہم نے جس بے لوث محبت کے ساتھ ایسے ادبی کاموں کے آغاز کا حوصلہ کیا ہے، اس کی داد آپ سے نہ ملی تو ظاہر ہے کہ قارون کے خزانے بھی کسی ایسی اسکیم کو نہیں چلا سکتے۔ سنہ ۱۹۶۲ء کے لئے ہمارا ارادہ ہے کہ ایسا ہی ایک مفصل، مربوط، جامع اور ضخیم نمبر اُردو کے بہترین طنز نگار اور انشا پرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی (سابق صدر شعبہ اُردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) کی شخصیت اور ادبی کارناموں کے بارے میں پیش کریں گے۔ انشاء اللہ۔

مگر پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہماری اس عرق ریزی کی داد آپ سے کس طرح ملتی ہے! اسی پر مستقبل کی تجاویز کا دار و مدار ہے.. ورنہ بقول اکبر الہ آبادی ؎

چھپا دیواں مرا تو شور تحسیں بزم سے اُٹھا
مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

نثار احمد فاروقی

پیش گفت

چند ماہ ہوئے، جب میں رسالہ پگڈنڈی امرتسر کی مجلس مشاورت سے متعلق تھا تو میں نے جناب سید مبارز الدین رفعت ایم۔ اے (اُستاد اُردو، گورنمنٹ کالج گلبرگہ) سے درخواست کی تھی کہ وہ اُردو کے مشہور انشا پرداز اور افسانہ نگار سید سجّاد حیدر یلدرم کے بارے میں ایک کتاب ایسی مرتب کردیں جس میں نئے مضامین خواہ تھوڑے ہی ہوں، لیکن اب تک اُردو کے مشہور ادیبوں اور مستند ناقدوں نے یلدرم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور مختلف رسالوں کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے، وہ سب یکجا کردیا جائے۔ علاوہ ازیں اس نمبر کی ترتیب اس نہج سے کی جائے کہ یلدرم کی شخصیت بھی روشنی میں آجائے اور اُن کے ادبی کارناموں پر بھی سیر حاصل تبصرہ ہوجائے کیونکہ مجھے یہ علم تھا کہ میرے عزیز دوست جناب مبارز الدین رفعت اپنے زمانۂ طالب علمی سے یلدرم سے اور ان کی تحریروں سے قلبی رابطہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے میری ...... درخواست پر یہ ذمہ داری اپنے لئے قبول کرلی اور میں بے حد ممنون و مسرور ہوں ـــ کہ وہ اس سے پوری طرح عہدہ برآ ہوئے۔ اُنھوں نے ان مضامین کو ایسی محنت اور سلیقے سے ترتیب دیا ہے کہ اب یہ نمبر یلدرم پر مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ پگڈنڈی کے ایڈیٹر جناب امریک آنند بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اسے خاص نمبر کی شکل میں شائع کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ وہ نو برس سے پگڈنڈی نکال رہے ہیں اور ایسے عزم و استقلال کے ساتھ کہ اُس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ اُن سے ذاتی قربت اور واقفیت کی وجہ سے میں یہ جانتا ہوں کہ اس رسالے میں اُنھیں کسی طرح کی مالی منفعت نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی گھاٹے کا سودا کرنا پڑتا ہے، مگر اُن کا جذبۂ ادب دوستی اور اُردو زبان سے بے پناہ محبت ہر قدم پر اُن کا حوصلہ بڑھاتی ہے چنانچہ وہ ہر ایسے کام کے لئے سود و زیاں کا خیال کئے بغیر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ جس میں کوئی پہلو اُردو زبان یا ادب کی خدمت کا موجود ہو۔ ان کا یہی جذبہ پگڈنڈی کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

اب یہ نمبر آپکے سامنے ہے۔ مضامین کے لحاظ سے تو ہم یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس کی قیمت زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھے گی اور نقوش (لاہور) کے پطرس نمبر کے سوا دوسری کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی کہ کسی رسالے نے اتنا وقیع، ضخیم، اتنا اچھا اور شاندار نمبر کسی ایک شخصیت کے بارے میں پچھلے پندرہ برس کے اندر پیش کیا ہو۔ رہا حُسنِ ظاہر اور کتابت و طباعت کا معاملہ۔ سو اُس کے لئے ہم مجبور ہیں کیونکہ امرتسر اُردو کی اشاعت کا مرکز نہیں ہے۔ یہاں اب نہ تو اُردو کے اعلےٰ درجہ کے خوش نویس ملتے ہیں، نہ پریسوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اگر امرتسر میں اشاعتی کاروبار زیادہ بڑے اور وسیع پیمانے پر ہوتا تو یہاں طباعت و کتابت کے وسائل بھی بہتر سے بہتر میسر ہوسکتے تھے۔ دوسرے شہروں میں طباعت کرانے سے پرچے کا وقت پر شائع کرنا ادارے کے لئے مشکل ہے۔ پھر بھی ہم یلدرم نمبر کی طباعت کو "بُرا" نہیں کہہ سکتے۔

میں یہ بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر چند سطریں یلدرم مرحوم کے بارے میں اور کچھ باتیں اس نمبر کے مرتب سید مبارز الدین رفعت صاحب کے متعلق عرض کردوں۔

سجاد حیدر یلدرم مرحوم اُردو کے بہترین انشاپرداز تھے۔ مشہور افسانہ نگار اور اُردو کی لائق فخر ادیبہ محترمہ قرۃ العین حیدر انھیں کی صاحبزادی ہیں۔ قرۃ العین کا اردو میں کیا مرتبہ ہے، اس بحث کو تو سردست ملتوی کیجئے کیونکہ اس کا حق چند جملوں اور تعریف کے رسمی فقروں میں ادا نہیں ہوسکتا۔ البتہ یلدرم مرحوم کو چونکہ نئی نسل بھولتی جارہی ہے اس لئے یہ نمبر اُن کی یاد تازہ کرے گا، اُن کے کارناموں پر روشنی ڈالے گا اور بتلائے گا کہ اُردو کو "بسم اللہ کے گنبد" سے نکال کر مغربی ملکوں کی ہوا کھلانے والا نیز ترکی کے بہترین ادبی شہپاروں کو سب سے پہلے اُردو زبان میں منتقل کرنے والا شخص یہی سجاد حیدر یلدرم ہے۔ یلدرم نے ہلکے پھلکے انشائیے بھی لکھے، ڈرامے بھی، افسانے اور ڈرامے بھی۔ غیر ملکی ادب کے تراجم سے بھی ہماری زبان کو مالا مال کیا اور اُسے ایک ایسا جاندار اسٹائل دیا جو ہر طرح کے مطالب و مضامین کو

سنہ ۱۹۰۲ء کا ایک نایاب تاریخی گروپ فوٹو!

سید سجاد حیدر یلدرم بحیثیت پریذیڈنٹ ایم، اے، او کالج علی گڑھ

یلدرم (کرسیوں کی قطار میں) دائیں طرف سے دوسرے نمبر پر ہیں

۱۹۳۵ء کی ایک تصویر

نذر سجاد حیدر قرۃ العین حیدر مصطفےٰ حیدر

سید سجاد حیدر یلدرم کی ایک عکسی تحریر

121 Fyzabad Road
Lucknow
16/6/42

مائی ڈیر [illegible] —

ابھی ایک لفافہ تمھارے نام پوسٹ کر چکا ہوں

اسمیں جو عبارت ڈراما میں بڑھانے کے لئے بھیجی ہے

اسمیں مناسب موقع پہ اضافہ اور کر دیتا ہوں یعنی

مکمل عبارت کچھ اس طرح ہو۔

جج پبلک پراسیکیوٹر: ملزم نمبر ... (جو نمبر ۳) ہے

سزا الزام ہے ~~[illegible]~~ اس نے

ایک لڑکی سے شادی کرنی چاہی، اور جب اس

لڑکی نے یہ شرط کی کہ وہ اپنی بیوی کو پہلے طلاق دیدے

تو ملزم نے اپنی بیوی کو بلا قصور، محض اس لڑکی سے

شادی کرنے کے لئے طلاق دیدی

جج: قطعی جائز ہے اور آج کل کے زمانے میں ملزم

بری کیا جاتا ہے

تاروں کی رسید سے مطلع کرنا

۸ جون کا سرگذشت

تم کو ۱۶ جون کو ملا!!

تمھارا

سجی

سید سجاد حیدر یلدرم   قرۃ العین حیدر

یہ تصویر یلدرم کے انتقال سے صرف تین دن پہلے اِن کے
مکان کے باغ میں لی گئی تھی!

۱۹۲۶ء کا ایک یادگار گروپ فوٹو

کرسیوں پر بائیں سے دائیں :- ۱- انیس احمد رضوی - ۲- سید سجاد حیدر یلدرم - ۳- ابوالاثر حفیظ جالندھری - ۴- ایم-ایم شریف
۵- جلیل احمد قدوائی - ۶- رشید احمد صدیقی - ۷- شفیق احمد غازی

پچھلی قطار میں بائیں سے دائیں ۱- قاضی عبدالسلام انصاری - ۲- عظمت علی واسطی - ۳- ظہیر الاسلام قریشی - ۴- ظہیر الدین - ۵- اظہر علی خان

امریک آنند

سید مبارز الدین رفعت

اپنے دامن میں سمیٹ سکے ۔ یہ بات آج چاہے اتنی غیر معمولی نہ معلوم ہو، کیونکہ اب ہمارے ادب کی رفتار تیز ہوگئی ہے اور اس میں مسائل و موضوعات کی بھی کثرت ہو چلی ہے لیکن اُس دَور کے نقشے میں دیکھیئے جب افسانے، ڈرامے اور انشائیہ کا وجود بھی نہیں تھا۔ تو یلدرم کی خدمات کا وزن و وقار محسوس ہوگا۔

اس نمبر میں خواجہ غلام السیدین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، مولانا صلاح الدین احمد، نیاز فتح پوری اور قرۃ العین حیدر کے مضامین بھی شامل ہیں جن سے نہ صرف یلدرم کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان کے ادبی کارناموں کا معیار بھی متعین ہوتا ہے چونکہ یہ نمبر تمام و کمال یلدرم ہی کی شخصیت اور فن کے بارے میں ہے اس لئے یہاں اس پر زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہے ۔

البتہ سیّد مبارز الدین رفعت کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ۔ سب سے پہلے اُن کے حالات زندگی (اختصار کے ساتھ) پھر ان کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ ۔

رفعتؔ کے آباؤ اجداد عادل شاہی دَور میں بیجاپور پہنچے تھے ۔ اُن کا خاندان علم و فضل کے ساتھ فقیری و قلندری میں ممتاز رہا ہے۔ بیجاپور میں حضرت سید شاہ حبیب اللہ بیجاپوری جن کا مزار "موتی گنبد" کے نام سے آج بھی مشہور ہے، ان کے مورث اعلیٰ ہیں جب عادل شاہی حکومت کا خاتمہ ہوا تو یہ خاندان نلور اور مدراس ہوتا ہوا حیدرآباد پہنچا اور یہاں سکونت اختیار کی ۔ رفعتؔ کے دادا نے خاندان میں پہلی بار مغربی تعلیم حاصل کی اور ریاست میں انجنیئر مقرر ہوئے ۔ اُن کے فرزند سیّد نظام الدین محکمۂ جنگلات کے افسر تھے یہی سید مبارز الدین رفعتؔ کے والد ہیں

رفعتؔ کا ننھیال بھی حیدرآباد کا ایک ممتاز خاندان ہے ۔ ان کے نانا حضرت سیّد محمود مکی (عرف مکی میاں) اپنے زمانے کے مشہور و میر طریقت گذرے ہیں اور آج بھی مولانا سیّد بادشاہ حسینی اور مولانا عبد القدیر صدیقی اسی خاندان کے ممتاز افراد ہیں ۔ رفعتؔ صاحب کی ولادت ۱۲ر نومبر ۱۹۱۸ء کو حیدرآباد میں ہوئی - ۱۹۴۳ء میں فارسی میں ایم ۔ اے کیا - ۱۹۴۴ء میں سٹی کالج حیدرآباد میں فارسی کے لکچرر مقرر ہوئے اور ۱۹۴۵ء میں اسی خدمت پر اورنگ آباد کالج میں ان کا تبادلہ کر دیا گیا ۔ ۱۹۵۱ء میں ناگ پور یونیورسٹی سے اُردو میں ایم ۔ اے کیا ۔ ۱۹۵۴ء میں ان کا تبادلہ گلبرگہ کالج میں ہوا ۔ صوبوں کی نئی تقسیم کے بعد اب یہ کالج حکومت میسور کی نگرانی میں چل رہا ہے اور "گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج گلبرگہ" اس کا نام ہے ۔ رفعتؔ صاحب یہاں شعبۂ فارسی و اُردو کے استاد ہیں۔

رفعتؔ کو ابتدا ہی سے مضامین لکھنے کا شوق رہا ہے ۔ کالج اور یونیورسٹی میں جب پڑھتے تھے تو وہاں میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے ۔ آہستہ آہستہ یہ ذوق نکھرتا گیا ۔ اب اُن کا شمار اُردو کے بہترین لکھنے والوں میں ہوتا ہے اور ان کے مضامین معارف، نگار، نقوش، اردو، اردو ادب وغیرہ بہترین علمی مجلّوں اور رسالوں میں شائع ہوتے ہیں

لیکن ایسے مضامین سے قطع نظر ان کا اختصاصی درجہ تراجم میں ہے ۔ انہوں نے مختلف علوم و فنون کی مفید کتابیں اردو زبان میں ایسے سلیقے سے منتقل کی ہیں کہ وہ عام ترجموں کے برخلاف مقبول بھی ہوئیں اور ہمارے علمی سرمائے میں اچھا اضافہ بھی گئیں ۔ اُن کی تصانیف، تراجم اور مرتب کی ہوئی کتابوں کا خاکہ یہ ہے:-

(الف) تصانیف :-

(۱) مشاہیر کی بیویاں — حصہ اوّل — ادارہ اشاعت سیاسیہ حیدرآباد — ۱۹۴۴ء

(۲) مشاہیر کی بیویاں — حصہ دوم — ادارہ اشاعت سیاسیہ حیدرآباد — ۱۹۴۵ء

(۳) دامن تہی (افسانوں کا مجموعہ) — ادارہ دانش و حکمت حیدرآباد — ۱۹۴۵ء

(۴) عرب کا خلیفہ اور ہندوستان کی شہزادی — عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد — ۱۹۴۶ء

(۵) سالار جنگ میوزیم (تعارف) — سالار جنگ میوزیم کمیٹی حیدرآباد — ۱۹۵۷ء

(۶) پن چکی اور نگ آباد اور اس کی تاریخ — ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد — ۱۹۵۷ء

(۷) مقام غالب (طلبہ کے لئے غالب کی زندگی اور تصانیف کا تعارف) — ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد — ۱۹۶۱ء

(۸) مقدمہ آثار الوزرا (مقالہ برائے امتحان ایم-اے) .. .. زیر طبع

(ب) ترتیب و تالیف :-

(۹) مقام جمال الدین افغانی — نفیس اکیڈمی حیدر آباد — طبع اول — ۱۹۴۶ء
(۱۰) مقام جمال الدین افغانی — نفیس اکیڈمی کراچی — طبع دوم — ۱۹۵۳ء
(۱۱) پیت کی ماری روپ متی — ادارۂ ادبستان اردو حیدرآباد — ۱۹۴۶ء
(۱۲) سید سجاد حیدر یلدرم — ادارۂ دانش و حکمت حیدرآباد — ۱۹۴۶ء
(۱۳) کلیات شاہی (علی عادل شاہ ثانی کا کلام) — انجمن ترقی اردو ہند — زیر طبع
(۱۴) تاریخ محمد قطب شاہی (فارسی) — زیر طبع

(ج) تراجم :-

(۱۵) ہماری غذا — انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی — ۱۹۴۱ء
(۱۶) مختصر تاریخ تمدن — انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی — ۱۹۴۴ء
(۱۷) مقالات جمال الدین افغانی (فارسی) — ادارۂ اشاعت سیاسیہ حیدرآباد — ۱۹۴۵ء
(۱۸) مقالات جمال الدین افغانی (عربی) — نفیس اکیڈمی حیدرآباد — ۱۹۴۶ء
(۱۹) پرتگالی راہبہ کے خطوط محبت — ادارۂ دانش و حکمت حیدرآباد — ۱۹۴۶ء
(۲۰) ایک مشرقی کتب خانہ — انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ — ۱۹۵۱ء
(۲۱) عرب اور اسلام (حتی) — ندوۃ المصنفین دہلی — ۱۹۵۰ء
(۲۲) اسلامی فن تعمیر — انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ — ۱۹۵۲ء
(۲۳) تاریخ ادبیات ایران — ندوۃ المصنفین دہلی — ۱۹۵۰ء
(۲۴) ورثۂ اسلام (تین جلدیں) — زیر طبع
(۲۵) ہندوستانی مصوری — زیر طبع

اس طویل فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا کہ اس میں مختلف فنون اور مفید علمی موضوعات کا انتخاب کیا گیا ہے اور جن حضرات نے ان میں سے کچھ کتابیں پڑھی ہونگی وہ یہ بھی اقرار کریں گے کہ رفعت صاحب کو ترجمہ کرنے کا سلیقہ خداداد ہے۔ وہ ایسی ہنرمندی اور چابکدستی سے دوسری زبان کے مفہوم کو اپنی عبارت میں منتقل کرتے ہیں کہ ترجمے کا جو حق ہے ادا ہو جاتا ہے۔

ساتھ ہی میں اس بات کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اتنے مختلف متنوع اور مفید مضامین پر کتابوں کی تالیف و تراجم کے بعد بھی رفعت صاحب کی علمی خدمات کا کماحقہ اعتراف نہیں کیا گیا۔

سید سجاد حیدر یلدرم پر مختلف مضامین فراہم کرکے انہیں سلیقے سے ترتیب دینے میں رفعت صاحب نے جو محنت کی ہے وہ قابل داد ہے، ہم سب کو ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اور مجھے امید ہے کہ اسے عام طور سے پسند بھی کیا جائے گا۔ یہ اردو کی بہت بڑی خدمت ہے جو رفعت صاحب جیسے مخلص، بے لوث اور سیر چشم انسان کے ہاتھوں انجام پائی ہے۔ انہوں نے سید سجاد حیدر مرحوم کے نیک نام کو ضائع ہونے سے بچایا ہے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ ان کا نیک نام بھی اردو میں ضرور بالضرور برقرار رہے گا۔ کیونکہ فارسی والا کہہ گیا ہے ؎

نام نیک رفتگاں ضائع مکن — تا بماند نام نیکت برقرار

نثار احمد فاروقی
۱۳ اپریل ۱۹۶۱ء

عرضِ مرتّب

آج سے کوئی بارہ تیرہ سال پہلے تک بھی جب کہ جامعۂ عثمانیہ اُردو جامعہ تھی، اس درس گاہ سے ایم۔اے کی سند حاصل کرنے والے ہر طالب علم پر امتحانی پرچوں کے سوا دو سو نمبر کا ایک تحقیقاتی مقالہ بھی لکھنا لازم تھا۔یہ ایک اچھی رسم تھی۔اس سے تحقیقاتی کام کرنے کی ابتدائی تربیت مل جاتی تھی اور بعد میں پی۔ایچ۔ڈی یا اعلیٰ تحقیقاتی کام کے لئے طالب علم میں بصیرت پیدا ہو جاتی تھی۔اس جامعہ کے بعض طالب علموں نے تو ایم۔اے ہی میں ایسے اعلیٰ درجہ کے مقالے لکھ کر پیش کئے کہ آج کے بعض پی ایچ ڈی یا ڈی لٹ کے مقالے ان پر سے نثار کرنے کو جی چاہتا ہے۔افسوس ہے اس جامعہ نے بھی ہندوستان کی اور جامعات کی طرح ایم۔اے میں مقالہ نگاری کی یہ پابندی اُٹھالی ہے۔

۱۹۴۱ء میں راقم اسی جامعۂ عثمانیہ مرحوم میں بی۔اے کا طالب علم تھا اور سوچتا تھا کہ اگر شعبۂ اُردو سے ایم۔اے کروں گا تو سیّد سجاد حیدر یلدرم پر ہی امتحانی مقالہ لکھوں گا۔بعض اسباب کی بنا پر راقم نے ۱۹۴۳ء میں اُردو میں نہیں، فارسی میں ایم۔اے کیا اور کسی اور ہی موضوع پر اسے مقالہ لکھنا پڑا۔اس کے باوجود حضرت یلدرم سے عقیدت میں کسی طرح کی کمی نہ آئی، اور اس خیال سے کہ آئندہ ان پر ضرور کچھ لکھوں گا۔ان سے متعلق تمام چھپی ہوئی چیزیں اکٹھی کرتا رہا۔ساتھ ہی یہ بھی سوچتا رہا کہ کسی نہ کسی طرح حضرت یلدرم سے شخصی طور پر بھی ربط پیدا کروں۔بدنصیبی سے یہ سعادت میرے حصے میں نہ آئی اور ۱۹۴۳ء میں وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ان کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ سجاد حیدر اور ان کی صاحبزادی محترمہ قرۃ العین حیدر سے ربط پیدا کرنے کا خیال آیا تو ملک کا بٹوارہ ہو چکا تھا اور دونوں محترمات ہجرت کر کے لکھنؤ سے پاکستان جا بسی تھیں۔اس کے سوا اس دوران میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالغفار، پطرس، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا صلاح الدین احمد مولانا مشتاق احمد زاہدی جیسے کہنہ مشق ادیبوں کی تحریریں پڑھنے کے بعد کسی اچھوتے ڈھنگ سے سجاد حیدر یلدرم پر خود لکھنے کی ہمت میں نہ کر سکا۔تعبیروں کی کثرت نے میرے دیرینہ خواب کو پراگندہ کر دیا۔میں نے جو جو تحریریں جمع کی تھیں، انہیں دیکھ کر میرے ایک مرحوم ناشر دوست کو خیال آیا کہ ان تحریروں کو ایک کتاب کی شکل دے دی جائے۔میں نے ان کے اصرار پر اپنے اکھٹے کئے ہوئے مسالہ کو "سجاد حیدر یلدرم" کے نام سے کتاب کی شکل دے دی، لیکن میری کم نصیبی سے یہ کتاب بہت خراب چھپی اور اس کی ترتیب سے بھی میں مطمئن نہ ہو سکا۔پھر ناشر کی بے وقت موت نے اس کے کاروبار کو منتشر کر دیا اور اس کتاب کی اشاعت

بہت محدود رہی۔ اس کے سوا اس کتاب میں یلدرم کے مضامین، ان کے مکاتیب اور ان پر لکھے ہوئے محترمہ قرۃ العین حیدر، محترمہ نذر سجاد حیدر، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا صلاح الدین احمد اور دوسرے لکھنے والوں کے مضامین شامل نہ تھے۔ جس مقصد کے تحت میں نے یہ کتاب ترتیب دی تھی وہ حاصل نہ ہو سکا۔

سجاد حیدر یلدرم ہمارے ادب میں ایک بہت اونچے درجے پر فائز ہیں۔ وہ ہماری نثر میں ایک نئی صنف۔ ادب لطیف ــــــ کے بانی مانے جاتے ہیں۔ ہمارے دور کے تمام صاحب طرز ادیب، چاہے وہ مولانا عبدالماجد دریابادی ہوں کہ علامہ نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار مرحوم ہوں کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی یا مولانا سید سلیمان ندوی سب ہی اپنے اپنے وقت میں کسی نہ کسی درجے میں سجاد یلدرم سے ضرور ہی متاثر ہوئے ہیں۔ آج کل جب کہ ہمارے ادب کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ اتنے بڑے قدآور ادیب کا نظرانداز کر دیا جانا حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ ان کی وفات کے بعد نہ تو کسی مجلہ نے اپنا کوئی خصوصی نمبر ان کی یاد کے لئے وقف کرنا گوارا کیا اور نہ اعلیٰ تحقیقات کے لئے ان کے آرٹ کو اپنے تحقیقاتی مقالے کے موضوع کے طور پر کسی صاحب تحقیق نے چُنا۔ حالانکہ وہ ان کے لئے ہر طرح مستحق اور موزوں تھے۔

سجاد حیدر یلدرم بحیثیت انسان نہایت درجہ منکسر المزاج آدمی تھے۔ بقول قرۃ العین حیدر ان میں "انانیت" یا "ایگو" کا شدید فقدان تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو امرٹ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اپنے ادبی درجے اور مقام کا ڈھول نہیں پیٹا۔ اسی لئے شاید وہ اس توجہ سے محروم رہے جس کے وہ ہر طرح مستحق ہیں۔ اور تو اور یلدرم مرحوم کی رفیق حیات اور ان کی محترم صاحبزادی قرۃ العین حیدر نے بھی صاحب قلم ہونے کے باوجود اس طرف توجہ نہ کی۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کے قلم سے نکلی ہوئی مرحوم کی سوانح عمری ہمارے ادب میں ایک یادگار چیز ہوتی۔ یلدرم کو مرے ایک عمر ہو گیا، اس کے باوجود ان کی غیر مطبوعہ تحریروں کو (جو غالباً کافی تعداد میں تھیں) شائع کرنے کا بھی کوئی اہتمام نہ ہو سکا۔

سجاد حیدر یلدرم پر ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد جو کچھ لکھا گیا، اسے میں نے اکٹھا کر دیا ہے۔ یہ تحریریں یلدرم پر آئندہ کام کرنے والے کے کام آئیں گی اور مسالہ اکٹھا کرنے کی دشوار منزل اس کے لئے آسان ہو جائے گی۔ اس کے سوا یلدرم کے بعض مضامین جو مختلف رسالوں میں چھپے اور ان کے کسی مجموعۂ مضامین میں شامل نہ ہو سکے، وہ بھی یہاں یک جا کر دیے گئے ہیں۔ یہ دعوےٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے تمام مطبوعہ مضامین کو اکٹھا کر دیا گیا ہے، اس سے زیادہ سعی مجھ سے ممکن نہ تھی۔ اسی طرح یلدرم کی تمام منظومات کو یکجا کر دیا گیا ہے اور ان کے کلام کے بھی مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں البتہ بڑی دیدہ ریزی اور دشواری ہی سے یہ کلام جمع کیا جا سکا ہے۔

میں ارباب ادارۂ پگڈنڈی کا اور خاص طور پر اپنے حبیب لبیب جناب نثار احمد فاروقی کا سپاس گزار ہوں کہ ان کی نظر کرم سے ایک دفتر پارینہ جو مدت سے طاق نسیاں کی زینت بنا ہوا تھا، مجلۂ پگڈنڈی کے خصوصی شمارے کی صورت میں منظر عام پر آ رہا ہے۔ پتہ نہیں پڑھنے والوں کو یہ بدعت پسند بھی آئے گی کہ ایک خاص موضوع پر لکھی ہوئی منتشر تحریروں

کو ایک رسالے کے خصوصی شمارے کی صورت میں اکٹھا کر کے پیش کیا جائے۔ پسند آئے تو مرتب پڑھنے والوں سے دعائے خیر کے سوا کسی اور چیز کا طالب نہیں۔ اس کار خیر میں اس کا اپنا حصہ ترتیب و تہذیب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اصل کارنامہ ہے ان صاحبان علم و ادب کا جنھوں نے محنت اور دقت نظر سے کام لے کر یہ مضامین لکھے اور ہمارے ادب کی ایک دلنواز شخصیت کی حیات اور اس کے ادبی کارنامے کو اجاگر کرنے کی سعیٔ بلیغ فرمائی۔ اس رنگ برنگی گلدستے کے مختلف پھولوں کو آپس میں جوڑنے والے ایک رشتے سے بڑھ کر مرتب کی حیثیت نہیں اور یہ حیثیت بھی اس کے لئے باعث نازش ہے کہ ؎

گرچہ از نیکاں نیم لیکن ز نیکاں بستہ ام
در ریاض آفرینش دستۂ گلدستہ ام!

مبارزالدین رفعت

گلبرگہ - اپریل ۱۹۶۱ء

تصانیف یلدرم :-

(الف) مضامین اور افسانے

۱- خیالستان . . . . مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ بار پنجم سنہ ۱۹۲۸ء
۲- حکایات و احتساسات . . . . " " " " بار اوّل سنہ ۱۳۴۵ھ

(ب) طویل اور مختصر ناول

۳- ثالث بالخیر (ترجمہ از احمد حکمت) . . . . دار الاشاعت پنجاب لاہور، بار دوم سنہ ۱۹۲۱ء
۴- زہرا (ایک ترکی ناول کا ترجمہ) . . . . . مسلم یونیورسٹی بکڈپو، علی گڑھ سنہ ۹ء
۵- مطلوبِ حسیناں (" " ") . . . . " " " " بار سوم سنہ ۱۹۳۰ء
۶- آسیبِ الفت (" " ") . . . . " " " " بار اول سنہ ۱۹۳۰ء
۷- ہما خانم (محمد حجازی کے ایک فارسی ناول کا ترجمہ) .. رسالہ نیرنگ خیال میں سلسلہ وار
کتابی صورت میں - ادارۂ ادب جدید حیدر آباد - سنہ ۹ء
۸- ایک کہانی چھ ادیبوں کی زبانی (نیاز، علی عباس حسینی، ل، احمد،
امتیاز علی تاج، حکیم احمد شجاع کے
اشتراک کے ساتھ- اختراع آل
آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ) .. .. کتب خانۂ علم و ادب دہلی - سنہ ۱۹۳۹ء

(ج) ڈرامے

۹- جلال الدین خوارزم شاہ (نامق کمال بے کے تاریخی ڈرامے کا ترجمہ)
مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ - سنہ ۱۹۲۵ء
۱۰- جنگ و جدل (ایک ترکی ڈرامے کا ترجمہ) . . . " " " " سنہ ۱۹۳۳ء

ایک نظر میں !
سیّد سجاد حیدر یلدرم

ولادت .. .. نہٹور (ضلع بجنور) ۱۸۸۰ء

محمڈن کالج علی گڑھ سے گریجویشن ۱۹۰۱ء

برطانوی حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی ملازمت اور اسی تعلق سے بغداد میں سہ سالہ قیام، سفر قسطنطنیہ، ترکی زبان کی تحصیل اور اس سے والہانہ وابستگی۔ ہندوستان کو واپسی اور افغان شہزادوں کے نگرانی کی خدمت یو۔ پی سول سروس میں منتقلی — محترمہ نذر زہرا سے مناکحت ۱۹۱۲ء

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی رجسٹراری ۱۹۲۰ء

اس خدمت سے سبکدوشی ۱۹۲۹ء

جزائر انڈمان کے ریونیو کمشنر کی خدمت ۱۹۳۰ء

حج بیت اللہ ۱۹۳۴ء

خرابیٔ صحت کی بناء پر قبل از وقت وظیفہ پر سرکاری خدمت سے سبکدوشی ۱۹۳۵ء

وفات — لکھنؤ .. .. ۱۲ اپریل ۱۹۴۳ء

اولاد:-

محترمہ قرۃ العین حیدر :- ولادت ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء - بمقام علی گڑھ زندگی کا ابتدائی حصہ پورٹ بلیئر (جزائر انڈیمان نکوبار) اور مشرق قریب میں گزرا۔ دہرہ دون کان ونٹ، اور ازابلا تھوبرن کالج لکھنؤ میں پڑھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم-اے کیا۔ آرٹ اور مطالعہ کا بے حد شوق ہے۔ مغربی موسیقی اور ڈرامے سے دلچسپی ہے۔ ہندوستانی کلاسکی اور مصوری بھی سیکھی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان چھوڑ کر پاکستان میں جابسی ہیں۔

محترمہ قرۃ العین حیدر خود بھی ایک صاحب طرز ادیبہ ہیں — نئے لکھنے والوں میں ان کا مقام بہت اونچا ہے۔

جلیل قدوائی

یادِ یلدرم

ادب چمن ہے تو اس کی بہار تھا سجاد — عروسِ علم و ہنر کا سنگار تھا سجاد

لطیف صنف ادب کے ہیں آج سب قائل — لطیف صنف کا پروردگار تھا سجاد

ادب کے باغ میں یوں تو بہت ہیں لالہ و گل — مثال موج نسیم بہار تھا سجاد

گرچہ اہل قلم کو کہیں ادب کی لڑی — تو اس لڑی میں دُرِ شاہوار تھا سجاد

چڑھا وہ مرکب شہرت پہ یوں کہ گر نہ سکا — رہ ادب کا عجب شہ سوار تھا سجاد

نئے پرانے سب ہی اہل علم مان گئے — ادب میں وہ زر کامل عیار تھا سجاد

وہ اس کا طرز نگارش کہ دل میں گھر کر لے — ادیب تھا کہ کوئی سحر کار تھا سجاد

ادب میں اس کی چمک ہر طرف نہ ہو کیوں کر — کہ ترجمانِ دل بے قرار تھا سجاد

زباں کو رنگ، رنگ کو زباں بخشی، — فسوں طراز تھا معجز نگار تھا سجاد

اگرچہ پیر تھا وہ، تھا ادب جواں اس کا — خزاں میں مثلِ گلِ نو بہار تھا سجاد

حسیں ادب تھا حسیں تر تھی زندگی اس کی — ادب کا آپ خود آئینہ دار تھا سجاد

ادیب تھا اور ادیبوں کا سرپرست بھی تھا — ثبوت یہ ہے مرا غم گسار تھا سجاد

جلیلؔ اس کی میں رحلت پہ خون کے آنسو
نہ کیوں بہاؤں کہ یاروں کا یار تھا سجاد

قرۃ العین حیدر

سیّد سجّاد حیدر یلدرم

یہ جو مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں یلدرم پر مضمون لکھوں، یہ میرے لئے ایک مرحلہ ہے شخصیت نگاری خصوصاً ان شخصیتوں کے متعلق کچھ لکھنا، جواب ہمارے درمیان موجود نہیں، ایسے بھی بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ موت اور زمانے کا وقفہ یہ دونوں چیزیں ایک دھندلکے میں انسان کو چھپا دیتی ہیں اور عموماً یہ دھندلکا ذرا فاصلے سے بڑا رومانی اور خوبصورت دکھلائی پڑتا ہے۔ جب کبھی ہم اپنے مرحوم بزرگوں عزیزوں یا اپنے بڑے لوگوں کو یاد کرتے ہیں تو بہت ہی ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کے لئے قلم اُٹھایا جاتا ہے۔ کچھ ان ہستیوں کے لئے عقیدت ہوتی ہے۔ کچھ ان گذرے زمانوں کے لئے نوسٹلجیا، جن میں یہ لوگ زندہ تھے، پھر ان خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اب ناپید ہیں۔

لیکن لکھنا شروع کرتے ہوئے ایک پریشان کُن سوال پھر یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں کتنا ہی غیر شخصی مضمون لکھوں پر چونکہ یلدرم کے پورے کردار میں کہیں پر بھی کوئی چھوٹی سی غیر اہم خامی یا کمزوری نہ تھی اس لئے مضمون پھر لا محالہ مبالغہ آمیز معلوم ہوگا۔ ایسے فرشتہ صفت انسانوں کے بارے میں کچھ لکھنا واقعی بہت دشوار ہے۔

فرشتوں کی تصویروں میں رنگ نہیں ہوتا۔ محض نور ہوتا ہے جو اتنا دلچسپ نہیں۔ نور سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، رنگ فانوس کے ایسے دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں۔

مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ یلدرم کی تصویر میں رنگ بھی ہیں۔ کیونکہ چودھری محمد علی ردولوی کی طرح یہ ایک پورے زمانے، پورے دور کے نمائندے تھے۔ روایت کو نبھانے کے لئے میں بھی حالات زندگی سے مضمون شروع کر رہی ہوں اور اس لئے بھی کہ خاندانی اور معاشرتی پس منظر کو اجاگر کئے بنا یہ اندازہ نہ ہو سکے گا کہ یلدرم میں یہ خصوصیات کہاں سے آئیں۔

یلدرم کے خاندان کو ان سب چیزوں پر بڑا فخر تھا جو ایک زمانے میں انسانیت کا اعلیٰ ترین معیار سمجھی جاتی تھیں یعنی تہذیب اور شرافت نفس۔ سید حسن ترمزی یلدرم کے نگڑ سگڑ دادا تھے۔ جو ترمز، وسط ایشیا سے ہندوستان آئے (ترمز آج کل سوویٹ ترکستان میں ہے) اور صدیوں تک اس گھرانے میں علم کی وراثت ایک نسل دوسری نسل کے ہاتھ میں سونپتی گئی۔ یہ سب عالم لوگ تھے روایتی قسم کے مولوی نہیں تھے۔ لہذا علمیت کے ساتھ ساتھ زندگی کی لہر بھی قائم رہی۔ اس گھرانے کی ایک بی بی سیدہ ام مریم نے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ سیدہ ام مریم کی بیٹی یلدرم کی ماں تھیں۔ قصبۂ نہٹور (ضلع بجنور) ان لوگوں کا وطن تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء میں یلدرم کے دادا میر احمد علی نے زور شور سے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا لہذا جاگیریں ضبط ہوئیں اور زوال آیا اور نئی پود کو انگریزی پڑھنا اور سرکاری ملازمتیں کرنا پڑیں (یہ بھی کہانی کا طے شدہ مکمل پیٹرن ہے لکھنؤ، دلی اور سارے اُتر پردیش کے اَن گنت مسلمان خاندانوں کی ساری داستان مختصر یہی ہے۔ محض ناموں کا فرق ہے)۔ یہ انگریزی

پڑھنے اور انگریز کی ملازمت کرنے والے یلدرم کے باپ اور چچا تھے۔

یلدرم کے باپ خان بہادر سید جلال الدین حیدر شہر بنارس کے حاکم تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی یعنی یلدرم کے چچا خان بہادر ڈاکٹر کرار حیدر یو۔ پی میں سول سرجن تھے اور انیسویں صدی کے آخر میں صوبے کے مشہور ڈاکٹروں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں رائے بریلی میں گھوڑے سے گر کر ان کا انتقال ہوا۔

یلدرم ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ گنگا کے کنارے کھیلنے کودنے میں گذارا۔ یلدرم کے باپ جن کے رعب اور دبدبے سے سارا بنارس تھر تھر کانپتا تھا۔ اپنے بچّوں کے لئے ان کے رفیق بھی تھے اور فلاسفر بھی۔ انہوں نے اپنی اولاد کو سب سے پہلا سبق یہ پڑھایا کہ دوسروں کی دل آزاری عظیم ترین گناہ ہے۔ یلدرم اور ان کے تینوں بھائیوں کی زندگیاں اس نصیحت کی کامل تفسیر ہیں

سید جلال الدین حیدر ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے فیوڈل پس منظر اور خود اپنے وسیع اختیارات اور اقتدار کے باوجود ان کے مزاج میں کسی قسم کا تکبر یا رعونت نہ تھی۔ ان کی پر شکوہ شخصیت، انصاف پسندی اور کٹر اصول پرستی کی وجہ سے لوگ ان سے خائف رہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی شفقت، نیکی اور دردمندی کی وجہ سے عوام کو ان سے بے اندازہ محبّت بھی تھی۔ ان کی زندگی ہی میں بنارس میں انہیں مہاتما اور دیوتا سمان سمجھا جاتا تھا اور ساٹھ ستر برس گزرنے کے باوجود آج بھی وہاں پر ان کا نام ایک طرح کی تقدیس اور عقیدت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان کے فقر اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ جس وقت ان کا انتقال ہوا تو گھر میں ان کی ساری جمع پونجی صرف پانچ سو روپے نکلے! اسکول کی تعلیم کے بعد یلدرم اور ان کے بھائی ایم، اے، او کالج میں داخل کیے گئے۔ سجاد حیدر یلدرم کی زندگی کے واقعات آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دینے والے نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری عمر بہت خاموشی اور نرم روی سے گذاری۔ انا ہم سب کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ بعض دفعہ یہ کمزوری بہت کارآمد ہوتی ہے۔ ورنہ کوئی کلاکار اپنا اظہار نہ کرتا (لیکن زیادہ تر یہ انا یا بقول مولانا ابوالکلام آزاد "الیغو" کس قدر کھل جاتا ہے اور دوسروں کے لئے اتنا صبر آزما ثابت ہوتا ہے)۔ بہر حال یلدرم میں یہ انوکھا پن تھا کہ آرٹسٹ ہونے کے باوجود ان میں "الیغو" کا فقدان تھا اور اس وجہ سے انہیں زندگی میں بہت نقصان اٹھانے پڑے

۱۹۰۱ء میں یلدرم نے بی۔ اے کیا اور سارے صوبے میں سکنڈ آئے (اس زمانے میں علی گڈھ کالج الٰہ آباد یونیورسٹی سے منسلک تھا)۔ یہ ریاضی میں بے حد کمزور تھے۔ اس لئے ایک مرتبہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں سارے میں فرسٹ آئے، لیکن ریاضی میں فیل ہو گئے۔ اس زمانے میں ریاضی انٹرمیڈیٹ کے لئے لازمی مضمون تھا

یلدرم یونین کے سیکرٹری اور پریذیڈنٹ رہے۔ تقریر بہت عمدہ کرتے تھے۔ لباس ہمیشہ انگریزی اور بہت اعلیٰ پہنتے تھے مولانا محمد علی اور غالباً حسرت موہانی ان کے کلاس فیلو تھے۔ لکھنؤ کے چودھری نعمت اللہ بھی اسی کلاس میں تھے۔ انہوں نے بعد میں قانون میں بہت نام پیدا کیا۔ آج سے نصف صدی قبل علی گڈھ کے ان مشہور "کھلنڈروں" کی زندگی بہت دلچسپ اور بھرپور رہی ہوگی۔ اس کی ایک ہلکی سی جھلک ہمیں یلدرم کی مشہور طویل نظم "مرزا پھویا علی گڈھ کالج میں"

ں ملتی ہے جو انہوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں لکھی تھی

شیخ عبدالقادر مرحوم نے کہیں پر ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جب یہ ابھی مدیر مخزن تھے اور کسی انگریزی
خبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اور یلدرم ابھی بی۔اے میں پڑھ رہے تھے۔ ان کی یلدرم سے ملاقات پہلی مرتبہ
اجی محمد اسماعیل خان صاحب کے یہاں علی گڑھ میں ہوئی۔ " حاجی صاحب نے سجاد سے میرا تعارف کرایا۔ جب
ں حاجی صاحب سے بات کرکے فارغ ہوا تو سجاد میرے پیچھے پیچھے آئے اور کہنے لگے، آئیے! میں آپ کو ایک
چسپ چیز دکھاؤں۔ آپ شبلیؒ غمزدہ کو مشقِ سخن کرتے دیکھنا چاہتے ہیں؟ مولانا شبلی اس وقت حاجی صاحب کے مہمان تھے
ر اس بنگلے کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سجاد مجھے ایک کمرے کی طرف لے گئے جس کا ایک دروازہ باہر کی
ف کھلتا تھا۔ مولانا شبلی دروازے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے اور کچھ لکھ رہے تھے۔ ہم دروازے کے آئینوں میں
ے انہیں جھانک کر دیکھ سکتے تھے پر وہ ہمیں نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کا قلم کبھی کاغذ پر چلتا تھا، کبھی اس کا ایک سرا
نھ کے قریب ہوتا تھا جیسے فکرِ سخن میں ہیں۔ معلوم نہیں ہم دونوں کا مولانا کو اس طرح دزدیدہ دیکھنا کہاں تک جائز
مناسب تھا۔ مگر مجھے اس کا کبھی افسوس نہ ہوا کہ ہم نے یہ حرکت کی۔ اور سجاد کا یہ جذبہ مجھے بہت بھایا کہ مولانا کو فکرِ سخن
تے دیکھنے سے ان کو جو لطف آیا اس میں انہوں نے مجھے بھی شریک کرنا ضروری سمجھا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں
علوم ہو گیا کہ ہم کس قدر ہم مذاق ہیں۔ مولانا شبلی اپنے شاگردوں میں شبلیؒ غمزدہ کے نام سے اس لئے مشہور تھے کہ
، فارسی اشعار میں اپنے نام کے ساتھ غمزدہ لکھا کرتے تھے۔"

علی گڑھ ان دنوں گویا آکسفورڈ کا ماڈل بنا ہوا تھا۔ تھیوڈر بک پرنسپل تھے۔ آرنلڈ اور نکلسن انگریزی کے استاد تھے۔
وفیسر چکرورتی اور ڈاکٹر ضیاءالدین پڑھاتے تھے۔ مولوی عباس حسین عربی کے استاد تھے اور مولانا شبلی فارسی پڑھایا
تے تھے۔ یلدرم فارسی میں بہت اچھے تھے۔ لہٰذا شبلی کے بہت پسندیدہ شاگردوں میں تھے۔

خوش حال خاندانوں کے لڑکے جو یہاں سے نکلتے ان کو اب مسلمانوں کے نئے معاشرے کی قیادت کرنا تھی۔ جداگانہ
سلم سیاسی پلیٹ فارم کی داغ بیل پڑ چکی تھی (علی گڑھ کی درس گاہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے دس سال قبل قائم کی جا
ی تھی)۔ وائسرائے اور گورنر آکر اسٹریچی ہال میں ان نوجوانوں کو خطاب کرتے۔ ان کی تقریروں میں مسلمان قوم کی بے اندازہ
رلفیں ہوتیں۔ پھر یہ نوجوان باہر آکر پراونشل سروسوں میں لئے جاتے یا مسلم لیگ کے لیڈروں کی حیثیت سے وائسرائے ہند
ے مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات اور تقسیم بنگال وغیرہ کے مسائل پر گفت و شنید کرتے۔

یلدرم کے سامنے بھی یہی راستے تھے۔ یا یہ قانون پڑھنے کے لئے ولایت جاتے۔ واپس آکر بیرسٹری کرتے۔ ہائی کورٹ
ے جج بنتے یا قوم کی قیادت کرتے اور آخر میں کسی ہندوستانی ریاست کے دیوان بن جاتے۔ ان کے گھر والوں کے سامنے بھی
ں پروگرام تھا۔ لیکن اس کے بجائے آپ ایک سہانی صبح بغداد بھاگ گئے اور کئی سال تک سلطنت عثمانیہ اور مشرقی یورپ
ں گھومتے رہے۔

زمانۂ طالب علمی ہی سے ان کو ترکی سے ذہنی لگاؤ ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں ہی انہوں نے ترکی زبان میں مہارت حاصل

کر لی تھی۔ بی، اے کے بعد ابھی یہ علی گڈھ ہی میں مقیم تھے اور ایل ایل بی کے لئے پڑھ رہے تھے۔ جب برطانوی فارن آفس سے کسی نے ان کے ایک انگریز پروفیسر کو لکھا کہ بغداد کے برطانوی قونصل خانہ کے لئے ترکی زبان کے ترجمان کی ضرورت ہے۔ پروفیسر نے ان سے ذکر کیا۔ آپ نے ترکی پہنچنے کا یہ موقع غنیمت جانا اور فوراً چل کھڑے ہوئے۔

اس زمانے میں انہوں نے ترکی ادب کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۰۲ء میں انہوں نے احمد حکمت کے ایک ناول "ثالث بالخیر" کا ترجمہ کیا۔ کتاب کے شروع میں ۴ر اگست ۱۹۰۲ء کی تاریخ کے ساتھ "التماس مترجم" کے عنوان سے یہ سطور یلدرم نے لکھیں :-

"میں اس ترجمہ کو بہت دھوم دھڑکے سے پیش نہیں کرنا چاہتا اور نہ اس جرم کی معافی چاہتا ہوں کہ میں نے ناول کا ترجمہ کیا اور اس طرح پبلک کے مذاق کو ایک مُضر شئے کی طرف راغب کیا۔ قصّوں کے ترجمے آج کل بہت ہو رہے ہیں۔ مگر سب انگریزی سے۔ اور اس کے عرض کرنے ضرورت نہیں کہ انگریزی سے بھی کس قسم کے ناولوں کے ترجمے ہو رہے ہیں۔

میری تمنا یہ تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں۔ اس سے نہ صرف ہمارے ناولوں کے لٹریچر میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا بلکہ ترکوں کی سوشیل زندگی کا اصلی نقشہ بھی ہمیں نظر آجائے گا۔ ترکوں کی سوشیل زندگی کی تصویر میں اردو میں اس لئے ضروری سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش آرہا ہے وہ انہیں بھی پیش آچکا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گذرے ہیں اور اب کہاں ہیں۔ ترجمہ اکھڑا اکھڑا اور انوکھا معلوم ہوگا۔ مگر ترکوں کا طرزِ ادا مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے اور مغربی اور ایشیائی طرزِ تحریر کا ایسا معقول میل ہے کہ میں نے لفظی ترجمے کی کوشش کی ہے۔ گفتگو تو ضرور انوکھی ہے، لیکن سُنئے تو سہی ع

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد"

اس وقت یلدرم کی عمر کوئی اکیس یا بائیس سال کی رہی ہوگی۔ اس زمانے میں انہوں نے اور دوسرے نوجوانوں نے مخزن میں لکھنا شروع کیا۔ مخزن کا یہ ابتدائی دور اردو کی جدید تاریخ میں بہت اہم حیثیت کا مالک ہے۔

یلدرم کی رومانیت خالص مغربی اور (ترکی) رومانیت تھی۔ انہوں نے عورت کا ذکر اس انداز سے کیا کہ اب وہ چلمن کے پیچھے سے جھانکنے والی سرشار کی سپہر آرا نہ تھی۔ یہ عورت کو اپنے ہمراہ اپنے برابر لانا چاہتے تھے جو ہندوستان میں ناممکن تھا۔ انہوں نے اپنے تصوں کی دلہنوں کو لکھنؤ اور دلّی کی حویلیوں کی چار دیواری سے نکال کر بمبئی کی چوپاٹی پر کھلی ہوا میں سانس لیتا دیکھنے کی تمنّا کی۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان سے باہر ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ اس وقت ایران اور مصر بہت ہی پس ماندہ تھے۔ ترکی میں یورپین اقوام کے قرب کی وجہ سے زندگی کی لہر زیادہ تیز ہو چلی تھی۔ یلدرم نے جن ترکی ڈراموں کا ترجمہ کرکے ان کے زنانہ کرداروں کو اردو پڑھنے والوں سے روشناس کرایا (زہرا، عمرا، قمراد، بہیجہ وغیرہ) ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ یلدرم کی آئیڈیل لڑکیاں تھیں۔ یہاں پر میں سر عبد القادر مرحوم کی تحریر پھر نقل کرتی ہوں جس سے آزادی نسواں کے بارے میں یلدرم کے خیالات کا کچھ پتہ چلیگا۔

"سنہ ۱۹۰۷ء میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کراچی میں ہو رہی تھی جس کے صدر اس سال مولانا حالی تھے اور سجاد حیدر بھی اس میں شریک تھے۔ ایک دن جب میں جلسے کے بعد اپنی قیام گاہ کے قریب جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد آتے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کئی ایک چکر اپنے گرد لگائے جیسے خوشی سے رقص کر رہے ہوں۔ مجھ سے کہنے لگے کہ کچھ نہ پوچھئے، میرا دماغ اس وقت آسمان پر ہے اور میں زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے پوچھا کہ کچھ بتاؤ تو کیا دیکھا ہے۔ کہنے لگے، ایک ایسی خاتون سے مل کر آرہا ہوں جو آزادی کی حامی ہیں اور خود آزادی پر عامل ہیں"۔

بغداد کے بعد ان کا تبادلہ قسطنطنیہ کے برطانوی سفارت خانے میں ہوگیا۔ یہاں یلدرم ترکی کے نئے ادب کی تحریک اور نئے لکھنے والوں اور سیاسی انقلابیوں کے بہت قریب رہے۔

یلدرم کی یہ انقلاب پرستی رومانیت کے جذبے کی وجہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے بہت بڑا خطرہ مول لے کر ینگ ٹرک پارٹی کے ساتھ کام کیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ بعد میں ساری عمر کبھی بھولے سے اس کا ذکر نہ کیا۔ میرے خیال میں ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سنسنی خیز شہرت حاصل کرنے کے لئے بعد میں ہمیشہ کے واسطے لیڈر قوم اور غازی وغیرہ بن جاتا۔

وہی "ایغو" کا فقدان!

یلدرم سلطنت عثمانیہ میں کئی سال رہے۔ قسطنطنیہ کے بعد ان کا دوسرا پسندیدہ شہر بوڈاپسٹ تھا۔

جنگ چھڑنے سے کچھ عرصہ قبل یلدرم کا تبادلہ امیر یعقوب خان سابق امیر کابل کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے ہندوستان کر دیا گیا اور قسطنطنیہ سے وطن واپس آئے۔ امیر یعقوب خان تیسری جنگ افغان میں شکست کے بعد انگریزوں کے اسیر کی حیثیت سے مسوری میں نظر بند تھے۔ یلدرم نے ترکی کے انقلابی ماحول کے بعد یک لخت خود کو ایک شکست خوردہ افغان بادشاہ کی معیت میں پایا۔ یہ کئی سال تک مسوری اور ڈیرہ دون میں جلاوطن افغان بادشاہ اور شہزادوں کے ساتھ رہے۔

اس زمانے میں یعنی سنہ ۱۹۱۲ء میں یلدرم کی شادی ہوئی۔ جب یہ ترکی سے تنہا لوٹے تھے تو ان کے دوستوں کے گروہ میں بڑی کھلبلی مچی تھی کہ یہ کیا سلسلے ہیں۔ یہ ضرور کوئی ترکن بیاہ کر کے وہاں چھوڑ آئے ہیں جو اب اگلے جہاز سے پہنچتی ہوگی۔ ترکی سے اتنا عشق اور ترکن سے شادی نہ کی۔ اکبر الہ آبادی نے اس پر ایک مزے دار قطعہ بھی کہا تھا۔

یو۔ پی میں ایک اور خاندان تھا جس کے افراد اثنا عشری شیعہ ہونے کے باوجود متعصب نہیں تھے۔ لہٰذا جب صوبے کے ایک راسخ العقیدہ سنی گھرانے کے ایک لڑکے کا پیغام اودھ کے میر معصوم علی (مصنف انشائے معصوم) کے پڑپوتے خان بہادر سید نذر الباقر کی لڑکی نذر زہرا بیگم کے واسطے آیا تو اسے منظور کر لیا گیا۔ نذر زہرا بیگم اور ان کی چھوٹی بہن ثروت آرا بیگم کو ان کے باپ نے پردے ہی میں گورنسوں سے تعلیم دلوائی تھی۔ سید نذر الباقر کی بہن والدۂ افضل علی ایک معاشرتی ناول "گودڑ کا لال" تصنیف کر چکی تھیں۔ نذر زہرا بیگم کے پھوپھی زاد بھائی اور بہنوئی میر افضل علی ایک صاحب طرز ادیب تھے، ان کی کتاب "تخیلات" اب گم اور نایاب ہے۔

نذر زہراء بیگم مس نذر الباقر کے نام سے اپنے لڑکپن ہی میں بہت نامور مضمون نگار بن چکی تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں بچوں کے مشہور اخبار "پھول" کی اڈیٹر رہیں جو شمس العلماء مولوی ممتاز علی کے دار الاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے بچوں کے لئے تین مقبول کتابیں "پھولوں کا ہار"، "سلیم کی کہانی" اور "دکھ بھری کہانی" لکھیں جواب مدتوں سے Out of Print ہیں۔ ان کا مشہور ناول "اختر النساء بیگم" ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ جب انکی عمر صرف سولہ سال کی تھی۔ اپنے کنوارپنے کے زمانے ہی میں بنت نذر الباقر کے مضامین نیرنگ خیال، زمانہ، تمدن، ادیب، انقلاب اور الناظر میں شائع ہوئے۔ ان کا انگریزی ترجمہ ٹائمز آف انڈیا میں چھپا اور بمبئی اور مدراس کے انگریزی اخباروں کی طرف سے ان کو انعام ملے۔ ان کا ایک مضمون جو تہذیب نسواں میں چھپا تھا۔ اس پر مہارانی بڑودہ نے بنت نذر الباقر کو تمغہ دیا۔

بنت نذر الباقر کی قوم پرستی اور قابلیت سے متاثر ہو کر ہز ہائی نس سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کی بڑی خواہش تھی کہ یہ ذہین لڑکی ان کی سیکرٹری بن جائے۔ مگر اپنی روشن خیالی کے باوجود سید نذر الباقر اس کی اجازت نہ دے سکے۔ آج سے پچاس سال قبل کے ہندوستان میں ایک غیر شادی شدہ لڑکی کے لئے اپنا کیریر بنانا ظاہر ہے ناممکن تھا۔

۱۹۱۲ء میں بنت نذر الباقر کی شادی یلدرم سے ہوگئی اور وہ مسوری آگئیں۔ شادی کے بعد انہوں نے دہرہ دون میں لڑکیوں کا انگریزی اسکول قائم کیا اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا۔ مسلم گرلز اسکول علی گڑھ اور کرامت حسین گرلز اسکول لکھنؤ (یہ دونوں ادارے اس وقت مشہور ڈگری کالج ہیں) کے قیام کے سلسلے میں بہت کام کیا۔ آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس قائم کی جس کی سیکرٹری بیگم حبیب الرحمٰن خان شیروانی اور صدر بیگم بھوپال تھیں۔ ۱۹۲۳ء میں نذر سجاد حیدر نے پردہ ترک کیا اور ترک موالات کے زمانے میں کھادی تحریک میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ یلدرم کے ہمراہ مشرق وسطیٰ کی سیاحت بھی کی۔

امیر کابل کے انتقال کے بعد یلدرم کی خدمات یو۔ پی سول سروس میں منتقل کر دی گئیں۔ ۱۹۲۰ء میں ایم اے او کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا۔ اس وقت سے مسلم یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار کی حیثیت سے انکی خدمات حکومت سے مستعار لی گئیں۔ ۱۹۲۹ء میں وہ پھر یو۔پی سول سروس میں واپس آ گئے اور جزائر انڈمان و نکوبار ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔ ہندوستان واپس آ کر یلدرم غازی پور اور اٹاوے کے ضلعوں میں تعینات رہے۔ ۱۹۳۵ء میں خرابی صحت کی بنا پر وقت سے پہلے ریٹائر ہو گئے۔

بقول ان کے دہرہ دون سارے پنشن یافتہ بوڑھوں کا روحانی وطن تھا۔ یلدرم ریٹائر ہونے کے بعد کچھ عرصے کے لئے دہرہ دون چلے گئے۔ یہیں انہوں نے اپنا کیریر شروع کیا تھا اور اکثر یہاں آ کر رہا کرتے تھے۔ یہیں پر انہوں نے ایک خوبصورت کوٹھی بنوا رکھی تھی جس کا نام "آشیانہ" تھا۔

دہرہ دون میں ان کے بہت سے دوست پہلے سے ریٹائر ہو کر مستقلاً رہ رہے تھے۔ صاحبزادہ سعید الظفر خاں جو کنگ جارجز میڈیکل کالج لکھنؤ کے پرنسپل تھے (ڈاکٹر رشید جہاں ان کی بہو تھیں)، مولوی عنایت اللہ سابق ناظم دار الترجمہ

حیدرآباد دکن اور ان کے بھائی انجینیر رضا اللہ (یہ دونوں شمس العلماء مولوی ذکار اللہ دہلوی کے بیٹے تھے) آج ان سب کا انتقال ہو چکا ہے۔

۱۹۳۵ء میں یلدرم حج بیت اللہ کے لئے گئے اور خوش خوش وہاں سے واپس آئے۔ ملازمت کے زمانے میں یہ اکثر چھ چھ مہینے کی رخصت لیکر انگلستان، یورپ اور ترکی وقت گزار آتے تھے۔ اب انکو فرصت تھی اور ان کا ارادہ تھا کہ مستقل سیاحت میں مشغول رہیں گے ۱۹۳۵ء میں شدید بیمار پڑے۔ ان کی آنکھ کے عین اوپر پیشانی پر کاربنکل نکلا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی نے جو صوبے کے مشہور ڈاکٹر تھے ان کا آپریشن کیا جو کامیاب رہا۔ شدید تکلیف کے عالم میں بھی انہیں کسی نے کراہتے نہیں سُنا۔ آپریشن کے بعد یہ پھر بشاشت سے اُٹھ بیٹھے اور لکھنؤ واپس آکر اپنے مشغلوں میں مصروف ہو گئے۔ یلدرم خالی کبھی نہ بیٹھ سکتے تھے، ریٹائر ہونے کے بعد برابر کسی نہ کسی مصروفیت میں لگے رہے۔ ملازمت کے زمانے میں بھی بہت سی غیر سرکاری ذمہ داریاں ان کے اوپر تھیں وہ علیگڈھ اولڈ بائز ایسوسی ایشن کے بہت سرگرم سکریٹری اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے، کئی یونیورسٹیوں کے ممتحن تھے۔ ان کی صحت کمزور ہوتی جا رہی تھی، مگر یہ ہر نئی مصروفیت خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے اور کبھی انکار نہ کر سکتے۔

یلدرم کو اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے بے اندازہ محبت تھی۔ ان کے بڑے بھائی سید اعجاز حیدر کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ منجھلے بھائی سید نصیر الدین حیدر بھی پرانے علیگیرین تھے۔ خان بہادر ڈاکٹر سید وحید الدین حیدر، یلدرم کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ یو۔ پی میں سول سرجن تھے اور لارڈ ولنگڈن اور لارڈ لنلتھگو کے اعزازی فزیشن تھے۔ یلدرم کی وفات کے تین سال کے اندر اندر ان دونوں نے بھی انتقال کیا۔ ان تینوں بھائیوں میں آپس میں اتنی محبت تھی جو آج کل ذرا کم دیکھنے میں آتی ہے۔

یلدرم کو اپنے سارے خاندان سے جو ماشاء اللہ بہت بڑا بھرا پرا خاندان ہے، بہت انسیت تھی۔ یہ گھنٹوں بڑی بوڑھیوں، عزیزوں حتیٰ کہ دُور کے رشتہ داروں کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرتے اور ان کے دُکھ سُکھ میں شریک رہتے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جو انہوں نے اپنے ہاں کی کلچر سے ورثے میں پائی تھی۔ یہ ہمارے دیس کے مشترکہ خاندان کے قدیم انسٹی ٹیوشن اور اس تربیت کا نتیجہ تھا۔ جس کی وجہ سے خاندان کو ایک مقدس ENTITY سمجھا جاتا تھا۔

یلدرم کی روشن خیالی اور جدیدیت کا اثر یہ ہوا کہ ان کے خاندان کی جو روہیل کھنڈ کا ایک قصباتی خاندان ہے، بے شمار لڑکیوں نے اس زمانے میں یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کیں جب کہ ابھی مسلمانوں میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم اتنی عام نہ ہوئی تھی جتنی اب ہے۔ یلدرم کی بھتیجیوں اور بھانجیوں نے آج سے تیس چالیس سال قبل کانونٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔

یلدرم بہت پکے مسلمان تھے مگر مذہبی تعصب اور تنگ نظری کو بہت بڑا اخلاقی جُرم تصور کرتے تھے۔ مختلف مذاہب کے فلسفوں پر ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ نماز کے پابند نہ تھے لیکن کبھی کبھی نماز عشاء پڑھ لیتے تھے اور بچّوں کی طرح خوش ہو کر کہتے تھے "آج ہم نے نماز پڑھی"۔

ترکوں کے لہجے میں ترکی اور ایرانیوں کے لہجے میں فارسی بولتے تھے۔ عربی بھی روانی اور شگفتگی سے بولتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مغربی طرز کی زندگی گزاری لیکن جدید "کلب لائف" اور حد سے زیادہ مغربیت زدہ خواتین ان کو سخت ناپسند تھیں۔ ان کے دو بھائیوں کو ہندستانی کلاسیکل موسیقی پر دسترس حاصل تھی لیکن خود ان کو موسیقی کا بہت زیادہ شوق نہ تھا۔ گو بچوں کو موسیقی کی تربیت کے خیال سے انہوں نے رام پور دربار کے استاد یوسف خان کو کئی سال گھر پر رکھا۔

یلدرم ترجمہ، خصوصاً ڈراموں کا ترجمہ کبھی خود نہیں لکھتے تھے۔ وہ کمرے میں ٹہل ٹہل کر روانی سے بولتے جاتے اور کوئی دوسرا شخص قلمبند کرتا جاتا۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈرامے کا ترجمہ DiCTATE اس لئے کرواتا ہوں کیونکہ اس طرح یہ احساس ہوتا ہے کہ میں خود اداکار ہوں اور DiCTATE کرواتے ہوئے مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ الفاظ کو کس طرح ادا کیا جائے۔

علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں اپنے زیادہ تر مضامین دو طالب علموں جلیل قدوائی[1] اور خواجہ منظور حسین[2] کو DiCTATE کروائے۔ ان دونوں کو اکثر اتوار کے روز یلدرم اپنے یہاں بلوا لیتے اور مضمون لکھواتے۔ خواجہ منظور حسین علی گڑھ میگزین کے اڈیٹر بھی تھے۔

یلدرم اپنا لکھوایا ہوا مسودہ دوبارہ کبھی نہیں پڑھتے تھے۔ وہ جس طرح ایک دفعہ لکھواتے وہ ان کی نظرثانی کے بغیر حرف بہ حرف اسی طرح چھپ جاتا۔ جلیل قدوائی نے مجھے بتایا کہ یلدرم اکثر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیتے (جس وقت علی گڑھ سے ان کا تبادلہ ہوا۔ میں غالباً ڈیڑھ یا دو سال کی تھی) اور ایک مرتبہ میں نے اسی طرح ان کی گود میں بیٹھے بیٹھے روشنائی گرادی تھی تو وہ بچوں کے ایسے معصوم انداز میں کہنے لگے ــــ "دیکھئے آپ نے کیا کر دیا ــــ روشنائی گرادی ــــ یہ کیا کیا آپ نے ــــ" انہیں ڈانٹنا یا خفا ہونا بالکل نہیں آتا تھا ــــ

رجسٹرار شپ کے زمانے میں بھی یلدرم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سیکرٹری تھے۔ ان کی لکھی ہوئی سالانہ رپورٹوں میں علم و ادب کے موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے بیشتر مضامین علی گڑھ میگزین، الناظر لکھنؤ، نیرنگ خیال لاہور، زمانہ کانپور وغیرہ میں چھپتے تھے اور اب نایاب ہیں۔

یلدرم نے ۱۱ر اپریل ۱۹۴۳ء کو رات کے دو بجے دفعتاً حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔ اس وقت وہ بالکل تندرست تھے اور کچھ عرصہ قبل ہی افغانستان میں چند ماہ گزار کر آئے تھے۔ اور اس وقت ان کی یہ تمنا بھی پوری ہوگئی کہ ان کی انت سمے کی بیماری یا طویل علالت سے دوسروں کو پریشانی یا تکلیف نہ ہو۔ یلدرم لکھنؤ کے عیش باغ کے قبرستان میں سپردِ خاک کئے گئے۔

---

[1] جلیل قدوائی حال ہی میں پاکستان محکمہ اطلاعات و نشریات کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ [2] خواجہ منظور حسین تقسیم سے قبل ہی لاہور آگئے تھے اور گورنمنٹ کالج لاہور کی پرنسپل شپ سے ریٹائر ہونے کے بعد آج کل انٹر یونیورسٹی بورڈ آف پاکستان کے سیکرٹری ہیں۔

نذرِ سجاد حیدر

یلدرم

آئینۂ دل میں شکل تیری ہے طرفہ جواب لاجوابی (حسرت موہانی)

غالباً جنوری ۱۹۰۸ء کا زمانہ تھا۔ میرا بچپن ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا۔ ویسے سمجھ دار سیانی تھی۔ اُردو اخبارات اور رسالے تو آٹھ سال کی عمر سے پڑھنے لگی تھی، خصوصاً رسالہ مخزن سے دلی اُنس تھا۔ میرا پہلا مضمون بھی اسی میں چھپا تھا۔ اخبارات میں سب سے زیادہ علی گڈھ گزٹ اور وکیل امرتسر کی قدرداں تھی۔ وکیل نہایت ہمدردِ قوم اور اصلاحی اخبار تھا۔ معاشرتی اصلاح میں پہلا قدم اُسی کے ذریعہ اُٹھایا گیا تھا۔ میں نے بھی اپنی کہنہ، فضول رسومات شادی و غم کے خلاف وکیل ہی میں لکھنا شروع کیا تھا اس کے بعد تہذیب نسواں میں۔ مگر وہ زمانہ ۱۹۰۳ء۔۱۹۰۴ء کا تھا۔ جب میرا شمار کمسن لڑکیوں میں تھا۔

ہاں تو جنوری ۱۹۰۸ء کی ابتدا تھی۔ مخزن کے لئے ڈاک کا انتظار رہتا تھا۔ جنوری کا مخزن جو ملا تو اس میں ایک بہت ہی اچھا دلچسپ مضمون دیکھا۔ ہیڈنگ تو یاد نہیں مگر وہ لکھا ہوا یلدرم کا تھا۔ میں نے پڑھا اور تعریف کے ساتھ اپنے پاپا اور اماں جان کو دکھایا اس دن سے تو اور بھی رسالہ کا شدت و بے صبری سے انتظار رہنے لگا۔ ان دنوں یلدرم بغداد میں تھے اور وہاں سے بہت ہی دلچسپ کچھ معاشرتی اور جذباتی مضامین لکھا کرتے تھے۔ نوجوان تھے، اردو میں قابلیت رکھتے تھے، ترکی بھی جانتے تھے۔ اُن وجوہ سے اُن کے افسانے نہایت دلچسپ و دلکش ہوتے تھے۔ زیادہ تر ترکی سے ترجمے ہوا کرتے تھے۔

اس وقت تک اُن کے صرف تین ترکی ناولوں کے ترجمے جو زمانۂ طالب علمی علی گڈھ کالج میں کئے گئے تھے۔ شائع ہوئے تھے، بعد کو عراق گئے۔ تینوں چھوٹے چھوٹے قصوں کے نام تھے، زہرا، ثالث بالخیر اور مطلوب حسیناں۔ پھر چار سالہ قیام بغداد میں تو یلدرم نے ایسے ایسے افسانے لکھے کہ اُن کا شمار اُردو کے ادیبوں میں ہوگیا۔ غالباً ۱۹۱۱ء میں وہ مجموعہ جس کا نام خیالستان ہے شائع ہوگیا تھا۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ نو عمری، بے فکری، عراق کا قیام، بار بار ترکی و ایران کی سیاحت، جذباتی ادبیت کا ایک چشمہ تھا کہ اُبل رہا تھا۔ میں کیا سب ہی پڑھنے والے بے تابی سے بغدادی نو عمر افسانہ نویس کی تحریر کے منتظر رہتے تھے۔ یلدرم نے اس وقت اُردو میں ایک بالکل نئی طرز کی بنیاد رکھی، جس کی لوگوں نے برسوں نقل کی۔

آخر وہ وقت ختم ہوا اور یلدرم بادلِ ناخواستہ ہندوستان واپس آئے۔ ان کو ترکی سے عشق تھا اور بغداد پر اس وقت ترکی کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ گو تعلیم نسواں کا عراق میں ابھی زیادہ چرچا نہ تھا۔ مگر قسطنطنیہ میں قابل خواتین موجود تھیں اور لڑکیاں پڑھائی جا رہی تھیں۔ یلدرم کو تعلیم اور آزادئ نسواں کا سودا تھا۔ یہی سبب تھا کہ ترکی کے نام پر مرتے تھے۔

غرض کہ وہ ان دنوں خوب جوشیلے اور دل آویز افسانے بغداد سے مخزن میں بھیج رہے تھے، جسے ہمارا گھر بھر نہایت شوق سے

علیگ اور بیرسٹر تھے) یلدرم کا ہاتھ پکڑتے ہوئے۔ ہنس کر کہا۔ "زہے نصیب ہمارے کہ آپ کوہاٹ تشریف لائے۔ جس طرح آپ کو زیارت قاہرہ کی کشش مصر لے گئی تھی۔ ہم کو زیارت یلدرم کی کشش بنوں ہنگو وغیرہ سے کوہاٹ لے آئی۔"

پھر اُن کے ساتھیوں کی قطار آگے بڑھ آئی اور یلدرم کو اپنے حلقہ میں لے لیا۔ اس وقت ذرا اندھیرا ہوگیا تھا اور ان لوگوں کو یلدرم کی شکل اچھی طرح دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بیرسٹر صاحب نے قریب ہی سے ایک گیس کی لالٹین اُٹھا کر اُن کے چہرے کے برابر کردی — اور بآواز کہا۔ اے مشتاقانِ یلدرم! دیکھئے ع "دل انگلش رخ زگانہ داری"۔ یہ سنتے ہی وہ سب ایک ایک کرکے سید سجاد حیدر صاحب کے سامنے آئے اور زیارت کرتے گئے۔ بیرسٹر صاحب بھاری لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ بے سہرے کے دولہا کا ایک تماشہ بن رہا تھا۔ دولہا اس وقت بادامی چائنا سلک سوٹ میں تھے۔ باغ میں ہوا سے اُن کی پیشانی پر گھونگر یالے بال بکھر رہے تھے، پُرکشش بڑی بڑی آنکھوں پر سنہری عینک چمک رہی تھی۔ میرے پاپا بھی اپنے داماد کی ایسی شاندار قدردانی سے خوش ہوکر قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ بھائی ممتاز علی صاحب وہیں کھڑے یہ نقشہ دیکھ رہے تھے۔ جب اس طریقے سے دولہا کی نمائش ہوچکی تو پاپا نے ان سب بعد کے آنے والوں کو کھانا کھلوایا اور یہ حالات ایک بجے شب کو، جب گھر کے اندر آئے، میری خالہ جان اور چھوٹی بہن ثروت آرا کو سُنائے۔ میں قریب ہی پلنگ پر لیٹی ہوئی سب سُن رہی تھی مگر سوتی بن گئی تھی۔

میں نے اب تک سوائے "مخزن" میں شائع شدہ تصویر کے اُن کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ دوسرے دن دوپہر کو ہماری پہلی ملاقات مقرر ہوئی اور اسی روز شام کو مسوری روانگی تھی۔ شاید گیارہ بجے ہوں گے، ثروت آرا میرے کمرے میں آئی اور گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔ "باجی جان، بھائی جان کو اندر بلایا جا رہا ہے۔ آپ سے ملاقات کے لئے۔" میں نے کہا "ابھی سے ملاقات کی کیا جلدی ہے، شام کو تو اُن کے ساتھ جانا ہی ہے۔" وہ بولیں "نہیں باجی۔ یہ ضروری ہے۔ ماموں جان کی رائے ہے کہ سفر سے پہلے دونوں میں روشناسی ہوجانی چاہئے۔" میں نے کہا۔ "آخر تم نے ایسا بھاری جوڑا کیوں پہنا ہے؟" اس نے ہنس کر جواب دیا "لیجئے آج ہی اچھا جوڑا نہ پہنتی تو کب پہنتی، آج ہی تو اپنے دولہا بھائی سید سجاد حیدر یلدرم سے پہلی بار ملنا ہے۔ جس ملاقات کے شوق میں ۱۹۰۸ء سے بے چین تھی۔ خالہ جان، پھوپھی جان بھی تو آرہی ہیں، اکٹھے ہی ملیں گے۔ آپ ذرا اچھے طریقے سے بیٹھ جائیے۔ چھوٹے میاں (میرا ماموں زاد بھائی اور ثروت کا منگیتر افضل علی) انہیں بلانے باہر گئے ہیں۔"

اب میں حیران، ایک پردہ دار مسلمان لڑکی پہلی بار ایک غیر شخص سے کس طرح ملے، جو بالکل اجنبی ہے مگر اسی کے ساتھ سب سے زیادہ اپنا بھی! ...... اتنے میں خالہ اور پھوپھی جان کمرہ میں آگئیں۔ پھوپھی نے مجھے صوفہ پر بٹھا دیا۔ جارجٹ کے دوپٹہ سے سر کو اچھی طرح ڈھک دیا۔ گھونگھٹ نہیں نکالا گیا۔ میرے قریب ہی ثروت آرا کو بٹھایا گیا۔ خالہ نے ہنس کر کہا۔ "دونوں ایک ہی سی ہیں، سجاد کیسے پہچانیں گے کہ بیوی کون ہے اور سالی کونسی؟" کیوں کہ میرے سر پر جھومر اور ٹیکا تو تھا نہیں اور نہ ناک میں نتھ۔ سفید پھول دار ریشمی جوڑا اور ہلکا گلابی دوپٹہ۔ میرے جوڑے سے زیادہ شوخ اور بھاری تو ثروت کا جوڑا تھا۔

سوچا جارہا تھا کہ مجھ میں کیا خصوصیت پیدا کی جائے کہ دلہن معلوم ہونے لگوں۔ پھولوں یا سہرے کا تو کیا ذکر، میرے ہاتھوں میں مہندی بھی نہیں لگی تھی۔

پڑھتا تھا اور دوسرے لوگ مخزن چھین چھین کر لے جاتے تھے۔ اتفاق کہ اُن ہی دنوں میں مَیں نے بھی نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ مسلمان لڑکیاں اس زمانے میں بہت ہی کم لکھا کرتی تھیں، اس وجہ سے میرے مضامین پر بہت سی نظریں پڑا کرتی تھیں۔ دو تین سال گزر گئے۔ اور یلدرم عراق سے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ ہوکر ہندوستان واپس آگئے اور ڈیرہ دون میں معزول امیر کابل کے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے اسسٹنٹ مقرر ہوگئے۔ وطن واپس آجانے پر عزیزوں اور دوستوں نے انھیں جلد شادی کرنے کی رائے دی۔ پہلے تو وہ یہ کہکر ٹالتے رہے کہ "میں بغداد میں ایک ترک لڑکی سے شادی کر آیا ہوں اور میری ایک لڑکی بھی ہے۔" مگر اس بات کا کسی کو یقین نہیں آیا اور سب نے شادی کر لینے پر مجبور کیا۔

اب یہ فکر ہوئی کہ شادی کہاں کی جائے، وہ اپنے بھائیوں بلکہ اپنے خاندان بھر میں نہایت روشن دماغ، آزاد خیال، اور حامیِ تعلیم و حریتِ نسواں تھے۔ بیوی بھی اپنے ہم خیال چاہتے تھے۔ چند دوستوں نے اس زمانے کی ایک آزاد خیال — اور حامیِ تعلیم نسواں لڑکی بنت نذر الباقر کا نام بتایا۔ اس لڑکی کے مضامین کی وجہ سے وہ خود بھی اس سے کچھ واقف تھے۔ اسی وقت اُن کے مضامین کا مجموعہ خیالستان چھپ کر شائع ہوا تھا اور بنت نذر الباقر کے دو معاشرتی ناول "اختر النساء" اور "آہ مظلوماں" چھپے تھے۔ دوستوں کے کہنے سے انہوں نے یہ مشورہ پسند کر لیا اور ہمدرد نسواں شمس العلماء مولوی ممتاز علی صاحب کے توسط سے میرے والدین کے پاس رشتہ کا پیام آیا۔

کچھ دنوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اُن کے خاندان اور میرے خاندان دونوں نے سخت مخالفت کی اور طرح طرح سے روڑے اٹکائے اس کو بھی کچھ عرصہ گزر گیا۔ اس زمانہ میں ایک بڑا لطیفہ ہوا۔ جس پر بعد میں دوستوں نے ہمیں بہت چھیڑا اور ہم سے مذاق کیا۔ یلدرم کے ایک مضمون "آہ یہ نظریں" مخزن میں شائع ہوا تھا۔ جو کسی حسینہ کی پُرکشش آنکھوں سے متاثر ہوکر لکھا گیا تھا واللہ کہ اس کی مجھ کو بالکل خبر نہ تھی۔ میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی آخری حسرت آمیز محبت بھری نگاہیں یاد آآ کر مجھے بے چین کرتی تھیں۔ میں نے بھی "آہ وہ نظریں" کی ہیڈنگ سے محبت بھری نظروں پر مخزن ہی میں مضمون لکھا تھا۔ جن لوگوں نے اُن کا مضمون پڑھا تھا انہوں نے میرا بھی پڑھا۔ بہر حال کچھ عرصہ تک ان مخالفتوں کا بھی اثر رہا۔ اور شادی نہ ہونے پائی۔ مگر یہ رشتہ بھی غالباً تقدیر کے زیر اثر ہوتا ہے۔ باوجود ان سب رکاوٹوں کے ہو کر رہا۔ جون ۱۹۱۲ء میں یلدرم معہ مولوی ممتاز علی صاحب اور اپنے بہنوئی وغیرہ کے ہماری جائے قیام پر یعنی سرحدی مقام کوہاٹ تشریف لائے۔ یلدرم اور بنت نذر الباقر کے درمیان عمر بھر کی رفاقت کا عہد و پیمان ہوگیا۔

اہل کوہاٹ، اُن کو دیکھنے کے بے چینی سے مشتاق تھے۔ علاوہ ان لوگوں کے جو شادی کے کھانے پر مدعو کئے گئے تھے، بہت سے ایسے لوگ بھی بن بلائے آگئے، جن کو یلدرم کے دیدار کا مدت سے اشتیاق تھا۔ جس وقت وہ لوگ پہنچے یہاں کھانا ہو رہا تھا۔ وہ لوگ خاموش باغیچہ میں ٹہلتے رہے۔ میرے پاپا مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھے اس لئے اُن کی نظر اس مجمع کی طرف نہ گئی۔ جب کھانا ختم ہوا اور سب لوگ باغ میں آکر بیٹھے جہاں نشست کا انتظام تھا تو پاپا دیکھ کر حیران ہوگئے۔ وہاں تو ساٹھ ستر صاحبان موجود تھے جن میں سے کسی کو بھی پاپا نہیں پہچانتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے آگے بڑھ کر (جو یلدرم کے زمانے کے پڑھے ہوئے

پھوپھی جان نے جو میری دوست بھی تھیں، جلدی سے میرے لباس اور رومال پر سینٹ چھڑکا، میرا سر جھکا دیا۔ نگاہیں خود بخود نیچی ہو گئیں۔ میرے جسم میں ایک کپکپی سی تھی۔ سوچ رہی تھی کیا کرنا چاہیے۔ باتیں کی جائیں یا عام دلہنوں کی طرح گُپ چُپ رہا جائے؟ وہ کیا خیال کریں گے، میں نیچے کی طرف قالین کے پھولوں اور اپنی ہائی ہیل کی روپہلی چمکیلی جوتی کو دیکھ رہی تھی؟ اور دہ تینوں چشم براہ تھیں، کہ پردہ ہٹا...... پہلے میرا بھائی افضل علی عرف چھوٹے میاں، جو ایف۔ اے کا طالب علم تھا داخل ہوا۔ اور بشاشت سے کہا " بھائی جان! آجائیں؟" — " ہاں ہاں، فوراً "۔ پھوپھی نے جواب دیا۔

وہ نیچے منتظر تھے، اندر آئے۔ سب کو سلام کیا۔ خالہ جان کے کہنے سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے جو نہایت خوبصورت کُشنوں سے سجی تھی اور اس کے تکیہ اور ہتھیوں پر پھولوں کے ہار مہک رہے تھے۔

انہوں نے ہم دونوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی (یہ مجھ کو افضل علی نے بتلایا تھا) اور خالہ اور پھوپھی جان سے مخاطب ہو گئے۔ کیونکہ اُن سے ایک بار ماہ مئی میں بھی مل چکے تھے۔ جس وقت صرف عقد کے لیے آئے تھے۔ ثروت آراء اس وقت نہ مل سکی تھی کہ بیمار تھی۔

۱۷ جون، کوہاٹ کے تپتے ہوئے پہاڑوں کی گرمی، ۱۲ بجے دن کا وقت، پنکھا چل رہا تھا، مگر شدت کی گرمی تھی وہ بار بار پانی مانگ کر پی رہے تھے۔ ثروت کوئی ۵ امنٹ خاموش اُن کو تکتی رہی، بہت بے باکی سے۔ وہ بھی سنا کہ بار بار کنکھیوں سے ثروت کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ آخر اس سکوت کو توڑنے اور ثروت سے ہم کلام ہونے کی پہل انہیں نے کی۔ اس کے بار بار دیکھنے اور میری نیچی نظریں بلکہ سر اور گردن بھی جھکی دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ یہ بھڑکیلے لباس والی ہی سالی ہے سلسلۂ گفتگو مسکرا کر شروع کیا:۔ " اب تو آپ کی صحت درست ہے؟ مئی میں جب حاضر ہوا تھا اس وقت طبیعت ناساز تھی "۔

وہ تو منتظر تھی ہی کہ بہنوئی یلدرم کسی طرح بات کریں۔ فوراً جواب دیا۔ " جی ہاں، بہت بیمار تھی، تب ہی تو اس وقت آپ سے نہ مل سکی۔ اب تو بہتر ہوں۔ مگر آج گرمی غیر معمولی پڑ رہی ہے۔ یہاں کے ریتلے میدان جب تپتے ہیں تو غضب ڈھاتے ہیں۔ آپ پہاڑ سے تشریف لا رہے ہیں۔ بہت ہی گرمی اور پیاس محسوس کر رہے ہوں گے۔ دیکھئے ذرا سی دیر میں پانی کا جگ خالی کر دیا "۔

یہ نوک جھونک سُن کر ہنسنے لگے اور کہا۔ " بے شک میں بہت پانی پی رہا ہوں۔ باہر بھی لُو کا گیا ہوں، شدت کی پیاس ہے "۔

جب سالی بہنوئی باتیں کرنے لگے تو خالہ اور پھوپھی جان یہ کہتی ہوئی اُٹھ گئیں کہ " اب کھانا بھجوایا جاتا ہے۔ پانی ہی پیتے رہے تو کھانا مشکل ہو جائے گا "۔

ثروت آراء نے وہ برف کا جگ میز سے اُٹھا لیا اور کھانے کی جگہ وہیں بنائی۔ دو چھوٹی میزیں جوڑ کر۔ نوکرانی کھانا لے آئی تو وہ بولے " آپ بھی یہیں کھائیں گی نا؟ "۔ ثروت یہ کہتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔ " نہیں بھائی جان! میری چند دوست

مہمان آئی ہوئی ہیں"۔ یہ کہا اور وہاں سے چل دی۔

اب یلدرم میری طرف متوجہ ہوئے۔ اپنی کرسی صوفے کے قریب کرکے فرمایا۔ "السلام علیکم .... شدت کی گرمی ہے ...... ذرا چہرے سے رومال ہٹا کر رُخ میری طرف کیجئے"!

بہت ہی ہمت سے کام لے کر میں نے ذرا چہرہ اونچا کیا۔ مگر نظریں فرش پر گڑی رہیں۔ انہوں نے میرے ہاتھ سے رومال چھین لیا اور مسکرا کر فرمایا ؎

"اب نہ کر پردہ کہ اے پردہ نشیں دیکھ لیا"!

پھر کھانے کی میز آگے بڑھا کر کہا۔ "شروع کیجئے!" اور خود مچھلی کا کباب اُٹھا لیا۔

میں اس گھڑی سخت مشکل میں پھنسی تھی۔ اگر اُن کی آزاد خیالی پر اعتماد کرکے بے تکلفی سے کھانا شروع کرتی ہوں۔ تو دل میں کہیں گے۔ کس قدر بے تکلف دلہن ہے۔ .... کی پرورش کا اثر ہے۔ اور اگر شرم کا اظہار کروں تو دیہاتی پرانی، پابندیٔ رسوم خیال کرینگے۔ بدقت تھوڑا سا کھایا۔ وہ باتیں کرتے رہے۔ میں آہستہ آہستہ جواب دیتی رہی۔

یہ تھی ہماری اوّلین ملاقات۔ اگر شادی سے پہلے ملاقات کا موقع ملتا بہ حیثیت ایک اجنبی ادیب اور افسانہ نگار کے، تو خدا جانے کتنی باتیں ہوتیں، یلدرم کو دیکھنے، یلدرم سے ملنے کا مدت سے اشتیاق تھا۔ مگر ملنا نہ ہوا۔ اور آج وہ زریں موقع ملا تو کسی اور ہی عالم میں، جس وقت کہ آزاد سے آزاد اور بے باک سے بے باک لڑکی بھی قدرتاً شرما جاتی ہے۔

ابھی کھانا ہو ہی رہا تھا کہ باہر سے بلاوا آگیا۔ اُن کے مشتاقانِ دیدار جون کی گرم دوپہر میں آ گئے۔ پاپا نے بلوا بھیجا تھا کیونکہ آج شب کو کوہاٹ سے روانگی تھی۔ پھر شام کی چائے باہر سب کے ساتھ جا کر پی۔ چھ بجے کے قریب اندر بلائے گئے۔ اس وقت مجھ کو خاص طور پر دلہن بنایا گیا تھا۔ مگر عزیزوں سے جدائی کا وقت تھا۔ میں بے حد افسردہ تھی۔ ثروت اور پھوپھی صاحبہ نے ایک خوبصورت صندلی رنگ کا جوڑا پہنایا۔ جس پر ہلکا ہلکا زری کا کام تھا۔ زیور لادے گئے اور سات بجے کے قریب سب سے رخصت ہو کر اپنے پاپا کا نوایجاد برقعہ پہن کر اسٹیشن روانہ ہوئی۔ بے شمار لوگ اسٹیشن پر آ گئے تھے اور سب ہی غمگین تھے۔

گاڑی چلی۔ میرا دل ہل گیا۔ کوہاٹ چھوٹ گیا .... وہ اندر آ گئے۔ آکر میرے پاس بیٹھ گئے۔ مگر میری حالت خراب تھی۔ اُن کا چہرہ بھی مکدر اور افسردہ تھا۔ آنکھیں نمناک، پسینہ پسینہ تھے۔ مجھ کو بہلانے کی یہ ترکیب نکالی۔ بولے "میرے سر میں سخت درد ہے۔ گرمی کی شدت سے پھٹا جا رہا ہے" یہ سُن کر میں آنکھیں خشک کرکے اُٹھ بیٹھی اور کہا "تھوڑا شربت پیجئے یا آئس کریم کھائیے۔ گرمی سے درد ہے"۔ مسکرا کر بولے۔ "آئس کریم ابھی چائے کے بعد کھائی ہے۔ پانی پی پی کر تھک گیا ہوں"۔ میں نے آنکھیں جھکا کر کہا۔ "لیٹ جائیے، میں سر دبا دوں"۔

یہ سنتے ہی فوراً اپنی سیٹ پر لیٹ گئے اور میرے دوپٹہ کا آنچل اپنے ہاتھ میں لیکر ذرا ترنم سے فرمانے لگے:۔

"یہ صندلی دوپٹہ میرے سر سے باندھو!"

(ماہِ نو — کراچی — دسمبر ۱۹۵۷ء)

قرۃ العین حیدر

سفینۂ غمِ دل!

لمحہ - اس کے بعد لمحہ اور اس کے بعد لمحہ - وقت کے باہر گھنٹیاں پیچھے کی طرف بجتی جا رہی ہیں - باغ میں پانی کی موٹر جس طرح گھوں گھوں کر رہی ہے - گھاس میں کہرہ جس طرح جذب ہو رہا ہے - باہر روشنی ہے اور تاریکی ہے اور موت ہے اور نم زمین کے اوپر ہوائیں تیزی سے چلاتی ہوئی گذر رہی ہیں - اب کیا ہوگا - اب کیا ہوگا - ابھی کیا ہوا تھا - ابھی یہ ہوا تھا کہ وہ انسان جو گیلری کی دوسری طرف اس گرم محفوظ آرام دہ کمرے میں مسہری پر سو رہا تھا وہ اس طرح لیٹے لیٹے اچانک ختم ہوگیا - غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے وہ دفعتاً فرش پر گرا اور تم سب جب اس کو اُٹھا کر مسہری پر لٹانے لگے تو وہ ختم ہو چکا تھا یعنی وہ اس جگہ حیات کے اس دائرے یک لخت بالکل بے تعلق ہوگیا - وہ انسان جو تمہارا باپ تھا - جس نے ابھی تین گھنٹے پہلے گھڑی دیکھی تھی، تم سے باتیں کی تھیں، تم کو شب بخیر کہا تھا -

اب تم کس لئے یوں بچوں کی طرح کمروں کے کونوں میں چھپ چھپ کر چلّا چلّا کر روتی پھر رہی ہو ؟

ایک طوفان زدہ چاند یوکلپٹس کے جھنڈ کے پیچھے جا چکا ہے اور آہستہ آہستہ صبح ہو رہی ہے -

اب ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں - ہر بات کہی جا چکی ہے - ہر رنج سہا جا چکا ہے - ہم زندہ ہیں اور باتیں کر رہے ہیں - ہم مئی کی نیلی کہر آلود گھاس کی طرح زندہ ہیں -

مَیں زندہ ہوں - ماضی سے دفعتاً مَیں آگے نکل آئی ہوں - یہ رات کل کی رات جو دفعتاً ماضی میں شامل ہوگئی - ہوائیں - اور کریسنتھم اور ہولی ہوکس کے پھول - خاموشی ریت کی طرح نیچے گر رہی ہے اور باغ کے یہ پرانے مانوس پھول کہرے میں بلیوں کی زبانوں کی طرح نم اور خنک ہیں -

چنانچہ ابا میاں یہاں سے ہم الگ ہوتے ہیں - آج کی اس کہر آلود صبح سے میرے اور آپ کے وجود کی کیفیت علیحدہ علیحدہ کر دی گئی اور میں کسی اور جلا وطنی، کسی اور سفر کی تیاری کے لئے آپ کے ہولڈال پر چڑھی بیٹھی ہوں اور ایسا کبھی نہ ہوگا کہ زندگی میں ہم گھر واپس آ جائیں -

صبح ہوگئی - باغ کے پچھواڑے شہتوت کے جھنڈ میں سے گذرتے ہوئے بوڑھے اینگلو انڈین نے حسب معمول بیگ پائپ بجانا شروع کر دیا ہے - مجھے معلوم ہے کہ وہ ہمیشہ "اسکاٹ لینڈ کی بلو بیلز" اور "اولڈ لانگ زائن"

بجاتا ادھر سے گزرتا ہے۔ لیکن ابّا جان کے کمرے کی یہ کھڑکی اب نہیں کھُلے گی۔ یہ کھڑکی جس کے پردے میں نے رات کو برابر کیے تھے۔ ابّا جان مر گئے۔

الماریوں میں ابّا جان کے کپڑے رکھے ہیں۔ مگر ملبوسات، ٹائیاں، ڈریس سوٹ۔ سب میں وقت اور جاڑوں اور نیم کے پتوں کی مہک ہے۔ وہ ڈریس سوٹ اوپر پڑا ہُوا ہے جو رات کو ابّا میاں نے پہنا تھا۔ واش بیسن ان کے مصنوعی دانت سکون سے اپنے پیالے میں موجود ہیں غسل خانے کے سفید فرش پر ایکوا ویلوا کی چند بوندیں پڑی ہیں۔ سنگھار میز پر برش میں ابّا جان کے چند سلور گرے بال اُلجھے ہوئے ہیں۔ سگار کی ادھ جلی راکھ کتابوں پر پڑی ہے۔ کمبل، لحاف، مسہری، قالین، تکیے، پردے، تولیے، سلیپر، ہر چیز میں زندگی کی گرمی موجود ہے۔ کتابوں کی الماریوں کے پیچھے ایک چھپکلی آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ برساتی کی سمت کھُلنے والے دریچے کے باہر صبح کا اخبار رکھ دیا گیا ہے۔ خطوں کے بکس میں صبح کی ڈاک لا کر رکھی جا رہی ہے جس میں حسب معمول ابّا جان کے نام کے بے شمار لفافے ہیں۔

ہر طرف بے شمار انسان نظر آ رہے ہیں۔ گھاس پر، چبوترے پر، برآمدوں اور کمروں میں سنجیدہ شکلیں بنائے نیچی آوازوں میں باتیں کرتے، وہ سب ادھر اُدھر چل رہے ہیں اور بے حد تن دہی سے کسی خاص مرحلے کو انجام تک پہنچانے کے لیے انتظامات میں مصروف ہیں۔ ڈرائنگ روم میں وہ مونچھوں والے وکیل صاحب بیٹھے ہیں بنکوں کے کاغذات ان کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک برآمدے کی سیڑھیوں پر دو شاعر نما انسان جلدی جلدی کچھ لکھنے میں منہمک ہیں اور بار بار رومال سے ناک چھوتے جاتے ہیں۔ راج ولنشز کے احاطے میں ایک خیمہ لگا دیا گیا ہے۔ سڑک پر موٹروں کی قطاریں حد نظر تک چلی گئی ہیں۔ اروناؔ کی آنکھوں کے پپوٹے سرخ ہو رہے ہیں۔ میرا سفید ساری کا آنچل سر پر ڈالے سیڑھیوں پر خاموش بیٹھی ہے۔ انکل راج ونش چھڑی کی نوک سے باغ کی زمین کریدنے میں مشغول ہیں ——— مستقل گہما گہمی ——— اسٹیلا، اسٹیلا ——— ابّا جان کبھی اس بات کو پسند نہیں کرتے ہیں کہ گھر میں مسلسل شور مچا رہے۔ اتنے سارے لوگ! پارٹیاں ہو رہی ہیں، مستقل چائے پی جا رہی ہے۔ وہ سب لان پر کیوں جمع ہیں۔ ان سے کہو چلے جائیں۔ ایکو ایک۔

سو جاؤ۔ سونے کی کوشش کرو۔ اسٹیلا رسان سے کہہ رہی ہے۔

اور اگر ابّا جان کو معلوم ہو گیا کہ ان کے کمرے کے فرش پر ان سب لوگوں نے مستقل سگریٹ کی راکھ جھاڑی ہے اور دیا سلائیاں قالین پر بکھیری ہیں۔ ابّا جان نے یہ سب دیکھا تو مجھ پر پڑے گی ڈانٹ۔ تمہارا کیا بگڑے گا!

میں سہم کر کہہ رہی ہوں۔

سو جاؤ ——— سو جاؤ!

مَیں نے آنکھیں بند کر لی ہیں، حالانکہ ابّا جان ہرگز پسند نہیں کرتے کہ ان کے لیے FUSSES کیے جائیں۔

ان کے لئے اتنا بڑا سفید دوشالہ آیا ـــــ سفید دوشالہ۔

خاموشی سے لیٹ کر سو جانے کی کوشش کرو بی بی ـــــ یہ سومیشوری موسی کی آواز ہے۔ اتنا بڑا سفید دوشالہ جو ان کے اُوپر ڈالا گیا ـــــ مَیں دہراتی ہُوں۔

گھڑی مسلسل ٹک ٹک کر رہی ہے۔ وقت لرز رہا ہے۔

مَیں اِدھر اُدھر گھوم رہی ہوں۔ گھر میں نسبتاً خاموشی طاری ہوچکی ہے۔ چبوترے پر ابّا جان کی دھاری دار کینوس کی آرام کرسی رکھی ہے۔ سالہا سال تک دھوپ میں رکھی رہنے کی وجہ سے اس کا رنگ اُڑ گیا ہے۔ اس کینوس کو مَیں نے ابھی چھوا ہے۔ چچا جان خاموشی سے برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔ چھوٹے چچا جان ان کے ساتھ ٹہلتے ٹہلتے آکر اس آرام کرسی پر چپ چاپ بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی کبھی اللہ ہو اکبر، اللہ ہو اکبر کہہ اُٹھتے ہیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر مَیں ان کے تیسرے ساتھی کو بھی دیکھنا چاہتی ہوں اور میری نظر گیلری کے دروازے کی طرف اُٹھتی ہے جس میں سے باہر آکر ابّا جان اس چبوترے پر بیٹھ جاتے تھے۔

لیکن وہ دروازہ بند ہے۔ ابّا جان کا کمرہ مقفل کر دیا گیا ہے۔

یہ کھانے کا کمرہ ہے۔ کھانے کی میز پر ابّا جان کا بریک فاسٹ کا سامان اسی طرح لگا ہُوا ہے اور گو مَیں نے کل سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ ابّا جان نے کہیں اس فکر میں نوکر نہیں دوڑائے۔ کہیں ٹیلیفون نہیں کئے۔

برساتی میں اولڈز موبیل سکون سے کھڑی ہے۔

بی بی، آج ۱۰ر اپریل ہے۔ کل سے آپ ڈیوٹی پر آجایئے۔

بی بی، آج آپ کہاں جارہی ہیں۔ کیا پہنا ہے آکر دکھلایئے۔

اوہ جناب! آج آپ نے جیبیوں والے بالے پہنے ہیں۔ کسی فینسی ڈریس کی تیاری ہے؟

آج رات کو آپ کا ڈراما کئے بجے ہے؟ مَیں اس کو سُننے کی خاطر کہیں باہر نہ جاؤں گا۔ بی بی، آپکو اقبال کو سمجھنے کا سخت دعویٰ ہے۔ آیئے ذرا یہ اشعار تو پڑھیئے۔

ابّا جان ہم کالج ڈے کے موقعہ پر "کوالٹی اسٹریٹ" اسٹیج کر رہے ہیں۔

ابّا جان اپنا خوب صورت گرے سوٹ پہنے، کار سے اُتر کر نکلسن ہال کی سیڑھیاں چڑھتے ہیں۔ کالج کی پورچ میں داخل ہوکر مسز داس سے باتیں کر رہے ہیں۔ کوریڈورز میں سے گزرتے دوسرے مہمانوں اور فیکلٹی کے ساتھ ڈرامے کے اڈیٹوریم کی طرف آرہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں پروگرام ہے، جسے بار بار دیکھ کر ان حصّوں کو دوبارہ پڑھتے ہیں جہاں میرا نام ہے۔

ابّا جان ریڈیو کے پاس گرم ڈریسنگ گاؤن اور کمبل لئے میرا کوئی مباحثہ یا ڈرامہ سُن رہے ہیں۔ آپ کی بحث کے نکتے شروع سے آخر تک غلط تھے۔ جب میں ریڈیو اسٹیشن سے واپس آتی ہوں وہ خفگی سے کہتے ہیں۔ آپ طالب علم حضرات دوسروں کے مسائل کا حل سوچتے ہیں اور خود ایک مسئلہ بنتے جارہے ہیں۔

کرسمس یا گرما کی تعطیل میں تینوں بھائی تینوں میں سے کسی ایک کے گھر پر جمع ہیں۔ سارے گھر کو بچّوں کی تفریحات اور اودھم

کسی سے اس کی شکایت کرتے نہیں پائے گئے۔ زندگی سے ان کو جو توقعات رہی ہونگی اور انسانوں کی طرف سے ان کو جو مایوسیاں ہوئیں، ان کی فہرست بنا کر انہوں نے کبھی نہیں سُنائی۔

مَیں فرش پر بے دھیانی سے بیٹھی ان کا غذات کو اُلٹ پلٹ رہی ہوں۔ ان کاغذوں، ان الفاظ میں اب کیا رکھا ہے۔ مَیں سوچنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آبا جان شروع سے آخر تک وجود کی ایک سطح پر زندہ رہے۔ اس شدت سے انہوں نے زندگی کے بے پایاں حسن، بے پایاں اُداسی، بے پایاں ابدی مسرت کا اندازہ لگایا۔ وہ آخر وقت تک پرسوں رات تک ۱۹۰۷ء کے نوجوان رہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے زمانے سے پچیس ۲۵ سال آگے سوچا اور آخر وقت تک اپنے آپ کو دنیا کے اس ہجوم میں تنہا پایا۔

مَیں فرش پر سے اُٹھتی ہوں۔ مَیں نے کاغذات سمیٹ دئے ہیں۔ یہ کمرہ بند کر دیا جائے گا۔ ان بے کار چیزوں سے اس جذباتی لگاؤ کا کوئی حاصل نہیں۔ باہر نیلی گھاس میں چھپی ہوئی مٹی نم اور خنک ہے اور آوارہ ہوائیں اِدھر اُدھر منڈلاتی پھر رہی ہیں۔

سو جاؤ۔ بھول جاؤ —— اسٹیلا عباسی مخملیں سلیپر پہنے نیلے ہاؤس کوٹ میں ملفوف ہاتھ میں شمع دان لئے دبے پاؤں رکھتی آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہے۔

علی نے برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے بیتالیسواں سگریٹ جلایا ہے اور پوری طرح آنکھیں کھول کر سامنے باغ کی تاریکی کو غور سے پہچاننے کی کوشش میں مصروف ہے۔

دودھ والے کی گاڑی حسب معمول ندی کے راستے پر سے شور مچاتی کہرے میں سے نکل کر باورچی خانے کے پھاٹک کی طرف آتی ہے۔ سڑک پر جامنوں کے نیچے بیل گاڑیاں کھڑی ہیں، جن پر فالتو سامان اور فرنیچر لاد کر گوپال پور کی طرف روانہ کیا جا رہا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔ تصویریں، کتابوں سے بھرے ہوئے ٹب، پرانے جھاڑ فانوس جو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹائی جاتی ہیں تو ان کے ساتھ ایک بے کار سا ترنم چھڑا رہ جاتا ہے۔ شاگرد پیشے کے پچھواڑے زمین نم ہے اور فضا میں کھاد اور بھوسے کی مہک ہے۔ مَیں نے جنگلے کی ٹھنڈی لکڑی پر سر رکھ دیا ہے۔ مجھے یہ جگہ، یہ جنگلہ ہمیشہ سے پسند ہے۔ لہذا میں کچھ دیر یہیں ٹھہروں گی، مَیں خود کو بتاتی ہوں۔

گھر سرو کے درختوں میں چھپا ہوا، ہمیشہ کی طرح خاموش باوقار اور پُرسکون اپنی جگہ پر موجود ہے۔

قرۃ العین حیدر

جہاں پھول کھلتے ہیں!

خلیج بنگال کے ان دُور افتادہ ہرے جزیروں میں جب ہم ناریل کے بلند درختوں کے نیچے ریت کے قلعے بناتے تھے۔ یا جب ہم کیسپین کے ساحلوں پر رنگین چھتریوں کے سائے میں بیٹھے تھے یا جب ہم گنگا کی عظیم لہروں پر سفید کیبن اور نیلے پردوں والے اسٹیمروں میں گھومتے تھے۔ ان عجیب دُور اُفتادہ پُراسرار زمانوں سے لے کر اب تلک ان بائیس سالوں کی ریتوں پر چلتے ہوئے مَیں وقت کے اس کنارے پر آئی ہُوں جہاں صرف اپریل کی رات کی اتھاہ کھُلتی ابھتی خوش بو ہے اور رات کے لمحے ہر سراتے ہوئے میرے اُوپر سے گزر جاتے ہیں۔

ان سرسراتے لمحات سے میں نے پوچھا اپریل کی اس رات کے لمحو تم اس طرح تیرتے ہوئے کس طرف جاؤ گے۔ اور آگے آگے وقت کی اس سیّال برستی ہوئی تاریکی میں بہتے بہتے تم کتنی دُور تلک پھیلو گے اور کہاں پہنچ کر معدوم ہو گے۔ سمے کی اتھاہ گمبھیر خاموشی کی موجوں پر ڈولتے ہوئے ان لمحات کو مَیں نے چپکے سے بتایا۔ مَیں نے بتایا کہ مَیں نے تمہیں پہچانا ہے اور فرشتوں سے دعا مانگی ہے کہ کائنات پر اُداسی پھیلائے بغیر تم یوں ہی سرسراتے، بہتے آگے چلے جاؤ اور دُعائے شب کے بعد مجھے نیند آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ تم صبح کاذب کی چپ چاپ سنگیت میں تحلیل ہو جاتے ہو۔ صبح کاذب کی وہ سنگیت جو پو پھٹے وقت کی درماندگی کی اونچی لہروں پر منڈلاتی ہے۔

اپریل کی رات کے ٹھنڈے لمحو، تم مستقبل کے برسوں کی طویل لڑکھڑاتی قطاروں تلک پہنچ کر کہاں چلے جاؤ گے۔ آج کی رات مَیں نے سارے پچھلے زمانوں کو جمع کر کے ایک طرف رکھ دیا ہے اور مَیں پیچھے کی اور دیکھ رہی ہوں۔ زرد پہاڑی گلاب کی مہک زمین سمفنی کے سُر، بارش میں بھیگے، بل کھاتے، نیلگوں سبز کو ہستانی راستے جن سے اسکول کی بے جان کرسمس کے گیت گاتی گزرا کرتی تھیں۔ نیو ٹنک کی ملبوسات، ان سب کو اکٹھا کر کے مَیں نے ایک طرف کر رکھ دیا ہے تاکہ تم اسی طرح سے چُپ چاپ پرواز کرتے رہو اور کوئی چیز تمہاری راہ میں مخل نہ ہو۔

سیاہ موجیں آگے بڑھتی ہیں، پیچھے ہٹتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں۔ ایک ریلے کے بعد دوسرا ریلا اور سکوت کے لرزاں ستونوں کی قطاریں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی آگے روانہ ہو جاتی ہیں اور منجمد یکسانیت کائنات کے زرد میدانوں کے اُوپر جھکی، روتی اور چلاتی رہتی ہے اور کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ سب چیزوں کا انجام بہت خوش گوار ہوگا اور ہم سب یقیناً زندہ رہ پائیں گے۔ اپریل کی

کے لئے چھوڑ کر باغ سن شیڈ کے نیچے انہیں بچوں کے مستقبل کے لئے اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں۔ شعر و شاعری پر بحث ہوتی ہے۔ "ہم سب آپ حضرات کو اپنی فینسی ڈریس پارٹی میں مدعو کرنا چاہتے ہیں"۔ بے حد سنجیدگی سے ہم لوگ جا کر ان سے کہتے ہیں۔ "آپ حضرات مع اپنی بیگمات کے تشریف لائیے اور اگر اونٹ یا بہلی پر بیٹھ کر آئیے تو زیادہ مناسب ہے!"۔ چچا جان عرب شیخ بنے ہیں۔ ابا جان سے نرسری کی نظمیں سنوائی جا رہی ہیں۔

سو جاؤ۔ تھوڑی دیر کے لئے سو لو۔۔۔۔ سومیشوری موسی جھک کر پھر رساں سے کہتی ہیں۔

ابا جان کا کمرہ بند کر دیا گیا ہے۔ الماریاں مقفل رکھی جا رہی ہیں۔ ضروری کاغذات مختلف درازوں میں سے نکال کر مونچھوں والے وکیل صاحب کو دئے جا رہے ہیں یا ترتیب سے علیحدہ رکھے جا رہے ہیں۔

یہ کتب خانہ ہے جس میں دنیا کی پانچ زبانوں کے ادب کی بہترین کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ یہ کتابیں عمر بھر کی تلاش، تحقیق، جستجو اور شوق کا ماحاصل ہیں۔ ترکی، عربی، فرنچ اور فارسی کی ان پرانی اور نئی کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے والا اب کوئی نہیں ہے۔ یہ اسی طرح الماریوں میں رکھی رہیں گی۔ اس موجودہ دنیا میں کتابوں کے اس انبار کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

اس دراز میں ابا میاں کی تصنیفات کے نامکمل مسودے پڑے ہیں۔ یہ طارق ہے جس کا ترجمہ ابا جان مجھ سے لکھوا رہے تھے جس کا ایک باب انہوں نے پچھلے ہفتے مکمل کیا تھا۔ کس طرح وہ ترکی پڑھتے پڑھتے اسی وقت روانی سے اس کا ترجمہ اردو میں لکھواتے جاتے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ قالین پر کہیں ٹھٹھک جاتے اور سگار کی راکھ جھٹک کر ایک لمحے کے لئے غور سے فرش کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچتے اور پھر بولنا شروع کر دیتے۔ اتنی دیر میں بور ہو کر ادھر ادھر دیکھتی رہتی یا بھاگ جانے کی ترکیبیں سوچتی۔ "ابا جان! اب باقی کل ــــــ ابا جان! ابھی مجھے ذرا میرا کے ہاں جانا ہے"۔

"بہت اچھا! کل اگلا ایکٹ لکھیے گا"۔ وہ خوشی سے کہتے۔

میز کی نچلی درازوں میں پرانے البم پڑے ہیں جن کی تصویروں کا رنگ مدھم ہو چکا ہے۔ ابا جان جو ایم۔ اے او کالج کے ذہین ترین اور سب سے زیادہ ویل ڈریسڈ طالب علم سمجھے جاتے تھے۔ یکی بارک کے سامنے یونین کے پریذیڈنٹ کی حیثیت سے آرنلڈ اور موریسن کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم سے قبل کے یورپ کے مختلف دار السلطنتوں کے سفارتخانوں کی سیڑھیوں پر اٹنگے سوٹ پہنے بے حد سنجیدہ شکلوں والے انسانوں کے ساتھ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ وی آنا اور بوڈاپسٹ کے باغوں میں کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور پیچھے فوارے چل رہے ہیں۔ آس پاس عجیب و غریب پرانے فیشن کے کپڑوں میں ملبوس آدمیوں اور خواتین کے گروہ ہیں۔ استنبول، اناطولیہ، ۱۹۰۶ء، ۱۹۰۸ء، قسطنطنیہ میں یہ ابا جان کی چھوٹی سی گم نام شاطو ہے۔ اس میں ترکی کے نئے نوجوان ادیبوں، نوجوان دیوانوں کا مجمع رہتا ہے۔ یہ شاندار خوب صورت سفید رنگت والا عجیب و غریب ہندوستانی نوجوان جو اتنے دور دراز ملک سے یہاں آیا ہوا ہے، اپنی جان کا خطرہ مول لے کر اپنی شاطو میں ان سر پھرے انقلابیوں کو مہمان رکھتا ہے جن کی گرفتاری اور جلاوطنی کے لئے حکومت عثمانیہ وارنٹ جاری کر چکی ہے۔ اس انوکھے نوجوان نے ترکی زبان کا ایک تخلص یلدرم اختیار کر رکھا ہے اور اس نام سے وہ اپنے ملک کے رسالوں کے

لئے عجیب و غریب کہانیاں اور خواتین کی آزادی کے لئے شعلہ ریز مضامین یہاں سے لکھ لکھ کر بھیجتا رہتا ہے۔ اپنے دیوان پر بیٹھے بیٹھے اور قہوے کے فنجان ختم کرتے ہوئے یہ آئندہ زمانوں کے خواب دیکھتا ہے جب اس کے ملک میں بھی اسی طرح انقلاب کو خوش آمدید کہنے والے پیدا ہوں گے۔ جب وہاں کی خواتین کو بھی عزت نفس کا احساس پیدا ہوگا۔ روس کا انقلاب ابھی بہت دُور ہے۔ ایران ابھی تک قرون وسطیٰ میں کھویا ہوا ہے۔ قزوین کی زریں تاج کو ایرانی یاد رکھنا نہیں چاہتے۔ ہندوستان میں اکبرالہ آبادی لوگوں کو ہنسا کر رُلانے میں مصروف ہیں اور قسطنطنیہ کی اس گم نام شاطو میں یہ لوگ عجیب و غریب اصلاحات نافذ کرنے کی اسکیمیں بنانے میں محو ہیں۔ ینگ ٹرک پارٹی کا پہلا جلسہ اس شاطو میں منعقد ہو رہا ہے۔ ان سب کا میزبان یہ انوکھا ہندوستانی بچوں کی طرح اکسائیٹڈ اور خوش ہے۔ سلطان کے جاسوس مکان کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ ترکی تخلص والا یہ ہندوستانی اپنی شدید امید آفرینی، شدید خود اعتمادی کے ساتھ کبھی شہرت، کبھی صلے کی مطلقاً نہ کرتے ہوئے چپکے چپکے ترکی کے انقلاب کے لئے کام کر رہا ہے۔ ترکی سے یہ کیسا والہانہ عشق ہے۔ کیسی روحانی، قلبی اور ذہنی کشش ہے۔ یہ عشق، یہ کشش آخر تک باقی ہے اور اس شدت سے زندہ ہے ——— یہ نامق کمال بے کی جلدیں ہیں۔ یہ جمہوریہ اور راوو یانش کے فائل ہیں۔ یہ جنرل فخری پاشا کے خطوط کے لفافے ہیں۔

ابا جان کو انت سمے تک انسانیت کی آخری اچھائی پر اعتماد رہا ہے۔ یہ ان کی آخری نظم ہے جو انہوں نے چند ماہ قبل لکھی ہے جس میں انہوں نے ایک غم زدہ دوست کو مخاطب کیا ہے ؎

نہ مرنے کی کرنا کبھی آرزو !　　شکستہ نہ کر اپنا اپنا جام و سبو

. . . .

غرض زاہدی یہ نصیحت سُنو !　　جیو گرچہ جینے میں غم ہی سہو
مگر کر رہا ہے جو یہ وعظ و پند　　نہیں خود نصیحت پہ وہ کاربند
وہ دنیا سے نومید و بیزار ہے　　غم و رنج کا اس پر انبار ہے!
وہ قلب حزیں وہ دل دردمند　　وہ سوز دروں وفغان بلند!
شب و روز و صبح و مسا تلخ کام　　چہ خوش دادہ ام زندگی را نظام

ابا جان نے آج تک اپنے کسی رنج یا مایوسی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اپنی جسمانی اور روحانی ہر تکلیف کو نہایت خاموشی اور بہادری کی شان کے ساتھ برداشت کیا ہے۔ لیکن ان اشعار میں انہوں نے ختم ہونے سے چند روز پہلے اپنے ایک دوست کو بتانا چاہا ہے کہ وہ زندگی سے خوش نہیں رہے۔ کتنے کم لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ دُنیا میں ایسے اعلےٰ نفس انسانوں کے لئے بالکل جگہ نہیں ہے۔ لیکن ابا جان کی خود اعتمادی شروع سے آخر تک قائم ہے۔ وہ اسی طرح بشاشت سے گنگناتے رہتے ہیں۔ دوسروں کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں میں شریک رہتے ہیں۔ ہر وقت ان کو اس کا خیال رہتا ہے کہ ان کی وجہ سے کسی اور کو معمولی سا رنج نہ پہنچے۔ ان کو سمجھنے والے بہت کم ملے ہیں لیکن وہ

وقت کے اس صحرائے عظیم کی پھسلتی ہوئی ریت پر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی میں یہاں تک پہنچی ہوں اور میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہے۔ اس زندگی میں بہت کم آنسو تھے۔ بہت ساری خوشیاں، پھولوں کے موسم، سرجو کی اور رام گنگا کی لہروں کی روانی اور برفانی دسمبر کی نرم اور گرم دھوپ۔ لیکن ایسا کس طرح ہے کہ ہم اپنے لئے جو شیشے کے چھوٹے چھوٹے گھر بنا کر محفوظ ہو بیٹھے ہیں۔ ان میں سے نکل کر ہم آگے نہیں دیکھ پاتے۔ پھر موت آتی ہے اور سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

برسوں، صدیوں کے سفر کے بعد وہ اس جگہ پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں مجھے بھی جانا ہے۔ چھٹیوں کی صبح کو اپنی آرام کرسی پر نیم دراز، اخبار پڑھتے ہوئے وہ اپنے پسندیدہ اشعار گنگناتے رہتے۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے اور صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا۔ اور آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں، رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے۔

اپریل کی اس رات کے لمحو! تم یوں ہی سرسراتے ہوئے آگے نکل جاؤ گے لیکن چاروں اور کیسے گھٹیا لوگ ہیں، کیسے گھٹیا دماغ ہیں اور کتنی گھٹیا باتیں ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے انسان، اعلیٰ درجہ کے ذہن، اعلیٰ درجہ کے معیار اور اقدار یہ سب کہاں گئے۔ کیا ہمیں آس پاس کے ان گنت انسانوں میں سے ایک بھی ایسا نظر آتا ہے جسے ہم صحیح معنوں میں بڑھیا انسان کہہ سکیں؟ آؤ، ہم ایم آیوری کا برج تلاش کریں اور اس میں جا بیٹھیں اور تصویریں بنایا کریں۔ کیا یہ دنیا کسی اور بات کے قابل نہیں۔ یہاں کی سڑکوں پر صرف تازہ ترین موڈل کی کاریں ملتی ہیں اور غیر ملکی وفدوں کے خیر مقدم کے لئے طیران گاہوں کو جایا جاتا ہے اور ایٹ ہوم اور زیادہ کانفرنسیں اور زیادہ سیمبا رھمبا، اس کے علاوہ اور یہاں پر کچھ نہیں ہے۔ ہمارے اس نظام حیات کی گاڑی اس طرح کب تک چلے گی؟ زندگی موت سے جو ہر وقت آتی رہتی ہے اور نہیں آتی اور جب آجاتی ہے تو پتہ نہیں چلتا کہ اگر نہ آتی تو کیا حرج تھا

زندگی کا سب سے بڑا عظیم ترین صدمہ مجھے پہنچ چکا ہے کہ ابّا میاں تم ایک روز ایسے اچانک چلے گئے اور تمہیں گئے ہوئے آج چھ سال گذر گئے اور اس طرح گزرتے چلے جا رہے ہیں اور یہ بہت ساری دنیا تم کو بھولتی جا رہی ہے۔ وہ سارے لوگ جن کو تم پسند تھے جو تمہیں پسند تھے۔

ابّا میاں! تم نے ایک بار خانۂ خدا کے قریب صحرائے عرب کے خاک آلود گرم پتھروں پر بیٹھ کر "کعبے کے سامنے" ایک نظم لکھی تھی ـــــ

آوارہ گرد آج ترے در پہ ہے کھڑا — اللہ کیا کشش ہے ترے آستانے میں
احرام و طوف سارے ظواہر تو ل گئے — سنتا ہوں دل کا چین ہے تیرے خزانے میں

خدا کے گھر کے سیاہ غلاف پر ہاتھ رکھ کے تمہاری معصوم آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اب جب کہ تم اپنے اس خدا کے حضور میں خود پہنچ چکے ہو، ابّا میاں! تم یقیناً بہت خوش ہو گے۔

اس وقت یہاں پر کتنا سکون ہے۔ مکمل سکون اور چین۔ مدتیں گذریں، ایک رات گھر کی ٹھنڈی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے میں نے دفعتاً محسوس کیا۔ دریچے کے شیشوں پر جھکی ہوئی انار کے شگوفوں کی ایک ٹہنی سرسرا رہی تھی۔ اس سمے مجھے اچانک

ایسا معلوم ہوُا تھا جیسے آس پاس کی باقی تمام چیزیں، دروازوں کے فالسئی پردے، سیاہ الماریاں، کونے میں رکھی ہوئی سائیکل یہ سب اتنی اجنبی اور بے کار چیزیں ہیں۔ صرف یہ شاخ زندہ ہے، صحیح ہے۔ اپنی ہے۔ مجھے صرف ایک شاخ چاہیئے۔ سُرخ شگوفوں کی یہ شاخ دُور سڑک پار درختوں کے جھرمٹ میں چھُپے ہوُئے دور دور یہ اداس، پشیمان، بے کل سے مکان کھڑے اونگھ رہے ہیں اور چاندنی ان پر رینگ رہی ہے اور پھر اس وقت دفعتاً میں نے ایسا محسوس کیا تھا کہ یہ سب اس قدر پُراسرار ہے اس قدر لرزہ خیز، اس سے ڈر لگتا ہے۔ انار کی اس ٹہنی سے بھی ڈر لگتا ہے۔ کتنے ان گنت انسان مجھ سے پہلے پیدا ہوئے۔ ہزاروں برس سے ایک نسل کی زندگیوں کا یہ سلسلہ کیسا لڑکھڑاتا چلا آرہا ہے۔ میرے اتنے بے شمار پرکھ بھی کچھ زندہ رہے ہوں گے۔ چلتے پھرتے ہوں گے۔ برساتوں میں خوش ہوتے ہوں گے۔ اپنے پرکھوں کی ان تاریک قطاروں کے سائے مجھے بے حد پُراسرار معلوم ہوئے۔

جب ہم زندہ ہوتے ہیں تو ایک خوفناک ان جانی، ان دیکھی طاقت ہمارے پیچھے پیچھے، ہمارے آگے آگے چلتی رہتی ہے اور بالآخر چلتے چلتے ہم خود تھک جاتے ہیں تو ہمیں موت کے سایوں کی وادی تک پہنچا کر واپس لوٹ آتی ہے اور دوسری روحوں کے پیچھے چپکے چپکے چلنا شروع کر دیتی ہے۔

پھر ہمیں انسانوں کا ایک گروہ ملتا ہے جو ہمیں پسند آتا ہے۔ ہم اس سے مانوس ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں یا اللہ! یہ اتنے پیارے لوگ اب تک کہاں چھپے ہوئے تھے۔ ان کے بنا ہماری زندگی کتنی نامکمل رہتی۔ لیکن وقت کے دھارے کے ساتھ وہ گروہ ہم سے بچھڑ جاتا ہے اور کوئی دُوسرا گروہ مل جاتا ہے۔ اس طرح ہم ایک عدم وجود سے دوسرے عدم وجود تک کا فاصلہ طے کرتے رہتے ہیں۔ کتنے ایسے انسان ہوں گے جو ہم سے کہیں نہیں ملے اور نہ ان سے کبھی ملنے کا ہمارا اتفاق ہوگا۔ اگر کبھی وہ مل جاتے تو ہم کتنے خوش ہوتے۔ لیکن ہم انہیں جانتے بھی نہیں

وہ ان دیکھی تاریک روشنی کی طاقت میرے سامنے کھڑی ہے۔ اس کھڑکی کے پار۔ اس انار کی شاخ کے نیچے ۔۔ اس سڑک کے موڑ پر لیمپ کے پیچھے۔ اندھیرے میں۔ دریا کے ساحل پر۔ تم کون ہو بھائی —— میں وہ ہوں جو تم سے مل نہیں سکتی۔ لیکن ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی —— یہ مجھے جانے کس طرح کی موت کی طرف لے جائے گی۔

ایک روز میں نے اپنی مدر سپیریر سے پوچھا تھا۔ ہولی مدر، وہ کیا وجہ تھی جس نے تم کو یہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ کیا۔ وہ کون کشش تھی جو تم نے اپنے آئرش مرغزاروں کو چھوڑ کر اس اجنبی اور گرم ملک کو اپنایا اور کیوں تم دوسرے مذاہب کی ضدی اور غیر دلچسپ لڑکیوں کے ساتھ دماغ کھپانے میں اپنی عمر بتا رہی ہو۔ —— کیا —— کیا تم نے بھی انار کے شگوفوں کی کوئی اکیلی ٹہنی سرسراتی دیکھی ؟ میں نے ان سے سوال کرنا چاہا۔

آپا میاں! تم قنوطی نہیں تھے۔ تم نے ایک بہادر کھلاڑی کی طرح بہت سے رنجوں کو بھی سہار لیا۔ تم ایسے عجیب وغریب انسان تھے جس کا زندگی بھر میں کوئی ایک بھی دشمن پیدا نہ ہو سکا۔ اگر کوئی تمہاری زندگی کی کہانی لکھنے بیٹھے تو اسے کتنی مایوسی اور تعجب کے ساتھ کمزوریوں اور برائیوں اور خامیوں کا باب خالی چھوڑ دینا پڑے گا۔

رات کے ان لمحات کے نیچے میں نے اپنے باپ سے کہا۔ میرے بہت پیارے ابا میاں! وجود کی اس شدت کو تم نے محسوس کیا تھا؟

ہاں! وہ میرا باپ تھا جو ۱۱؍اپریل کی اس رات کو ختم ہوا۔ آدھی رات کے ٹھنڈے، نرم، اطلسی لمحو، یوں ہی خاموشی سے سیال تاریکی میں گھلتے میرے اوپر سے گزرتے رہو۔ کیونکہ میں تمہیں چپکے سے یہی بتانا چاہتی تھی کہ آج کی رات ابا میاں چلے گئے تھے۔ انہیں زرد پہاڑی گلاب کی مہک پسند تھی اور نویں سمفنی کے سروں کی لہریں بھی۔ اور جب وہ چپ چاپ تھک ہار کر آرام سے اپنی مسہری پر سو گئے تو بہت سے لوگ آئے اور انہیں ان کی خواب گاہ میں سے اُٹھا کر اس برساتی میں لے گئے جس کا راستہ پچھلے باغ کی طرف جاتا تھا جہاں ہولی ہوکس کے اونچے ڈنٹھل پھولوں کے بوجھ سے جھک آئے تھے۔ کیونکہ وہ اپریل کا مہینہ تھا۔ اور برساتی میں سے وہ انہیں گومتی کے کنارے کنارے اس جگہ لے گئے جہاں پرانے بادشاہوں کے اچھے زمانوں میں عظیم الشان میلے لگا کرتے تھے۔ وہ جگہ عیش باغ کہلاتی تھی اور وہاں پرانے، بھورے، شکستہ، دہشت ناک، امام باڑوں اور پُراسرار اندھیری مسجدوں کے لرزہ خیز میناروں کے سائے میں چنبیلی کی جھاڑیوں کے پیچھے وہ لوگ انہیں چھپا آئے۔ اپریل کی اس ٹھنڈی خوشگوار رات اور خوش گوار صبح یہ سب ہوا تھا جب کہ باغ میں ہولی ہوکس کے پھول کھل رہے تھے۔

زندگی کی شدت، زندگی کا حسن اسے اس انسان نے محسوس کیا اور پہچانا جو میرا باپ تھا اور وہ میرا انسان چنبیلی کی جھاڑیوں اور خوشبودار جنگلی پودوں میں چھپ گیا۔

تم خوش قسمت تھے ابا میاں! جو تم نے یہ زمانہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا۔ تم یہ سب دیکھ کر یقیناً دل شکستہ ہو جاتے (تاریخ کے دھارے جب پلٹتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بین الاقوامی امور کے جگمگاتے ادارے میں ایک غیر ملکی سفیر مونوکل لگائے زور زور سے کہہ رہا تھا، تاریخ کے دھارے —— تاریخ کے دھارے —— گھوں گھوں کرتے طوفان گرجے اور آوازِ بازگشت فضا میں پھیلتی گئی) اور ابا میاں تمہارا سارا کتب خانہ، اس کی فرانسیسی اور ترکی کتابیں اور رسالوں کے وہ پلندے جو تمہارے پاس پیرس اور انقرہ اور استنبول سے آئے تھے، یہ سب اس سفیر اور اس جیسے دوسرے سفیروں کی بنائی ہوئی تاریخ کے دھارے کی زد میں آگیا اور تمہارے سارے محبوب شاعر اور پسندیدہ فلسفی اور محترم پیغمبر جنہوں نے دُنیا کو بچانے کی ذمہ داری اُٹھائی تھی، سب کے سب اس دھارے میں بیچارے بہہ گئے اور ہمارے باغ کے پچھواڑے شہتوت کے جھنڈ میں وہ آدمی بیگ پائپ بجا رہا تھا جو برسوں سے اسی طرح روزانہ صبح سویرے پرانی اسکاچ دھنیں بجاتا اور ادھر سے گزرتا تھا اور امرودوں کے بڑے جھنڈ کے پرے پولس لائن میں یونین جیک بلند کرتے وقت جو بگل بجایا جاتا تھا اور شام کے اندھیرے میں ری ٹریٹ کے وقت جو بگل بجتا تھا (جس کی آواز پر دل ڈوبتا تھا اور گھاس پر شبنم کے قطرے پھیل جاتے تھے) اس صبح وہ بگل بھی اسی طرح بجا تھا اور ہولی ہوکس اور گل عباس کی کیاریوں پر سے ہوا بھی اپنی مہک بکھیرتی گذرتی تھی۔ یہ سب اس صبح بھی ہوا تھا جب ابا میاں تم نے منھ اندھیرے ہی عیش باغ کا رخ کیا تھا

آنگن میں مہوے کے سائے اور آم کے بُور کی مہک پھیلی ہوئی تھی جو بہار کی آمد کا پیغام لاتی ہے اور ٹھنڈے

فرحت بخش راستوں کے کنارے کنارے جامن کے درخت ہیں اور اڑہر کے کھیت ہیں اور تھوڑے فاصلے پر آموں کے جھرمٹوں میں سے کوئی شکستہ مگوں والی خانقاہ یا پرانی حویلیوں کے بیچے کھچے ستون یا محرابیں یا کوئی ایک اکیلا گنبد نظر آ جاتا ہے جس پر بھورے رنگ کی گھاس یا اکاس بیل پھیلی ہے۔ اور سرسبز سنگھاڑوں اور پیلے کنولوں والی جھیلیں ہیں جن کے کنارے ہم ٹھہر کر سستا لیتے ہیں اور پھر برابر کے ہرے کھیتوں میں دوڑتی ہوئی چھوٹی لائن کی ٹرین کے ساتھ خوش دلی سے ریس کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں اور پھر وہ چھوٹے چھوٹے بازار آتے ہیں اور چوپالوں اور پنچایت گھروں کے کچے چبوترے اور قصبوں کے رنگین دیواروں والے مکان اور سرخ اینٹوں کی حویلیاں جن کے پھاٹک کی محرابوں پر دو مچھلیاں آمنے سامنے بنی ہوئی ہیں۔ یہ بے چاری نیک شگون کی مظہر مچھلیاں جو ہمارے اس دیش کا قدیم نشان تھیں اور ٹھنڈے کچے آنکھوں والے زمینداروں کے گھر کا یہ سب اپنا پن ہے اور بسنتی اور سرخ چنریاں اوڑھے اور رنگ برنگے لہنگے اور ساریاں پہنے اور چاپٹی کی والے پائجاموں کے پائنچے اور کواڑ سے بارش کی پھواروں سے بچتی لڑکیاں ان باغوں میں جھولے کی پینگیں بڑھاتی ہیں۔ دیس کی لڑکیاں اور یہ سب ختم ہو جاتا ہے۔ آسمان بدل گیا ہے۔ زمین بھی بدل چکی ہے۔

اور یہ یوکلپٹس کے سائیں سائیں کرتے جھنڈ کے سرے پر سیمل کا وہ اونچا درخت حسب عادت چپ چاپ اور تنہا کھڑا تھا جس کے پھولوں کی روئی ہوا کے ساتھ ساتھ سارے میں اڑتی پھرتی تھی۔ اس درخت کی اونچی سی اور موٹی جڑ پر بیٹھ کر میں نے طویل دوپہروں میں امتحان کے لئے ایک مرتبہ کیٹس پر تنقید کی پندرہ کتابیں ختم کی تھیں۔ کیٹس، جس نے زندگی کو مر کے محسوس کیا اور سیمل کے سرخ پھول آگ کی طرح گرتے تھے۔ دنیا کتنی خوب صورت ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچا ایسا کیوں ہوا؟ پھر میں نے چپکے سے اپنے ابا میاں سے پوچھنا چاہا۔ میرے بہت پیارے ابا میاں! تم جانتے ہو، یہ سب کیوں ہوا؟ تم ضرور جانتے ہو گے ابا میاں! کہ ایسا کیوں ہوا؟ — کہ خداوند کریم کے اتنے ان گنت بے چارے انسان یوں دکھی ہو جائیں۔ کیا واقعی ہم اتنے برے ہیں اور ان دکھوں اور سزاؤں اور امتحانوں کے مستحق ہیں۔ لیکن ابا میاں نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ وہ پہلے ہی آگے جا چکے تھے۔

ارے امن کہاں کھو گیا۔ لمحات کا یہ تسلسل اور ابا میاں! تم کتنی دور دراز کی سیاحت پر جا چکے ہو کہ اب واپس نہیں آپاتے۔ یہ میرا باپ ہے جو سب کچھ سمجھتا اور جانتا ہے۔ جو اتنا حلیم، اتنا شریف النفس، اتنا عظیم ہے جس کی طرح کا دوسرا انسان پیدا نہیں ہو سکتا۔ جس نے زندگی اچھی گزاری اور دوسروں کو بھی اچھی زندگی گزارنے میں مدد کی۔ جس کی وجہ سے لوگ خوش ہوئے۔ میرا باپ جس کے چاندی کے تاروں ایسے سلونے گھرے بال تھے۔ جو ئیل کوٹ پہن کر جہاز کے عرشے پر چھوٹے چھوٹے متفکر قدم ہوا ٹہلتا تھا تو ساری کائنات متبسم اور مطمئن ہوتی تھی۔ جس کا وجود فرشتوں کی طرح بے ضرر اور معصوم تھا اور بہت سارے پھولوں کے زمانے، برفانی جاڑے اور شگفتہ برساتیں گزارنے کے بعد ایک موسم گل میں وہ چلا گیا۔ جب کہ باغ میں ہولی ہوکس کھل رہے تھے۔

دُنیا میں اتنی ساری دلکش پیاری چیزیں پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن ان کا کوئی حاصل نہیں۔ جنوبی سمندروں میں جزیرے ہیں اور خس کی خوشبو اور یوجین اونیل کے ڈرامے، بیتھوون کی موسیقی اور اچھے انسان برسوں کے اُلٹ پھیر کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بھی مر جاتے ہیں۔ یہ کتنی زیادتی ہے۔

ابّا میاں! دُنیا کے کتنے کم لوگ اب تمہیں یاد کرتے ہوں گے۔ انقرہ، استنبول اور طہران میں اس طرح تمہاری دل چسپی کی نئی نئی کتابیں چھپتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ اور فرانس اور آسٹریلیا میں اسی طرح دسمبر کی برف جگمگاتی ہے۔ اور جب اپریل کا مہینہ آتا ہے تو باغوں میں ہولی ہوکس کے ڈنٹھل اس طرح پھولوں کے بوجھ سے جھک جاتے ہیں جیسے اس روز صبح جھکے ہوئے تھے۔ جب لوگ تمہیں تمہارے کمرے سے اُٹھا کر برساتی میں لائے تھے اور وہاں سے عیش باغ کی طرف لے گئے تھے۔

اپریل کی اس رات کے لمحو! یونہی چپ چاپ سرسراتے ہوئے گذرتے رہو۔ تمہاری پرواز روک کر تم سے یہ باتیں کرنے کا بھی کوئی حاصل نہیں۔

آؤ! ہم خاموش ہو جائیں اور ان لمحات کے بھاگنے کی آواز سُنیں اور چپکے بیٹھ کر مستقبل کے زمانوں کا انتظار کریں۔ اپریل کے آسمان پر اندھیرا گہرا ہو گیا ہے اور ہوا میں بوندیں گرج رہی ہیں۔

کہ اسی طرح رات آتی ہے۔

پرنسپل مشتاق احمد زاہدی (مرحوم)

سیّد سجّاد حیدر یلدرم

ہر فرد بشر کی زندگی کے تحت بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ کوئی رُخ کسی کے سامنے آتا ہے اور کوئی کسی کے۔ سید سجاد حید[ر یلدرم]
... بغداد میں پولیٹیکل ڈریگو ماں یعنی سیاسی ترجمان رہے۔ یو۔پی میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ علی گڈھ میں مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار ر[ہے]
اس سے قبل حاجی اسمٰعیل خاں صاحب رئیسِ دتاولی کے سیکرٹری، انگریزی کے استاد اور ترکی زبان کے شاگرد رہے۔ راجہ اعظم
... والیٔ ناگ پور کے اتالیق اور معزول شدہ امیر کابل امیر یعقوب خان کے سیاسی نگران اور مہاراجہ صاحب محمود آباد
کے سیکرٹری رہے۔ مگر میرے پیشِ نظر ان کی مختلف زندگیوں کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ میں نہ ڈپٹی کلکٹر سجاد حیدر کو جانوں
نہ میں سجاد حیدر رجسٹرار سے واقف۔ میں تو صرف سجاد حیدر اور یلدرم کو بہ حیثیت مضمون نگار، ناول نویس اور شاعر کے جانتا
ہوں، میں سید صاحب مرحوم کی نہ مدح سرائی کرنا چاہتا ہوں اور نہ مرثیہ خوانی۔ میں صرف ان کی وہ تصویر پیش کرنا چاہتا ہو[ں]
جو میرے ذہن میں ہے۔

سید سجاد حیدر صاحب سے میری دوستی کی ابتدا ۹۷ - ۱۸۹۶ء سے ہوئی، جب ہم دونوں مدرستہ العلوم علی گڈھ میں
ایف۔اے میں پڑھتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے ساتھ بہت سے ایسے جماعتی تھے جنھوں نے اپنے اپنے فن
میں بہت نام پایا۔ مثلاً مقصود علی خان یونیورسٹی میں اوّل پاس ہوئے اور پھر یو۔پی میں ڈپٹی کلکٹر ہو کر کمشنر کے عہدہ تک
پہنچے۔ اسی طرح ملک زمان مہدی خان بھی الٰہ آباد یونیورسٹی میں شاید دوم نمبر میں پاس ہوئے اور پنجاب میں ڈپٹی کمشنر ہوئے
محمد علی جو بعد میں مسٹر محمد علی آکسن اور مولانا بنے اور اپنی قابلیت اور قوم پرستی میں شہرۂ آفاق ہوئے، وہ بھی ایف۔اے
میں ہمارے ساتھ تھے۔ سجاد حیدر بھی ان میں سے کسی سے کم نہ تھے۔ فرق یہ تھا کہ مقصود علی خان اور زمان مہدی
اگرچہ ذہین تھے مگر کتابی کیڑے بھی تھے۔ سجاد ادھر اُدھر کی کتابوں کا مطالعہ تو بہت کرتے تھے مگر امتحان والی کتابوں کو
محض ضرورتاً پڑھ لیتے تھے۔ باوجود اس کے جب ایف۔اے کا نتیجہ آیا تو معلوم ہوا کہ سجاد صاحب انگریزی اور فارسی میں
تمام الٰہ آباد یونیورسٹی میں اوّل نمبر۔ مگر کم بخت ریاضی میں صفر۔ محمد علی کا وقت بھی کرکٹ کھیلنے والوں کی صحبت میں ضائع
ہوتا تھا کیونکہ وہ عبد اللہ کرکٹ کپتان کے ساتھ رہتے تھے۔ تاہم محمد علی بہت ذہین تھے اس لئے امتحان میں پاس تو ہو
گئے مگر نمبروں میں سجاد کا دگا بھی نہ کھا سکے۔ محمد علی کی قابلیت آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہو کر چمکی۔ سجاد کی خاموش قابلیت
اور طبعی انکساری کی وجہ سے کالج والے ان کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان کے ریاضی میں فیل ہو جانے سے ہر شخص اس مضمون

کو بد دعا دینا تھا۔ ریاضی نے ان کا بہت قیمتی وقت ضائع کرایا جس کی وجہ سے وہ ساری عمر نہ پنپ سکے اور ملازمت کی دوڑ میں مقصود علی خاں اور زمان مہدی جیسے ساتھیوں سے پیچھے رہ گئے۔ مگر طالب علمی کے زمانے میں ان باتوں پر کوئی غور نہیں کیا کرتا اور باوجود اس ناکامی کے سجاد کی ہر دلعزیزی اور شہرت میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ طلبا اور پروفیسروں کو سجاد سے ہمدردی اور زیادہ ہوگئی کہ افسوس ایسا قابل شخص ریاضی کی وجہ سے رہ جا۔ ئے۔ چنانچہ جب بی۔ اے میں ریاضی سے پیچھا چھٹا تو سجاد تمام الہ آباد یونیورسٹی میں چوتھے نمبر پر پاس ہوئے۔

یونین میں تقریر کرنے کا شوق سجاد کو سکول کے زمانے سے تھا۔ اخبار بینی کا بھی مرض تھا۔ اس لئے یونین کے سب اعزازی عہدے ان کو حاصل ہوگئے۔ یعنی وہ سلیکٹ کمیٹی کے ممبر ہوئے۔ پھر لائبریرین ہوئے۔ پھر سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اور آخر میں تقریر کرنے کا انعام بھی حاصل کیا جس میں ان کا نام یونین کے ہال میں اس وقت تک لکھا ہوا ہے۔

مضمون نگاری سجاد حیدر نے ایف اے کے زمانے میں یا اس سے بھی قبل شروع کی۔ اسی زمانے میں ان کا تعلق حاجی اسمٰعیل خان صاحب رئیس دتاولی سے ہوگیا حاجی صاحب موصوف اس زمانے کے نامور اردو ادیب بھی تھے اور ترکی زبان بھی خوب جانتے تھے۔ ممالک مشرقی کی سیر بھی کر آئے تھے اور انھوں نے ایک اردو رسالہ بھی جاری کیا تھا، جس میں بہت اعلیٰ قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ سجاد صاحب حاجی صاحب کے سیکرٹری بھی تھے اور ان کو انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں سجاد صاحب کی عمر بہت زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ حاجی صاحب کی صحبت کا ان پر بہت اثر پڑا، اوّل تو یہ کہ ان کو ادب اردو سے جو ذوق تھا وہ پختہ ہوگیا۔ دوم یہ کہ انھوں نے ترکی سیکھی اور حاجی صاحب کی طرح مشرقی ممالک خاص کر ٹرکی کی سیر کے بہت دلدادہ ہوگئے۔ انگریزی انشا پردازی میں بھی سجاد حیدر صاحب بی۔ اے کرنے سے پہلے ہی اپنے ہم عصروں میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ کالج کے طلباء اس زمانے میں اچھی انگریزی ہونے کا یہ معیار سمجھتے تھے کہ "پانیر" میں مضمون چھپ جائے۔ اکثر طلباء نے جن کو اپنی انگریزی پر ناز تھا، سعی لاحاصل کی مگر سب سے پہلے سجاد حیدر کا ہی ایک مضمون شائع ہوا۔ اس کے بعد جن صاحب کا مضمون شائع ہوا وہ محمد علی تھے جو ان کے کلاس فیلو تھے۔ اس کے کئی سال بعد سیار رضا علی (جواب آنریبل ہیں) کے بہت سے خطوط جو اچھے طویل ہوتے تھے "پانیر" میں چھپنے لگے تو یار لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب "پانیر" کا معیار کم ہوگیا ہے۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سجاد حیدر صاحب ناگ پور کے راجہ اعظم شاہ کے اتالیق مقرر ہوکر ناگ پور گئے مگر بعد میں گورنمنٹ نے علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا۔ ایک ریلوے کی کوٹھی جو کالج سے دور نہ تھی ان کے رہنے کے لئے کرایہ پر لی گئی، اس میں دو کمرے قانون پڑھنے والے طلباء کے لئے مخصوص کئے گئے۔ چنانچہ سجاد کی کوشش سے اس میں مجھے اور مرحوم انعام الحق کو (جو گورنمنٹ آف انڈیا کے پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں پہلے انڈر سیکرٹری مقرر ہوئے اور خان صاحب اور خان بہادر کے حقدار ہوئے) جگہ ملی۔ اور اب ساری کوٹھی ہم تینوں ہم خیال وہم مذاق دوستوں کے قبضے میں آگئی۔ راجہ صاحب تو بے چارے شاگرد تھے علیحدہ کونے میں پڑے رہتے تھے۔ اس کوٹھی کا نام "بیچلر لاج" یعنی کنوارا گڈھ رکھا گیا۔

کیونکہ نہ صرف یہ کہ ہم تینوں کنوارے تھے بلکہ اس وقت ہمارا یہ خیال بہت زیر بحث رہتا تھا کہ دنیا میں ترقی کرنے اور آرام سے رہنے کے لئے متاہل زندگی موزوں نہیں ہے ـــــ اس خیال کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ ہم لوگوں کو نئی تہذیب بہت چڑ گئی تھی۔ اور اس زمانے میں یعنی اب سے پچاس برس قبل مسلمان عورتیں انگریزی تعلیم سے تو محض نابلد تھیں۔ اردو لکھنا پڑھنا بھی کسی کسی کو آتا تھا اور جن کو آتا تھا وہ اس زمانے میں بڑی تعلیم یافتہ سمجھی جاتی تھیں اور مغربی طرز زندگی سے تو سارے ہندوستان میں سوائے معدودے چند خواتین کے کسی کو بھی واسطہ نہ تھا اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ جس طرح ہم بیچلرز لاج میں صاحبانہ زندگی بسر کرتے ہیں اسی کی ہماری رفیقۂ حیات بھی اہل ہو۔ اور چونکہ یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی اس لئے یہ خیال دل نشین ہو گیا تھا کہ جب تک اس قسم کی بیوی نہ ملے شادی کرنی ہی نہ چاہیے۔ کنوارا گڈھ کے نام سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اس کے مکین عورت سے نفرت کرتے ہیں مگر اس کے برعکس ہم لوگ عورت کی بہت عزت کرتے تھے اور انعام مرحوم تو خاص توقیر کرتے تھے اور ہم نے اس وقت سے اپنا مقصدِ زندگی مسلمان ہندی عورت کو تعلیم کے ذریعہ بتدریج معراجِ ترقی تک پہنچانا قائم کیا تھا۔ چنانچہ اسی زمانے میں ایک اور حامیٔ نسواں شیخ عبداللہ ..... صاحب نے اسی مقصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علی گڈھ سے ایک زنانہ رسالہ "خاتون" شائع کیا جس کے شاید پہلے ہی نمبر میں ہمارے کنوارا گڈھ کے ممبر انعام الحق صاحب نے حقوقِ نسواں پر ایسا زبردست مضمون لکھا کہ جس کی دھوم ہو گئی اور ہم تینوں ہمیشہ اس رسالے میں مضمون دیتے رہے۔ اسی سلسلہ میں، اسی زمانے میں (سن ۵-۱۹۰۴ء) علی گڈھ کالج میں پہلی زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کے بانی جناب شیخ عبداللہ صاحب تھے لیکن ہم تینوں نے بھی اس کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ کانفرنس ہمارے لئے کئی معنوں میں دلچسپ اور نرالی تھی۔ اوّل یہ کہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان میں محترمہ عطیہ فیضی جیسی انگریزی دان آزاد خیال اور ترقی یافتہ مسلمان خواتین بھی موجود ہیں جو سرسید احمد خان کے کالج کی سر بفلک چاردیواری میں بھی پردہ کرنے کو قیدِ محض سمجھتی ہیں اور آبرو بیگم جیسی مشرقی علم وفضل میں یگانۂ روزگار مستورات بھی ہیں جن تک علم کی روشنی سات پردوں میں بھی پہنچ گئی۔ دوم یہ کہ ایسی خواتین کی موجودگی میں حامیانِ طبقۂ نسواں کو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

بیچلرز لاج کی زندگی کبھی نہ بھولے گی۔ ڈگری لینے کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ قانونی تعلیم محض علی گڈھ کالج سے وابستہ رہنے کا بہانہ تھا۔ سوائے نئی دنیا بنانے کے اور کسی قسم کا فکر نہ تھا۔ کالج کے نئے اور پرانے سربرآوردہ طلبا کو ہر ہفتے دعوت پر یا چائے پر مدعو کیا جاتا تھا اور اتفاق سے اگر کوئی قوم کی مقتدر ہستی کالج کے ملاحظے کے لئے علی گڈھ میں موجود ہوتی تو ان کے فیضانِ صحبت سے بھی استفادہ حاصل کیا جاتا تھا۔ اور یہ مواقع اس لئے نکالے جاتے تھے کہ باہمی تبادلۂ خیالات کے بعد قومی اور معاشرتی مسائل کے حل کرنے کی کوئی صورت نکالی جائے تاکہ اس نئی دنیا کو قائم کر سکیں جس کے ہم خواب دیکھا کرتے تھے۔ بحث کے موضوع زیادہ تر حقوقِ نسواں، تعلیمِ نسواں، پردہ، نئی روشنی، مغربی طرزِ معاشرت، احکام اور شریعتِ اسلام ہوا کرتے تھے۔ سجاد ان مباحثوں میں پیش پیش ہوتے تھے۔ جو تجاویز وہ پیش کرتے وہ اس وقت ناقابلِ عمل معلوم ہوتی تھیں۔ مثلاً ان کا ایک یہ خیال تھا کہ نماز دیسی زبان میں ہوا کرے اور قرآن شریف کا ترجمہ بغیر عربی عبارت کے علاوہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے۔ مسجدوں میں وضو کرنے کے لئے ایسے غسل خانے بنائے جائیں جن میں کوٹ پتلون اور ہیٹ استعمال کرنے والے مسلمانوں کو وضو کرنے میں سہولت ہو، جہاں

ہیٹ لٹکانے کا انتظام ہو۔ اور اگر جوتے سمیت نماز پڑھی جائے تو جوتے یعنی بوٹ پر چڑھانے کے لئے مستیوں کے قسم کے غلاف ہوں۔ اسلامی قانون اور وراثت میں بھی وہ مشترکہ خاندان کی طرز پر تبدیلی چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں وراثت کی اسلامی تقسیم کی موجودگی میں مسلمان دولت کو ایک خاندان میں عرصہ تک نہیں رکھ سکتے۔ اس قسم کے دوستانہ مناظروں کے مبحث اکثر مضامین کی شکل میں رسالوں میں ظاہر ہوتے تھے۔ اردو کے قرآن شریف اور اردو میں نماز پڑھنے اور تقسیم وراثت پر جو سجاد حیدر صاحب کے مضامین اس زمانے کے رسالوں میں شائع ہوئے تو ان کے خلاف بہت کچھ لے دے ہوئی۔ اسی زمانے میں بغداد میں ایک ترجمان کی جگہ نکلی اور پرنسپل علی گڑھ کالج سے اس کی مانگ آئی۔ بہت سے طالب علموں نے درخواستیں دیں جن میں بعض ایسے بھی تھے جن کا کام روزانہ پرنسپل صاحب کو سلام کرنا بھی تھا اور جو عربی میں ایم اے تھے۔ سجاد صاحب نے بھی درخواست دی گو سجاد صاحب بی۔ اے تھے۔ اور پرنسپل موریسن سے کبھی ملتے بھی نہ تھے مگر موریسن صاحب نے سب سے زیادہ سجاد کی سفارش کی۔ نیز ان کو ترکی بھی آتی تھی چنانچہ ہم لوگوں کے خیال میں غیر متوقعہ طور پر ان کا تقرر ہو گیا اور ان کے جانے سے بیچلرز لاج کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

سجاد بغداد میں کئی سال تک اپنے فرائض منصبی نہایت شرافت اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ شرافت میں نے اس لئے لکھا کہ سیاسی کاموں میں بہت کچھ لگائی بجھائی کرنی پڑتی ہے اور اپنے ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں کے گلے کاٹنے پڑتے ہیں مگر یہ کام سجاد نے نہیں کیا۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کو اس اہم سیاسی عہدے کے باوجود کوئی خطاب نہیں ملا۔ اور نہ یہ عہدہ ان کی ترقی کا زینہ بن سکا۔ بغداد سے آخر ان کا دل بھر گیا اور وہ چھٹی لے کر ہندوستان آئے۔ واپسی پر ہم نے دیکھا کہ بغداد کی آب و ہوا سجاد کو بہت موافق آئی تھی اور وہ بہت فربہ اور توانا معلوم ہوتے تھے۔ سیاسی حالات کے متعلق تو وہ بہت ہی محتاط تھے۔ اور کبھی کسی بات کا ذکر تک نہ آیا۔ لیکن بغداد کے اور حالات جو انہوں نے سنائے تو ان سے یہ سن کر تعجب ہوا کہ وہاں خاکروب یا بھنگی نہیں ہوتے۔ پاخانوں کی بجائے گھروں میں بڑے گہرے گڑھے کر لئے جاتے ہیں جن میں نجاست مہینوں تک جمع ہوتی رہتی ہے اور جب وہ گڑھے بھر جاتے ہیں تو میونسپلٹی کے آدمی جو مسلمان ہوتے ہیں آ کر صاف کر جاتے ہیں یعنی کدال پھاوڑوں سے کھاد نکال کر لے جاتے ہیں لیکن انگریز لوگ پاٹ استعمال کرتے ہیں جن کی صفائی عیسائی لوگ کرتے ہیں۔ چنانچہ سجاد نے بھی ایک عیسائی دس روپے ماہوار پر خاکروب کے فرائض ادا کرنے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ بغداد میں تمام اسلامی احکام شرعی کا بھی بہت احترام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ رمضان شریف کے ماہ مبارک میں تمام طباخیوں کی دکانیں اور کھانے کے ہوٹل حکماً بند کر دیئے جاتے تھے اور کوئی شخص بازار میں سگریٹ نہ پی سکتا تھا۔ حتیٰ کہ غیر مسلم مثل یہود و نصاریٰ بھی ان اسلامی احکام کا سخت احترام کرتے تھے اور خواہ وہ ترکوں کی حکومت کے کتنے ہی خلاف ہوں مگر منہ سے ہمیشہ ترکوں کی تعریف ہی کرتے رہتے تھے لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں نے خلافت اپنے ہاتھ میں رکھ چھوڑی تھی۔ جس کی وجہ سے تمام غیر مسلم قوموں پر اسلام اور ترکوں کا بہت رعب تھا اور اب چونکہ ترکوں نے نہ صرف خلافت بلکہ سلطنت کے لئے اسلام سے بھی ہاتھ اٹھا لیا تو وہ رعب ختم ہو گیا۔ بلکہ الٹا غیر مسلم اقوام سے اہل عراق مرعوب ہو گئے ہیں۔

چھٹی پر ہندوستان آنے کے بعد سجاد واپس بغداد نہ گئے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے ان کو معزول شدہ امیر کابل امیر یعقوب خاں

خواجہ غلام السیدین

ایک دِل کَش شخصیّت

سیّد سجّاد حیدر یلدرم، کیسی خوش گوار، کیسی مہر و محبّت کی یادیں وابستہ ہیں اس نام سے -!
علی گڑھ کالج کے قیام کے دوسرے ہی سال میں مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس کے پہلے رجسٹرار سجّاد حیدر صاحب مقرر ہوئے۔ اس حسن اتفاق کی بدولت جلد ہی ان کی ملاقات کا لطف نصیب ہوا - نام اور شہرت سے واقف تھا اور خاندانی تعلقات جو ان کے ساتھ رہے تھے جانتا تھا۔ میرے والد مرحوم خواجہ غلام الثقلین سے ان کو بہت عقیدت تھی اور وہ انہیں اپنا "گرو" مانتے تھے - عم محترم خواجہ غلام السبطین ان کے کلاس فیلو اور دوست رہے تھے اور بھائیوں کی طرح عزیز تھے - خود مجھ کو تو پہلی ہی ملاقات میں ان کے "فتراک کا نخچیر" تھا۔ ان کی محبّت، شفقت اور گرم جوشی نے اپنی آغوش میں لے لیا اور جب تک ان کی زندگی کی شمع روشن رہی یہ رشتہ اس خلوص کی فضا میں چلتا رہا۔ اور اب جب کہ ان کو جوار رحمت میں پہنچے سالہا سال ہو گئے ہیں اور اپنا حساب کا دن قریب ہے، ان کی محبوب یاد کو ایک سرمایۂ عزیز سمجھتا ہوں۔ جب روز حساب اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا (خدا کرے ایسا ہو) - تو مجھے یقین ہے کہ نیکیوں کی فرد میں ایک اندراج یہ ہوگا کہ اس شخص نے سجّاد حیدر کی قدر اور ان سے محبّت کی تھی۔

قدرت نے ان کو ایک حسّاس دل کی دولت دی اور ایک ادیب کا دماغ اور قلم۔ لیکن اس کی ستم ظریفی نے ان کو ڈپٹی کلکٹری کے لئے انتخاب کیا۔ ایک زمانے میں اس قسم کی ان مل بے جوڑ باتوں پر تعجب اور افسوس کیا کرتا تھا۔ اب کہ دُنیا کا ذرا بہتر تجربہ ہو گیا ہے، افسوس نہیں صرف تعجب کرتا ہوں۔ کیونکہ دُنیا ادیبوں اور شاعروں ٹھیک معنی میں کام کرنے والوں کو حکومت اور انتظام کی کرسی بھی کہاں اور کب دیتی ہے ؟ وہ تو اکثر (شاید ان کی تخلیقی قوتوں کو فروغ دینے کے لئے!) - یہ بھی ضروری نہیں سمجھتی کہ ان کی روز مرہ کی ضرورتوں کو پورا کرے - سجّاد حیدر کو تو اس نے ڈپٹی کلکٹری کا اعزاز دیا۔

ایک یونیورسٹی کی رجسٹراری کے لئے چھانٹا، جہاں تک یاد پڑتا ہے، ریاست محمود آباد کا منتظم بنایا۔ فبایِّ الآءِ ربکما تکذّبان!........ لیکن در اصل قابل ذکر چیز یہ خلاف معمول زیں نہیں، بلکہ اس گردش روزگار میں، اس ناسازگار ماحول اور کاروبار میں اپنی ذہنی اور اخلاقی دیانت، بلکہ اپنی گرم جوش انسانیت، اپنی ادب آفرینی اور اپنے ذوق ظرافت اور طباعی کو قائم رکھنا ہے، علمی اور ادبی شوقوں کے چراغ کو روشن رکھنا ہے، ترکی زبان سیکھنا (جو اس وقت محض "زبان یار من" سمجھی جاتی تھی اور یار بھی فرضی!) اور اس کے ترجموں سے اردو زبان اور ادب کو مالا مال کرنا ہے، اُردو میں ایک نئے طرز نگارش، ایک مخصوص اور انفرادی ادب لطیف کی بنیاد ڈالنا ہے۔ جس میں ظرافت کھیسین نکال کر نہیں ہنستی بلکہ اس کی خوش گوار چاشنی اور انداز بیان دونوں میں خوب صورتی کے ساتھ سموئی ہوئی ہے۔ ہماری زبان میں ترجمے بہت مدت سے ہو رہے ہیں اور اس زمانے میں تو اور زیادہ عام اور مقبول ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے اچھے ترجمے بھی اکثر مضمون یا کہانی یا خیال کو ادا کر پاتے ہیں۔ غیر زبان کے اشاروں اور کنایوں کو، اس کی ادبی چاشنی کو، اس کی مخصوص روح کو اپنی زبان میں منتقل نہیں کر پاتے۔ سجاد حیدر نے اپنے ترکی سے اُردو ترجموں میں یہ بھی کر دکھایا۔ اُردو زبان میں طنز، ظرافت، بے باک سیرت نگاری پہلے سے موجود تھی۔ مثلاً ڈکنس کی طرح سرشار نے فسانۂ آزاد میں مضحک صورت حال کی تصویر کشی اور دلچسپ کرداروں کی سیرت نگاری اس کمال کے ساتھ کی کہ کہیں کہیں ادب اور زندگی کے بیچ کی دیواریں اٹھا دیں۔ لیکن سجاد حیدر نے اپنی جگہ پر ادب لطیف کو ایک خاصا نرم اور سبک انداز بیان بخشا۔ جس سے بہت سے بعد کے لکھنے والوں نے حسب صلاحیت فیض حاصل کیا۔ "حکایات و احتساسات" کی کہانیاں اور خاکے ہی ان کی ادبی شہرت کی بقا کے ضامن ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں ایک اچھے ادیب یا شاعر کے لئے ایک اچھا انسان ہونا ضروری ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ادب کی تاریخ اور دنیا کا تجربہ اور مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ بہت سے ادیب اور فن کار ایسے ہوتے ہیں جن کو عرف عام میں کسی حیثیت سے ایک "اچھا انسان" کہنا ممکن نہیں۔ لیکن سجاد حیدر کی ذات میں اچھے انسان اور اچھے ادیب کا ایک حسین سنگم تھا۔ تفصیل کا موقع نہیں لیکن مختصر یہ ہے کہ ان میں چاہنے اور چاہے جانے کی صلاحیت تھی جو قدرت کم لوگوں کو بخشتی ہے۔ ان میں ایک خاص خلوص اور گرم جوشی تھی جس کی تپش اجنبیت کو پگھلاتی اور تکلف کے پردے اُٹھا دیتی تھی۔ وہ ہونہار نوجوانوں، ادیبوں، شاعروں کی بہت ہمت افزائی کرتے تھے۔ جو ہر قابل کو ڈھونڈ کر نکالتے تھے اور اس کو بنانے اور سنوارنے میں دلچسپی لیتے تھے اور اس رشتے میں عمر یا افسری ماتحتی کا خیال کبھی پر نہ مار سکتا تھا۔ مجھے کئی ایسی مثالیں معلوم نہیں جہاں انہوں نے اس طرح کے نوجوانوں کے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔ ان کی گفتگو ایک طرف علم وادب

کے شوق کو اکساتی، ان کی نئی جہتوں میں دل چسپی پیدا کرتی اور دوسری طرف ایسی مخصوص ظرافت اور شوخی سے سننے والوں کے دل میں یہ کیفیت پیدا کرتی کہ "اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی"! بعض دفعہ اپنی دل چسپ یادداشتیں، اور تجربے مزے لے لے کر سناتے۔ ایک دفعہ سرکاری ملازمت کے دوران میں ان کا تقرر جزیرۂ انڈیمان کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے ہوا۔ اس جزیرہ میں، جیسا کہ سب جانتے ہیں، زیادہ تر وہ لوگ آباد تھے جن کو ان کے سنگین جرموں کی وجہ سے عمر قید کی سزا ملی تھی۔ یہاں یہ لوگ رہتے تھے یا ان کی اولاد، اور وہی نوکروں کا کام کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے دریافت کیا تو یہ معلوم کرکے دل چسپی ہوئی کہ جو شخص میرے باورچی کا کام کرتا ہے، وہ زہر خورانی کے جرم میں سزا یافتہ ہے اور میرا حجام گلا کاٹنے کا مجرم! مگر اس دل چسپ دریافت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ سجاد حیدر کی شرافت، انسانیت اور سیرت کی دل نوازی سے متاثر ہو کر ان کے یہ جرم پیشہ "مصاحب" بھی رام ہوتے ہوں گے!

میں نے اس مختصر سے ہدیۂ عقیدت میں ان کی زندگی کے حالات نہیں بیان کئے، ان کے ادبی کارناموں پر تبصرہ نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے لکھنے والے اس فرض کو مجھ سے زیادہ قابلیت اور خوبی کے ساتھ انجام دیں گے۔ میرا مقصد تو محض یہ ہے کہ ایک ایسی نسل کو، جس نے سجاد حیدر کو نہیں دیکھا۔ ان کی شخصیت کے آتش دان پر اپنے ہاتھ گرم نہیں کئے، ان کی سیرت کی سچائی سے براہ راست کسب فیض نہیں کیا، ایک خفیف سی جھلک دکھا دوں اس مرد شریف کی جس کی ذات میں محبت، خلوص اور گداز قلب کی شمع روشن تھی، ایک ایسی شمع جس کی اس زمانے میں قیمت بڑھتی جاتی ہے اور مانگ کم ہوتی جاتی ہے!

پر جو مسوری میں رہتے تھے بہ حیثیت پولیٹیکل افسر تعینات کر دیا۔ اس عرصہ میں سجاد قسطنطنیہ کی بھی سیر کر آئے تھے اور وہاں سے ایک ترکی برقعہ بھی ساتھ لائے تھے جو انہوں نے امانتاً میرے پاس رکھوا دیا تھا۔ ایک دن مسوری سے تار آیا کہ برقعہ فوراً پارسل کر دو۔ تھوڑے دن بعد معلوم ہوا کہ سجاد حیدر صاحب کی شادی ہو گئی۔ اس موقعہ پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کنوار گڈھ کے باشی جہاں پردے کے خلاف دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں اور آزاد عورت کی نئی دُنیا قائم کرنے کے خواب دیکھے جاتے تھے کیوں شادی کرتے ہی ایسے پردے کے حامی ہو گئے کہ برقعہ کی ضرورت ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اب سے پچاس برس پہلے کا زمانہ اور تھا۔ اس وقت عورتوں کی آزادی اور مغربی معاشرت کے متعلق ہمارے خیال کی پرواز ترکوں ہی تک ہو سکتی تھی۔ اور مغربی زندگی کا جو معیار سرسید احمد خاں نے اپنے پیشِ نظر رکھا تھا کہ ترکوں کی معاشرت کو اختیار کیا جائے وہی معیار ہم لوگوں کے پیشِ نظر تھا اور ٹرکی میں عورتیں اس زمانہ میں اس طرح بے حجابانہ یوریین نما نہ ہوئی تھیں جیسے آج کل ہیں بلکہ وہ ایک خاص قسم کا برقعہ پہنتی تھیں جس میں چہرہ کُھلا بھی رہتا تھا اور بہ وقتِ ضرورت اس پر نقاب بھی ڈال لی جاتی تھی۔ مگر وہ ہندی مسلمان مستورات کی طرح مقید نہ تھیں۔ چنانچہ سجاد حیدر صاحب نے جن کو ٹرکی کی ہر ایک چیز سے عشق تھا ترکوں کی پیروی شروع کر دی اور مرتے دم تک اس میں فرق نہ آنے دیا۔ چنانچہ جب ترکوں نے برقعہ بھی ترک کر دیا تو سجاد صاحب بھی ان سے پیچھے نہ رہے۔ ان کی خوش قسمتی سے ان کو جو رفیقۂ حیات ملیں وہ بھی نہ صرف اس نئی طرزِ زندگی کی اہل تھیں بلکہ ان کو اس کا عشق ہے۔ چنانچہ ان کے ناول اسی زندگی کے نقشے پیش کرتے ہیں۔

امیر یعقوب خان کے انتقال کے بعد سید سجاد حیدر صاحب پولیٹیکل سروس سے فارغ ہو گئے۔ حقیقت میں وہ ایسے نیک بندے تھے کہ وہ اس سروس کے قابل ہی نہ تھے۔ وہ ایسی ملازمت کے اہل تھے جس میں لکھنے پڑھنے کا کام تھا۔ چنانچہ وہ اس وقت راجہ صاحب محمود آباد کے جن کو بعد میں مہاراجہ کا خطاب مل گیا تھا سیکرٹری مقرر ہو گئے۔ اس کام کے لئے وہ خاص طور پر موزون تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہاراجہ صاحب مسلم لیگ کی سیاسیات میں خاص حصّہ لے رہے تھے اور جب ٹرکی جرمنوں کے جل کر لڑنے کی وجہ سے مسلمانانِ ہند برطانیہ سے بہت برافروختہ تھے اور مسلم لیگ کانگریسی مسٹر جناح کے زیرِ اثر کانگریس سے ہندوستان میں خود اختیاری سلطنت قائم کرنے کے سلسلے میں سمجھوتہ کر چکی تھی اور دونوں کی متفقہ تجاویز برطانوی حکومت کے پاس بھیجی جا چکی تھیں۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کا زمانہ تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ کا جلسہ کانگریس کے جلسے کے ساتھ ہوتا تھا اور مجھے یاد ہے کہ کلکتہ کے جلسے میں جبکہ شاید محمد علی اور شوکت علی جیل خانہ میں تھے، مہاتما گاندھی نہ صرف شریک ہوئے تھے بلکہ انہوں نے پہلی دفعہ اُردو میں تقریر کی تھی اور اس بات پر زور دیا تھا کہ تمام قومی مجالس میں تقریریں انگریزی کی بجائے اُردو میں ہوا کریں۔ مسلم لیگ اور کانگریس کا یہ اتحاد حکامِ وقت کی مصلحت کے خلاف تھا۔ چنانچہ جب بٹلر صاحب یو۔ پی کے گورنر ہوئے تو وہ چونکہ راجہ صاحب محمود آباد کے بہت عزیز اور بے تکلف دوست تھے انھوں نے راجہ صاحب پر زور ڈال کر ان کو سیاست سے علیحدہ کرا دیا۔ اور یو۔ پی گورنمنٹ کا ہوم ممبر کرا دیا اور مہاراجہ کا خطاب دلوا دیا۔ اس سے سجاد حیدر صاحب کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو گئے اور جب راجہ صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو سجاد صاحب کی ملازمت یونیورسٹی میں منتقل ہو گئی

اور وہ رجسٹرار مقرر ہوگئے ۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے خلاف جب رحمت اللہ کمیٹی نے رپورٹ لکھی اور یونیورسٹی کے انتظام میں تبدیلی ہوئی تو سجاد صاحب واپس اپنے عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر چلے گئے ۔ اور جب پنشن ہوئی تو انہوں نے دہرہ دون میں مستقل قیام شروع کر دیا، جہاں ایک دفعہ موجودہ راجہ صاحب محمود آباد تشریف لائے اور سجاد صاحب کو اپنا سیکرٹری مقرر کر کے اپنے ساتھ زبردستی لے گئے اور اسی ملازمت میں سجاد صاحب کے زندگی کے آخری لمحے تک گزرے ۔

بغداد پہنچنے کے بعد سجاد حیدر صاحب نے اپنا قلمی نام یلدرم رکھ لیا تھا یعنی جو مضمون بوجہ ملازمت وہ اپنے نام سے نہیں چھپوانا چاہتے تھے وہ یلدرم کے نام سے شائع ہوتا تھا ۔ یلدرم ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنی "برق" کے ہیں ۔ اس لفظ کے تلفظ کی آواز پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ یلدرم کے معنی گرج یا بادل کے گڑگڑانے کے ہوں گے نہ کہ محض برق کی چمک کے ۔ یہ خیال مجھے اس وقت آیا ۔ اس لئے سجاد صاحب سے میں نے اس کی تصدیق نہ کی ۔ اگر اس لفظ کے معنی گرج کے لئے جائیں تو "یلدرم" سجاد کے نام کے ساتھ ہرگز موزوں نہ تھا ۔ کیونکہ وہ خیالات کی بارش ضرور کرتے رہے مگر کبھی گرجے نہیں، اور جہاں تک مجھے علم ہے یلدرم انہوں نے اپنے اشعار یا نظموں میں بطور تخلص کے کبھی استعمال نہیں کیا ۔

سید سجاد حیدر صاحب ایک مشہور انشاء پرداز، جدت پسند شاعر اور دل کش قصہ نویس تھے ۔ ترکی ناولوں کا ترجمہ انہوں نے اس طرح کیا تھا کہ ان ناولوں کو بالکل اپنا لیا تھا اور اس طرح وہ ناول نویس کہلانے کے بھی حقدار ہو سکتے ہیں گو ان کی محترم رفیقۂ حیات بیگم نذر سجاد حیدر صاحبہ حقیقی معنوں میں ناول نویس ہیں اور اس معاملے میں اپنے قابل خاوند سے بازی لے گئی ہیں ۔ سید صاحب اگرچہ اسی معنی میں شاعر نہ تھے کہ وہ نہ صاحبِ دیوان تھے اور نہ پبلک مشاعروں میں کرائے بر مدعو کئے جاتے تھے ۔ لیکن اگر شاعر کے معنی میں وہ شخص ہے جو شعر کہتا ہو تو سجاد صاحب ضرور شاعر تھے ۔ بہ حیثیت انشاء پرداز کے انھوں نے ایک خاص طرزِ تحریر کی بنیاد ڈالی تھی جس سے اردو زبان میں نئے الفاظ انھوں نے ترکی زبان سے لئے ترکوں نے بہت سے محاوروں، اصطلاحوں اور الفاظ کو جو یورپین زبانوں مثل فرانسیسی یا انگریزی میں مستعمل ہیں اپنی زبان میں عربی یا فارسی کی مدد سے لے لیا تھا ۔ سجاد صاحب نے ان کو اردو سے روشناس کرا دیا ۔ ان کی یہ نئی طرز تحریر اس زمانے میں بہت مقبول ہوئی، کیونکہ اس وقت تک زبان میں عربی فارسی کے لفظ کاٹ کر اس کی قوت اور جاذبیت کو کم کرنے کا خبط اہلِ قلم کو نہیں ہوا تھا ۔ بہت سے اہلِ قلم نے اس طرز کا تتبع کیا جس میں سلطان حیدر جوش خاص کر قابلِ ذکر ہیں ۔ سید صاحب موصوف کے مضامین ہمیشہ اپنے رنگ میں نئے اور خیال میں اچھوتے ہوتے تھے اور یہ ان کی ایسی خصوصیت ہے جو بعض ان سے زیادہ مشہور مضمون نگاروں میں کم پائی جاتی ہے ۔ وہ غیر زبان کے الفاظ محض خانہ پری یا رنگینیٔ عبارت کے خیال سے استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ صرف اس وقت استعمال کرتے تھے جب وہ خیال کو دوسرے الفاظ کے ذریعہ ادا نہ کر سکتے تھے سجاد صاحب عام طور پر سنجیدگی اور متانت کے بادلوں میں چھپے رہتے تھے لیکن ان کے یلدرم والے مضامین ایک بجلی کی چمک کی طرح کبھی کبھی ان کے جوانی کے ان جذبات کو تھوڑی دیر کے لئے روشنی میں لے آتے تھے جو ان کی طبیعت کے منافی تھے

چنانچہ جب ان کا مضمون "وہ آنکھیں" شائع ہوا تو حلقۂ احباب میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں اور قاری سرفراز حسین صاحب مرحوم مصنف "شاہدِ رعنا" وغیرہم نے "تُو نے مجھے دیکھا کیوں" کے عنوان سے جوابی مضمون شائع کر دیا اور کچھ دنوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ پہلے "خیالستان" کے نام سے شائع ہوا جو ایک زمانے میں پنجاب یونیورسٹی میں ایف اے کے کورس میں بھی تھا۔ دوسرا مجموعہ بعد میں "حکایات و احتساسات" کے نام سے چھپا۔ انھوں نے ہم ہندوستانیوں کو ترکوں کی معاشرتی زندگی سے پہلی دفعہ ترکی ناولوں اور ڈراموں کو اردو میں ترجمہ کر کے ہم سے آشنا کرایا۔ ان سے قبل محمد حسین صاحب رام پوری نے دو ترکی ناول ترجمہ کئے تھے مگر وہ انھوں نے انگریزی کی معرفت لئے تھے۔ براہِ راست ترکی سے ترجمہ نہیں کئے گئے تھے۔ سجاد صاحب نے یوں طالب علمی کے زمانے میں "ثالث بالخیر"، "زہرا" اور "مطلوب حسینان"، تین چھوٹے چھوٹے ترکی ناول ترکی سے ترجمہ کئے تھے۔ لیکن اس وقت تک ترکی سے ترجمہ کرنے کی زیادہ مہارت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ کئی دفعہ قسطنطنیہ گئے اور انھوں نے اپنا مطالعہ جاری رکھا، حتیٰ کہ پھر کئی بڑے بڑے افسانے، ڈرامے اور ناول ترکی زبان سے ترجمہ کئے۔ پہلے "ہما خانم"، "پرانا خواب"، "آسیبِ الفت" ترجمہ کئے اور بعد میں "جنگ و جدل" اور "جلال الدین خوارزم شاہ" چھپوائے۔ اور حال ہی میں انتقال سے قبل "طارق" اور "ابنِ موسیٰ" دو ترکی ڈرامے ترجمہ کر ڈالے جو ابھی شائع نہیں ہوئے ہیں۔ ان کی تصانیف پر تبصرہ کرنا اس وقت میرا مقصد نہیں ہے۔ میں ان کی ایک خصوصیت کا ذکر ضرور کروں گا اور وہ یہ ہے کہ ان کے مضامین یا افسانوں میں آپ کو مصنف کی ذاتی زندگی کا ذرا سا حال بھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ ان کی قوتِ تخیل ایسی قوی تھی اور جدتِ طبع کا یہ زور تھا کہ ان کو اپنے ذاتی ماحول کو کام میں لانے کی ضرورت نہ پڑتی تھی، اور اگر وہ کام میں لاتے بھی ہوں گے تو اس خوبی سے کہ جو تصویریں وہ ہمارے سامنے پیش کرتے تھے وہ ان کے تصور کا نتیجہ معلوم ہوتی تھیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کو اپنی پبلک یا سرکاری زندگی سے بالکل علیحدہ رکھا۔ وہ کچہری اور دفتر میں عہدے دار اور مضامین و افسانوں میں وہ ہمیشہ سجاد حیدر رہے۔ وہ طبعاً سنجیدہ تھے مگر رعونت ان کے پاس نہ پھٹکتی تھی۔ ان کی زندگی نامور حضرات کی زندگی سے بہ حیثیت سیکرٹری وابستہ رہی۔ ان کی تحریریں بارہا کرسیٔ صدارت سے نشر کی گئیں اور اخبارات میں تعریف کے ساتھ شائع ہوئیں مگر بڑے بڑے قومی جلسوں میں جب جنابِ صدر اپنی تقریر پڑھتے تھے تو کسی کو کانوں کان یہ نہ معلوم ہوا کہ اس تصنیف کا مصنف یہ ایک نحیف الجثہ شخص ہے جو گمنام شخص کی طرح اس مجلس کے ایک کونے میں بیٹھا اس طرح ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے گویا اس تقریر سے اس کا کچھ واسطہ ہی نہیں۔ اپنے آپ کو گمنامی میں رکھنا، "بڑا آدمی" کہلانے سے بھاگنا۔ "بڑے آدمیوں" کی صحبت چھوڑ کر بے تکلف گمنام دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا اور ان کے ساتھ خوش طبعی میں خاموشی سے حصہ لینا۔۔۔ سید سجاد حیدر صاحب کی ایسی خصوصیت تھی جو بہت کم انسانوں میں دیکھنے میں آئی ہے۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی (مرحوم)

سجّاد حیدر یلدرم

۱۲ر اپریل ۱۹۴۳ء کی رات کو سیّد سجّاد حیدر مرحوم نے، جو ادب کی دُنیا میں یلدرم کے نام سے مشہور تھے، قلب کے عارضہ سے دفعتہً وفات پائی۔ یہ علی گڈھ کالج کے پُرانے تعلیم یافتوں میں اور اسی تعلق سے کالج کے ان چند طالب علموں میں تھے جنھوں نے مولانا شبلی مرحوم کے درس اور صحبت سے شعر و ادب کا ذوق حاصل کیا تھا۔ مرحوم مولانا کے درس کے اس قسم کے واقعات کو مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔

ہماری زبان میں اس وقت ادبِ لطیف کا جو رواج ہے اس کے پُرانے لکھنے والوں میں سب سے پہلا نام سیّد سجّاد حیدر مرحوم کا ہے، اور چونکہ قادرِ مطلق کو ان سے یہ کام لینا تھا، اس لئے ان کی زندگی میں اس کا مناسب سامان پیدا کر دیا تھا یعنی یہ کہ کالج سے نکلنے کے ساتھ ان کو ترکی پڑھنے کا خیال ہوا۔ علی گڈھ میں نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب رئیس علیگڈھ کے والد بزرگوار ہجرت کر کے مکۂ معظمہ چلے گئے تھے۔ وہیں نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس زمانہ میں ترکی وہاں کی سرکاری زبان تھی، اس لئے ان کو ترکی بھی پڑھائی گئی۔ اور جب ہندوستان آئے تو وہ ترکی ادب کے گویا نمایندے ہو کر آئے۔ چنانچہ سر سیّد کے "تماشائے عبرت" میں وہ اسی ہیئت سے اسٹیج پر آئے ہیں اور معارف علی گڈھ میں جس کے وہ شریک اڈیٹر تھے، وہی ترکی ادب کی اشاعت کا ذریعہ بنے۔

بہر حال سجّاد حیدر مرحوم نے ان ہی سے ترکی زبان سیکھی۔ اور اس کا یہ فائدہ ان کو پہنچا کہ سرکار انگریزی نے ان کو ترکی سفارت خانہ میں لے لیا اور عراق میں ان کا تقرر ہو گیا۔ یہ ۱۹۰۰ء کے پس و پیش کا واقعہ ہے۔ جدید ترکی ادب پر فرانسیسی

ادب کے بے حد اثرات تھے۔ مرحوم نے ترکی ادب کے ان ہی اثرات کو قبول کیا اور ان کو اُردو ادب میں منتقل کیا، اسی زمانے میں ۱۹۰۱ء سے مخزن لاہور نے جنم لیا تھا۔ مرحوم نے ترکی ادب کا یہ تحفہ عراق سے ہندوستان کو بھیجا اور مخزن کے خوانِ ادب میں یہ شہر بہ شہر ہاتھوں ہاتھ بٹا۔ اس کے بعد بھی ترکی کا سفر انھوں نے خود کئی دفعہ کیا اور ترکی ادبیات و رسائل ان کے پاس آیا کرتے تھے۔

ان مضمونوں میں وہ شاید سرکاری ملازم ہونے کے سبب سے اپنے نام کے بجائے یلدرم لکھا کرتے تھے جو مشہور ترکی سلطان بایزید کا لقب تھا۔ جس کے معنی بجلی کے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے دشمنوں کی بے خبری میں ان کے سروں پر اس تیزی سے آکر گرتا تھا کہ لوگ اس کو یلدرم کہتے تھے۔

بہرحال سجاد حیدر یلدرم ہماری زبان میں ایک نئی صنف ادب کے بانی تھے اور اس لئے ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ایک پایہ ہے۔ وہ کئی ادبی افسانوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ وہ بڑے متواضع، مرنج و مرنجان، ہنس مکھ، ملنسار، شگفتہ دل، بذلہ سنج، اور شریف و نرم طبع تھے۔ ان کے دوستوں کو ان کی یاد بہت آئے گی۔ ان کی وفات کا حادثہ لکھنؤ میں پیش آیا اور وہیں کی خاک کے سپرد ہوئے۔ اللہ تعالےٰ ان کی قبر پر اپنے فیضِ کرم کے چھینٹے برسائے!

شوکت تھانوی

سجّاد حیدر یلدرم

بچپن سے سیّد سجّاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد حیدر صاحبہ کے نام سُنتے چلے آئے تھے۔ مضامین اور افسانے برابر پڑھے تھے۔ مگر ملاقات ہوئی لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر۔ یوں دیکھ چکے تھے علی گڑھ میں بھی۔

دُبلے پتلے، دھان پان، ترکی ٹوپی پہنے ہوئے، گویا مہاتما گاندھی۔ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ مگر اب تک شرمیلی طبیعت ہے۔ اپنی ادبی خدمات کا شاید احساس ہی نہیں۔ غرور تو دوسری چیز ہے۔ اپنے سامنے کے ادبی بچوّں کا بھی اس انداز سے احترام کرتے ہیں، گویا آپ خود تو کچھ ہیں ہی نہیں، جو کچھ ہیں یہ نئی پود کے برخورداران ادب ہیں۔

مختصر افسانہ نگاری کے باوا آدموں میں سے سجاد حیدر بھی ایک ہیں۔ ایک زمانہ میں آپ کی نظمیں بھی پڑھی تھیں۔ مزاحیہ بھی اور سنجیدہ بھی مگر اب طرح سے کچھ نہیں کہتے۔ افسانے لکھنے بھی بہت کم کر دیئے ہیں۔ گویا ادب سے بھی متنفر ہو کر بیٹھ رہے ہیں۔

مَیں یہ سطریں لکھ ہی چکا تھا کہ سجّاد حیدر یلدرم کے سفرِ آخرت کی خبر بھی سُن لی۔ افسانہ نگار خود افسانہ بن کر رہ گیا!
اِنّا لِلّٰہِ و اِنّآ اِلیہِ راجعون۔

سرسید رضا علی (مرحوم)

سجّاد حیدر یلدرم مرحوم

سجاد حیدر کی قبر پر عقیدت اور محبت کے دو پھول رضا علی کی طرف سے ؎

مونس ہے بعد مرگ کسی کا جہاں میں کون
دو پھول بھی لحد پہ کوئی دھر نہ جائے گا

سرسید احمد خاں علیہ الرحمتہ کی اس اصلاحی تحریک کو جس نے ۱۸۷۵ء میں شہر کویل میں درس گاہ کی صورت اختیار کی میں اپنے نزدیک سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کے بعد مسلمانان ہند کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں۔ علی گڈھ کی زندگی کا پہلا دَور ۱۸۷۵ء میں شروع ہو کر ۱۸۹۵ء میں ختم ہوا۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے دَور کا آخری سال 1915ء اور ۱۹۲۵ء کو سمجھنا چاہیئے۔ چوتھا دَور نصف کے قریب گزر چکا ہے۔ قرینہ یہ ہے کہ ۱۹۵۵ء تک کم و بیش صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ ہمارے ملک میں تعلیم کو سیاست سے کیا مناسبت ہے اور اگر کسی خدا کے بندے کو علی گڑھ کی سچی تاریخ لکھنے کی توفیق اس وقت بن پڑی تو معلوم ہو جائے گا کہ تنہا تعلیم کے دائرہ میں ہی نہیں بلکہ طلب حق، خداشناسی اور خدا پرستی، عالی حوصلگی اور رواداری کے بے آب و گیاہ لق و دق بیابانوں۔ معاشرتی اصلاح کی نظر فریب وادیوں اور سیاسی مسلک کے طلسمی کارخانوں میں جو منزلیں علی گڈھ نے طے کی ہیں ان سے وہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں یا ان کے پورے ہونے کی امید ہو سکتی ہے جو سرسید احمد خان مرحوم اور ان کے رفیقوں نے تحریک علی گڈھ کو عملی جامہ پہناتے وقت قائم کی تھیں۔

سجاد حیدر کی موت اس دردناک حقیقت کو یاد دلاتی ہے کہ علی گڈھ میں علمی مذاق کی قدر کبھی نہیں ہوئی۔ ادبی مذاق پیدا کرنے یا طلباء کا علمی ذوق بڑھانے یا ان کی ہمت بندھانے کا خیال علی گڈھ کے پہلے دَور میں بھی نہ اساتذہ کو تھا نہ ٹرسٹیوں کو۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم دَورِ اوّل کے بہترین علمی اور ادبی مذاق رکھنے والے طالب علم تھے۔ ہم عصران دونوں صاحبوں کی بڑی قدر کرتے تھے مگر کالج کے ارباب حل و عقد کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکتے ہی رہے۔ دوسرے دَور کے طلبا میں سجّاد حیدر کا مرتبہ بہ لحاظ علمی قابلیت کے بہت بلند تھا، اردو اور انگریزی بہت اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ انشاء پردازی کی سنہری لڑیوں میں موقع محل سے ہمیشہ لطافت اور بذلہ سنجی کے موتی پروتے تھے۔ مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ہماری قومی زندگی میں جن نئے خیالات کو مفید سمجھتے تھے ان کی زبردست تائید تحریر اور تقریر کے ذریعے سے کرتے تھے۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ دوسروں کی بات سننے اور اس پر عمل کرنے کے لئے ہمیشہ

تیار رہتے تھے۔ بڑے خوش خلق اور سادہ مزاج تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے زبردست حامی تھے، کھیل کود سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے، جس کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسٹر بیک کے چہیتے طلبا، سب کھلاڑی تھے جن کو علمی مذاق سے کچھ سروکار نہ تھا۔ کھیل کود کے ذریعے سے جسم کی تربیت نہایت ضروری چیز ہے لیکن کھیل کود ذریعہ ہے ایک مقصد حاصل کرنے کا۔ اصلی مقصد دماغ کا صحیح نشوونما اور اس کی تربیت اور صحت کو اچھی حالت میں رکھنا ہے جس کے حاصل کرنے کا کھیل کود، ورزش، کسرت ایک ذریعہ ہے۔ اصل مقصد کو چھوڑ کر ذریعہ کو بجائے خود مقصد بنا لینا بالکل غلط طریقہ ہے۔ مگر یہ طریقہ میرے زمانہ میں علی گڈھ کی مقدس روایات میں داخل تھا۔ مسٹر بیک کی زبردست شخصیت نے اس مذموم طریقہ کے پھیلاؤ کو یہاں تک پہنچا دیا کہ اس زمانہ میں ذوقِ ادب اور کھیل کود کی قدر و قیمت کا اپنی اپنی جگہ جایزہ لینے کے مبحث پر مولانا شوکت علی مرحوم نے لاہور کے اسلامی اخبار "پنجاب آبزرور" میں جو انگریزی میں نکلتا تھا ایک مضمون لکھا تو بجائے نام لکھنے کے اپنا ادبی لقب بڑے فخر سے "مُسٹنڈا حبشی" مضمون کے آخر میں درج کیا۔ کھلاڑی طلبا کی اس بے جا قدر و منزلت کا یہ نتیجہ ہوا کہ علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے طالب علموں کی بے تعلقی کھیل کود، ورزش اور کسرت سے بڑھتی گئی۔ اور رفتہ رفتہ وہ کرکٹ کی گیند کو ہاتھ لگانا یا فٹ بال کو پابوسی کا موقع دینا اپنے لئے باعثِ توہین سمجھنے لگے۔ صدیوں کی تعلیم و تربیت نے مغربی ممالک میں ان قابلیتوں کی تربیت کی حدود مقرر کر دی ہیں۔ جن کا تعلق جسمانی اور دماغی نشوونما سے ہے۔ ہمارے ملک نے اس معاملہ میں ابھی کافی تجربہ حاصل نہیں کیا ہے اور میری ناچیز رائے میں نہایت ضروری ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد دماغ کو دماغ اور جسم کو جسم سمجھیں اور اس پالیسی کو نہ دہرائیں جس نے اب سے چالیس پچاس برس پہلے طلبا کے ذوقِ علم و ادب پر کرکٹ کے نیٹ کا پردہ ڈال رکھا تھا۔

میری پہلی ملاقات سجاد حیدر یلدرم مرحوم سے جولائی ۱۸۹۸ء میں ہوئی تھی۔ محمد حیات خان، مشتاق احمد زاہدی اور حیدر حسن مرحوم بھی اس زمانے کے علمی ذوق رکھنے والے طلبا میں سے تھے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مشتاق احمد نے علی گڈھ چھوڑ دیا مگر دوستوں سے ملنے کے لئے اکثر علی گڈھ آتے تھے۔ یہ سب حضرات علی گڈھ کی زندگی کے گہرے نقاد تھے۔ علی گڈھ میں اس وقت تک کوئی ایسا انتظام نہ تھا کہ اگر کوئی ہونہار طالب علم کسی خاص مضمون میں کمزور ہوتا تو اس کمزور مضمون کی طرف اساتذہ خاص توجہ کرتے۔ سجاد حیدر مرحوم ریاضی سے گھبراتے تھے اور اسی وجہ سے ایف۔ اے کے امتحان میں دُرِ مقصود کی تلاش میں ایک سے زیادہ مرتبہ غوطے لگانے پڑے۔ میرے نزدیک ایسے ہونہار طالب علموں کو جنھیں کسی خاص درسی مضمون سے مناسبت نہ ہو ان کے حال پر چھوڑ دینا بڑی غلطی ہے۔ اسلامی درسگاہوں اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی کا اہم فرض ہے کہ ہونہار طالب علموں کی تعلیم کا اس مضمون میں جس سے انھیں خاص مناسبت نہ ہو مناسب انتظام کرے تاکہ ان کی عمر کے ایک یا دو عزیز سال رایگاں نہ جائیں۔

سر سید احمد خاں علیہ الرحمتہ کے اکثر دوست نہ صرف روشن خیال اور ضرورت زمانہ کے پہچاننے والے تھے بلکہ علم و فضل میں بھی ان کا درجہ بلند تھا، نواب حاجی اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی سید صاحب کے بڑے مخلص دوست تھے۔

نواب صاحب عربی اور فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے - اُردو کے بہت اچھے ادیب اور صاحبِ تصنیف تھے - ان کو پولٹیکل معاملات سے بھی گہری دلچسپی تھی اور تین سال تک بذریعۂ نامزدگی ہمارے صوبہ کی کونسل کے ممبر رہ چکے تھے - ۱۸۹۲ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی بہ موجب میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ صوبہ کی کونسل میں بعض جگہوں کو بذریعۂ انتخاب پُر کرسکیں - مگر رائے دہندوں کا جو اکثر ہندو تھے کسی مسلمان کو منتخب کرنا ایسا ہی بعید از فہم تھا جیسا مسٹر چرچل یا مسٹر ایمری کا کسی ہندوستانی کو صوبہ کا گورنر مقرر کرنا یا پولینڈ والوں کا روس کی انصاف پسندی اور راست بازی کی داد دینا یا جاپانیوں کا دُنیا کو یہ یقین دلانا کہ وہ چین کے سچے دوست ہیں اور چین کو مضبوط بنانے اور اہلِ یورپ سے اس کا پنڈ چھڑانے کے لئے بادلِ ناخواستہ چین سے جنگ کر رہے ہیں - نواب اسمٰعیل خان صاحب اس زمانہ میں علی گڈھ سے ایک ماہانہ رسالہ نکالتے تھے جس کا نام معارف تھا - ملک کے مشہور ادیب اس رسالے میں مضامین لکھتے تھے - ان کا معیار بھی بہت بلند ہوتا تھا - سجاد حیدر مرحوم نواب صاحب کے سیکرٹری تھے اور رسالۂ معارف کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم - مولوی صاحب اور مولانا محمد علی نے سب سے پہلے اردو دان اخبار بین حضرات کو سیاسی مسائل کے سادہ دسترخوان پر ادب کی چاشنی سے لذت آشنا کیا سجاد حیدر معارف میں خود بھی مضمون لکھتے تھے اور معارف کے لئے انگریزی رسالوں کے اعلیٰ مضامین کا اُردو میں ترجمہ بھی کرتے تھے - مرحوم اس خدمت پر کئی سال تک مامور رہے - مغربی ممالک کا موجودہ نظریہ تو یہ ہے کہ ہر ذہین اور طباع آدمی جس کام پر توجہ کرے اس میں پوری مہارت حاصل کرسکتا ہے - ممکن ہے یہ نظریہ تمام تر صحیح ہو یا تمام تر غلط لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بعض طبیعتوں میں کام کرنے کی فطری قابلیت موجود ہوتی ہے - سجاد حیدر کی طبیعت کا رجحان علم و ادب کی طرف تھا - لیکن آج سے چالیس برس پہلے ہندوستانی اس قابل نہیں سمجھے جاتے تھے کہ کوئی یونیورسٹی انھیں فارسی عربی یا سنسکرت یا ریاضی کی تعلیم دینے کے سوا کسی اور مضمون کے پڑھانے کی خدمت ان کی سپرد کرسکے - کالجوں میں ریاضی پڑھانے کی خدمت ہندوستانیوں کی سپرد اس لئے ہونے لگی تھی کہ بنگالیوں نے ثابت کردیا تھا کہ ریاضی پڑھانے کی قابلیت ان میں انگریزوں سے کم نہیں ہے - پی - گھوش کی ارتھمیٹک (علم حساب کی کتاب) اس زمانے کی مشہور تصنیف تھی - بابو جاذب چندر چکرورتی نے بھی جو علی گڈھ میں ریاضی کے پروفیسر تھے، ایک بہت اچھی ارتھمیٹک لکھی تھی جو ہمارے صوبہ کی اکثر درسگاہوں میں بجائے پی - گھوش کی کتاب کے استعمال کی جاتی تھی - لیکن ہمارا صوبہ تعلیم کے معاملہ میں اس قدر پھسڈی تھا کہ انگریزی ادب کے علاوہ بھی اکثر و بیشتر مضامین کے پروفیسر انگریز ہوتے تھے - میری ناچیز رائے میں اگر سجاد حیدر مرحوم بی - اے پاس کرنے کے بعد علی گڈھ کالج میں انگریزی زبان کے جونیر لیکچرر مقرر کر دئے جاتے تو انگریزی ادب کی دُنیا میں کافی شہرت حاصل کرنے کا موقع ان کو مل جاتا - اردو غریب اس زمانہ میں اس قابل نہ سمجھی جاتی تھی کہ کسی یونیورسٹی یا کالج کے احاطہ میں اسے باریابی کا شرف حاصل ہوسکے - سجاد مرحوم کے سپرد اگر فارسی پڑھانے کی خدمت کردی جاتی تو لکیر کے فقیر ہونے کی بجائے ان کی جدت پسند طبیعت بیسویں صدی عیسوی کے ایرانی چمن کے

گُل بُوٹے اہلِ وطن کے سامنے اس خوبی سے پیش کر سکتی کہ فارسی زبان و ادب کے خوش نما تختے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں نئی اُمنگیں پیدا کرتے۔ نواب اسمٰعیل خان اور ان کے علم دوست اصحاب کی صحبت اور رسالۂ معارف سے عملاً مسب ایڈیٹری کا تعلق ہونے کے باعث سجاد حیدر مرحوم کو بہت فائدہ ہُوا۔ یہ افسوس ضرور ہے کہ سرکاری ملازمت کی قیود و شرائط کے باعث مرحوم کی طبیعت کے جوہر پُورے طور پر نہ کھلنے پائے۔ بھلا غور کیجئے جب سجاد جیسے آزاد منش اور شگفتہ مزاج آدمی کو چھ سات گھنٹے روزانہ کچہری میں بیٹھ کر مال کے مقدمات میں کھتونی اور خسرہ کے اندراجات پٹواری کے اس بیان سے مطابق کرنا پڑے جو اندراجاتِ مذکورہ کے بالکل متضاد ہو اور جب بہ حیثیت مجسٹریٹ ضربِ شدید کے مقدمہ میں ملزم کے ایک درجن معزز گواہانِ صفائی کی شہادت قلمبند کرنا پڑے کہ جس وقت مار پیٹ کا ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ ٹھیک اس وقت ملزم کسی شادی میں شریک یا دعوتِ کھا میں موجود تھا تو طبیعت کی شگفتگی کیا خاک قائم رہ سکتی ہے سجاد حیدر نے بہت سے تجربے حاصل کیے۔ ممالک متوسط کے ایک بڑے رئیس کے اتالیق رہے۔ سردار یعقوب خان صاحب کے عرصہ تک اسسٹنٹ پولیٹیکل آفیسر اور پولٹیکل آفیسر رہے۔ سر محمد علی محمد خان مرحوم مہاراجہ محمود آباد کے پرائیویٹ سکرٹری کی خدمات انجام دیں۔ ڈپٹی کلکٹر رہے۔ بہت ممکن ہے کہ مہتم خزانہ کے وہ فرائض بھی انجام دیئے ہوں جو دو برس کے عرصہ میں آدمی کو انسان سے مشین بنا ڈالتے ہیں۔ سیر و سیاحت کی علمی و ادبی شغف جاری رکھا۔ پنشن لی اور پھر محمود آباد پہنچ گئے۔ جب زندگی میں اتنے مرحلے پیش آئیں اور دُنیا کے جھگڑے چین نہ لینے دیں تو بڑے سے بڑے ہنسوڑ آدمی کی طبیعت بھی مرجھا جائے گی۔

سجاد حیدر رسوم و قیود کے پابند نہ تھے بلکہ وہ ایسے رسم و رواج کی اصلاح کرنا چاہتے تھے جس سے سوسائٹی کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ شادی کے معاملہ میں انھوں نے بڑی ہمتِ مردانہ سے کام لیا اور ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون سے جو ایک شیعہ خاندان میں پیدا ہوئیں اور خود بھی شیعہ ہیں شادی کی۔ بنت نذر الباقر صاحبہ (بیگم سجاد حیدر) مراد آباد کے ایک معزز سیّد خاندان کی بیٹی ہیں۔ ان کے والد نے ان کو بہت اچھی تعلیم دلائی اور آج سے تیس برس پہلے وہ نسوانی اصلاحی تحریک کی صفِ اوّل کی ممتاز کام کرنے والیوں میں تھیں۔ رواداری عجیب نعمت ہے۔ سجّاد حیدر سُنّی تھے اور بی بی شیعہ مگر دونوں نہایت خوش و خرّم اور فرقہ دارانہ اختلاف کی پراگندگی سے محفوظ و مامون رہے۔ سجّاد حیدر اور بیگم سجاد نے اپنی اولاد کو بھی جو نہایت سعید ہے بہت اچھی تعلیم دلائی۔ یلدرم نہٹور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد پولیس کے انسپکٹر اور بہ آخر زمانہ میں بنارس کے کوتوال تھے۔ اس زمانہ میں لکھنؤ، بنارس، الہ آباد، آگرہ، بریلی اور میرٹھ کی کوتوالی محکمۂ پولیس میں سب سے بڑا عہدہ تھا جو ہندوستانیوں کو مل سکتا تھا۔ یلدرم کے دو چھوٹے بھائی ہیں، ان دونوں نے بھی علی گڈھ میں تعلیم پائی۔ نصیر الدین حیدر علی گڈھ میں میرے ہم جماعت تھے۔ ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لینے کے بعد اب تین چار سال سے ریاست ٹونک میں ریونیو منسٹر (وزیر مال) ہیں۔ خان بہادر ڈاکٹر حیدر الدین حیدر سول سرجن تھے وہ بھی اب غالباً پنشن لے چکے ہیں۔

مرحوم کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ یوں تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ کم و بیش زندگی بھر قائم رہا مگر طالب علمی کے زمانے میں جو نظمیں اور مضامین انھوں نے لکھے ہیں وہ بڑے پُر لطف ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرحوم کو زمانہ چین سے بیٹھنے دیتا تو وہ ملک و قوم کی عظیم الشان ادبی خدمت انجام دیتے۔ مرزا پھویا چھوٹی سی نظم ہے جو سجاد نے ۱۹۰۰ء میں لکھی۔ مرحوم نے اس نظم میں ایک سچی کہانی بیان کی ہے۔ کہانی یہ ہے کہ سر سید احمد خان کی وفات کے بعد علی گڈھ کالج کی امداد کے لئے سر سید میموریل فنڈ قائم کیا گیا۔ محسن الملک نے ملک کا دورہ کیا اور بہت سے شہروں میں جلسے کرکے تقریریں کیں اور تقریروں میں بتایا کہ قوم کا فرض ہے کہ اپنے کالج کی مالی امداد کرے اور مسلمان لڑکوں کو تعلیم کے لئے علی گڈھ بھیجے۔ مرزا پھویا لکھنؤ کے ایک تعلقدار کے اکلوتے بیٹے تھے۔ مرزا کی عمر بیس سال کی تھی۔ بڑے ناز و نعمت سے پلے تھے اور گھر سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ محسن الملک کی سحر بیانی کا یہ اثر ہوا کہ مرزا کے باپ نے مرزا کو علی گڈھ بھیجنے کا تہیہ کرلیا۔ یہاں نظم کے کچھ شعر سنیئے ؎ :۔

اس ارادہ کو جب کہا گھر میں
پڑ گیا رونا پیٹنا گھر میں
چیخی مرزا کی ماں کہ ہائے ملئے
کوئی جا کر ذرا اُنھیں سمجھائے
میرا بچّہ نہ جائے گا کوئل
میرا پتھر کا تو نہیں ہے دل

باپ نے ایک نہ سُنی اور مرزا کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ وداعی منظر ملاحظہ کیجئے ؎

خالہ ماں، ممانی، بھابی جان
اپنے مرزا پہ سب ہوئیں قربان
آپا جانی نے بھی بلائیں لیں،
سب نے مل مل کے یوں دعائیں دیں
یا الٰہی یہ خیریت سے پھرے
اور دشمن پہ اس کی بجلی گرے
واسطہ مرتضیٰ علی کا تجھے!
جلد لا کر ملائیو ہم سے!

مرزا علی گڈھ پہنچے۔ نئی دُنیا نظر آئی، ہکّا بکّا ہیں، کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ ہفتہ بھر تک علی گڈھ کے طور طریق دیکھے، اس کے بعد قبلہ و کعبہ کی خدمت میں عریضہ لکھا۔ اب علی گڈھ کے حالات مرزا کی زبان سے سُنیئے :۔ ؎

یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جُدا
ایسا دیکھا کبھی، کبھی نہ سُنا
جنس ہر اک نئی دکان نئی،
اور تو اور ہے زبان نئی!
ایک دال ایک گوشت کہتے ہیں
جانیں کس دیس میں یہ رہتے ہیں
ہوں پریشان تو آپا فرمائیں!
خوش ہوں گر تو ہیر ہیر بہ سُنائیں
گر ہوا اچھا لباس ٹھاٹ کہیں
اور گنواروں کو راج گھاٹ کہیں!
جو تنعّم کی ہو ذرا سی بھی،
اس کو کہتے ہیں یاں یہ عیاشی
عمدہ کھانا کھلانا عیاشی
عمدہ شربت پلانا عیاشی!

علی گڈھ کی منظّم زندگی کی تصویر لکھنؤ کے رئیس زادے کی عینک لگا کر دیکھیے ؎

صبح تڑکے ڈرل کراتے ہیں — ایسے بے رحم ہیں تھکاتے ہیں
حکم ہے وقت ہی پہ کھانا کھاؤ — شام کو ایک جگہ جمع ہو جاؤ
بھوک ہو یا نہ ہو نہیں پروا — ہے اُسی وقت ٹھونسنا پڑتا!

طلباء کو بغیر اجازت حاصل کئے شہر جانے کی ممانعت تھی مرزا اس کی شکایت کرتے ہیں ؎

یاں کی آزادی ہے بہت محدود — شہر جانا بھی ہو گیا مسدود
اس لئے عرض ہے کہ یہ چیزیں — لکھنؤ سے روانہ آپ کریں
ایک ڈبیہ دیا سلائی کی — پڑیہ اک نیلی روشنائی کی
اک برش جوتہ صاف کرنے کا — اور برال کو بھی ساتھ تھوڑا سا
بوٹ کے لیس کی ضرورت ہے — اور موزے بھی چند اچھے سے
دو گھڑے اک صراحی پیالے چار — اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار
اور باقی تو خیریت ہے سب — سب کو تسلیم زیادہ حد ادب

ممکن ہے کہ زبان پر دلی اور لکھنؤ کے ناقدانِ سخن اعتراض کریں لیکن دو باتیں ملحوظِ خاطر رہیں - ایک تو یہ کہ یہ کلام سج
کے لڑکپن کا ہے - دوسرے یہ کہ جس زبان میں یہ نظم لکھی گئی ہے اس کا تعلق دلی اور لکھنؤ سے ہو یا نہ ہو - مگر یہ
زبان ہے جو اب سے چالیس پینتالیس برس پہلے علی گڈھ کالج کی ٹکسالی زبان تھی - میں نے قصداً بعض ایسے شعر منتخب
ہیں جن میں علی گڈھ کے مخصوص محاورے زبانِ حال سے بتلا رہے ہیں کہ ہم نہ دلی کے مُرید ہیں نہ لکھنؤ کے چیلے - ہم
اس وسیع اور تر و تازہ چمنِ اردو کے نئے پودوں کے رنگین پھول ہیں جو سرزمینِ کومِل پر اُگے تھے - یہ رنگ و بُو آپ کہیں
نہ پائیے گا - ان پھولوں کو دیکھنے اور خوشبو سونگھنے کے لئے آپکو کویل ہی آنا پڑے گا - رسالہ مخزن میں جو مضامین یلدرم
لکھے تھے وہ بھی زبان کی خوبی اور خیالات کی جدت کے لحاظ سے بڑے پُر لطف تھے اور آج بھی ہمارے نوجوان ان کے
مطالعہ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں -

یلدرم مرحوم ترک قوم اور ترکی زبان کے بڑے دالہ و شیفتہ تھے - ترکی زبان علی گڈھ میں ہی پڑھنا شروع کر دی
ترکی اخبارات بھی منگاتے تھے اور ترکی زبان کی جب کوئی مخصوص طرزِ ادا پسند آتی تھی تو بہت خوش ہوتے تھے اور دوستوں
اس کا تذکرہ کرتے تھے - میں ترکی زبان سے ناواقف ہوں اس لئے ترکی زبان کی وسعت اور دل آویزی کے بارے میں میرا کچھ
کہنا قابلِ قبول نہیں ہو سکتا - اتنا ضرور مجھے معلوم ہے کہ ترکی کا اپنا ذاتی سرمایہ بہت محدود و مختصر ہے - ترکی زبان کا کو
شاعر ایسا نہیں ہے جس کا مقابلہ میر یا سودا - ناسخ یا آتش - غالب یا انیس سے کیا جا سکے - عربی شعراء سے مقابلہ کا تو ذکر
کیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ ترکی مدارس میں بیس سال پہلے تک فارسی شعرا کا کلام پڑھایا جاتا تھا اور فارسی شعراء کو ہی تر
اپنا قومی شاعر سمجھتے تھے - گزشتہ بیس برس میں جب سے اتا ترک مصطفےٰ کمال نے لاطینی رسم الخط جاری کیا ہے - ترکی

یہ یہ رواج شروع ہوا ہے کہ قومی نظمیں ترکی زبان میں کہی جائیں مگر ہنوز دلی دور والا مضمون ہے۔ یلدرم پکّے قوم پرست تھے اور انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں اسلام کی بے بسی کا جو عالم تھا۔ اس کے لحاظ سے وہ چاہتے تھے کہ تمام دنیائے اسلام ترکی کی برتری تسلیم کرے اور ترکی کی رہنمائی میں سارے اسلامی ممالک بالخصوص ہندی مسلمان مغربی علوم وفنون سے اپنی اپنی ضرورت کے بقدر مستفید ہو سکیں۔ مرحوم غالباً دو مرتبہ ترکی گئے تھے۔

سجّاد حیدر مرحوم سے میری آخری ملاقات یکم جنوری ۱۹۴۳ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ میرے دوست سید محمد سبطین صاحب وکیل پرتاب گڈھ کے لڑکے کی برات آئی تھی اور شب گزشتہ کو عزیزی سید علی ظہیر بیرسٹر کی لڑکی سے جو ماشاءاللہ خود بھی بی۔اے ہے، نکاح ہوا تھا۔ یکم جنوری کو دوپہر کی دعوت میں بہت سے دوستوں کا مجمع تھا۔ سجّاد حیدر بھی شریک تھے۔ صحت اچھی نہ تھی۔ بہت سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے تک بہت پُر لطف صحبت رہی۔ محمد سبطین صاحب خود بھی فارسی کے اچھے ادیب ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ بلا کا حافظہ ہے۔ سر وزیر حسن اور خان بہادر سید اصغر حسن بھی موجود تھے۔ دیر تک علی گڈھ کی پرانی صحبتوں کے تذکرے ہوتے رہے۔ زمانہ بڑی عجلت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ تاہم ہماری سوسائٹی کا ابھی تک یہ حال ہے کہ جہاں دس پانچ ذوقِ سلیم والے آدمی جمع ہو جاتے ہیں۔ وہاں شعر وسخن کا تذکرہ ہونا لازمی ہے۔ چند ہفتے پہلے سر محمد یعقوب کی وفات پر میں ایک مضمون سرگزشت میں لکھ چکا تھا اس مضمون کی جو داد دورانِ گفتگو میں سجاد حیدر نے دی، اسے میں کبھی نہ بھولوں گا۔ کہنے لگے تمہارا مضمون میں نے پڑھا اور میں اس سے اس درجہ متاثر ہوں کہ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ یعقوب مرحوم کا مرثیہ ضرور لکھوں گا۔ جس میں ان حالات کا تذکرہ کروں گا جو تم نے اپنے مضمون میں لکھے ہیں۔ دنیا عجیب جگہ ہے۔ افسوس ہے کہ اس قدر جلد وہ وقت آگیا کہ مرثیہ لکھنے والے کا ہی مرثیہ کوئی اور لکھے۔ سجّاد کی کس کس خوبی کا تذکرہ کیا جائے۔ علی گڈھ کے دورِ ثانی میں بڑی مشکل سے کوئی اور شخص ایسا ملے گا جس کی ذات میں اتنی جامعیت ہو جو سجاد حیدر کی ذات میں موجود تھی۔ مرحوم نے دوستوں کا وسیع حلقہ چھوڑا ہے جن میں بہتوں کی سجّاد کے بعد یہ حالت ہوگئی ہے ؎

تمہارے بعد یہ ہے حال ہم صفیروں کا!
اس آشیاں میں صدا دی اُدھر پکار آئے!

قاضی عبدالغفار (مرحوم)

سجّاد ــــــ یلدرم

"جہاں پھول کھلتے ہیں اور گلاب کی خوش بُو شام کے سایہ میں پھیلتی ہے ـــــ ایسی وادی کے خاموش گوشہ میں جہاں نہ دبدبہ ہو نہ دغدغہ، زندگی بسر کرنے کا لطف ہے۔ جہاں پھول کھلتے ہیں اور یہ کثیف اور ترش رُو دُنیا ہنسنے لگتی ہے، ہوا میں حسنِ عشق سے مشابہ آہنگ نرم ایک اسرار انگیز خفیف روانی پیدا ہوتی ہے ـــــ جب فرشتہ گل شبوّ کے منہ کو کھولتا ہے اور بادلوں کو رنگین کرتا ہے ـــــ اس وقت بہار کے موسم میں ایک شام کو مر جانے کا لطف ہے"!

. . . .

"جس وقت ہلکی ہلکی ہوا چلتی ہے اور وادی کی سطح کے زمردین ٹیلوں پر اور زمردین دامنِ کوہ پر بادلوں کا سایہ اس طرح آتا ہے جس طرح فرشتے آسمان پر اُترتے ہیں اور میری رُوح کو تلاش کرتے ہیں اُس وقت میری رُوح چاہتی ہے کہ پھولوں میں سے نکل کر بادلوں سے جا ملے اور میرا دل یہ چاہتا ہے کہ اُسی دامنِ کوہ میں ان ہی سرو کے درختوں کے سایہ میں میرے جسم کو دفن کردیں اور اگر مَیں اس قابل ہُوں تو میرے لئے رونے والوں کے آنسو (کہ یہی میرے حسناتِ عمر کا نتیجہ ہوں گے) اُس ہنستے کھیلتے دریا میں جو اس وادی میں بہتا ہے رل جائیں، نابود ہو جائیں"!

. . . .

"پیدا ہوتے وقت رونا بہت اچھا! مگر نا امیدی کے ساتھ مرنا، اس کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی! مَیں ایک پُر نشہ وداع کو غمگین وصال پر ترجیح دیتا ہُوں۔ اور یہی سبب ہے آہ! یہی سبب ہے کہ چاہتا ہُوں کہ دغدغۂ حیات کو بہار کے پُر شوق زمانہ میں جب پھول کھل رہے ہوں۔ اور دُنیا میری طرف ہنس رہی ہو اور مَیں دُنیا کی طرف، ایسے وقت میں اُس کو الوداع کہوں"!!

("جہاں پھول کھلتے ہیں" ـــــ حکایات و احتساسات)

. . . .

"دُنیا کی خوشی میں، سعادت و رفاہیت میں اضافہ نہیں ہوگا مگر اندوہ و غم میں کمی ہو جائے گی

ایک محبت آلود وجود دُنیا سے اُٹھ جائے گا ـــــ سفالت و رذالت، تنعم و تعیش کی جنگ جاری رہے گی ـ مگر دُنیا کے لئے کُڑھنے والا ایک دل غائب ہو جائے گا!" (میرے بعد)

... ...

محبت کا ایک قرضہ ادا کرنا چاہتا ہوں ـــــ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ادا نہیں ہو سکتا! بیتے ہوئے زمانہ کی یاد کو جگا رہا ہوں ـــــ یہ جان کر کہ وہ زمانہ واپس نہیں آ سکتا! ـــــ محفلِ دی شب کے ٹوٹے ہوئے جام و مینا کے ٹکڑے سمیٹ رہا ہوں ـــــ اس یقین کے ساتھ کہ وہ اب میری دست رس سے باہر ہیں!

آخری دفعہ سن ۴۲ء کے آخر اور سن ۴۳ء کے شروع میں سجاد سے ملاقات ہوئی تھی ـ تقریباً (۱۷) برس کے بعد ہم دونوں لکھنؤ میں ملے تھے! اُن کی معنوی زندگی کے سمندر کا بہت سا پانی خشک ہو چکا تھا ـ جس طرح میرا دریا بھی ایک چھوٹا سا چشمہ بن کر رہ گیا ہے! (۱۷) سال کے بعد مَیں نے اُن کو بہت ضعیف اور کمزور پایا، میرا پہلا سوال اُن سے یہی تھا "سجاد! کیا تم بیمار ہو"؟ اور اپنی اس زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ (جس کی لذتِ دیرینہ سے اُن کے سب ہی احباب آشنا تھے!) اُن کا جواب یہ تھا ـ " ارے کچھ بھی نہیں بھائی! تھوڑی سی ذیابطیسی ہے ـ سو مَیں اُس کا علاج یوں کرتا ہوں کہ جی بھر کے مٹھائی کھایا کرتا ہوں! یہ پرہیز اور احتیاط سے مرض کی خاطر داری نہیں کرتا"!

لکھنؤ میں یہ چند ہفتے اس طرح گزرے کہ ہم دونوں گھنٹوں اُن کی کوٹھی کے خاموش برآمدے میں بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے ـــــ وہ باتیں! علی گڑھ کی! وہ باتیں! ادبیات اور شعر و شاعری کی! وہ باتیں گزرے ہوئے اور گئے ہوئے دوستوں کی!

اس ملاقات سے چند روز پہلے نومبر سن ۴۲ء میں اُن کے عزیز ترین دوست سر محمد یعقوب کے لئے اپنے خالق کا بُلاوا آ چکا تھا ـ اس حادثہ کی نسبت سجاد نے بر سبیلِ تعزیت مجھے ایک خط لکھا ـ اس خط میں دو سطریں نثر کی اور چند اشعار تھے ـــــ "ایک ہمدمِ دیرینہ کی یاد میں" ـــــ ان اشعار میں جو کچھ انہوں نے اپنے "ہمدمِ دیرینہ" کے لئے لکھا تھا ـ اُس کو آج تقریباً ڈیڑھ سال بعد میں اُنکی جُدائی میں اپنے غمگین جذبات کا ترجمان بنا سکتا ہوں ـ ۲۱ دسمبر ۴۲ء کو وہ مجھے لکھ رہے تھے کہ:-

"تمھیں میں تعزیت نامہ کیا لکھوں ـ ہمدمِ دیرینہ کی یاد میں تعزیت بھی ہے اور دوستوں کو چھوڑ کر چلے جانے والے دوست کے نام ایک پیام بھی .... سر محمد یعقوب کی قوم پرستی کی نہیں، احباب پرستی کی یاد مجھے تڑپا رہی ہے! تمھارا سجاد"

اس عبارت کے بعد اُس "شکوہ" کا انداز دیکھئے جو مرحوم نے اپنے "ہمدمِ دیرینہ" سے کیا تھا اور اب اُنکے احباب خود اُن سے کر رہے ہیں:

اے دوست دیا ساتھ نہ احباب کا تم نے ـــ یہ شرطِ رفاقت تھی ہمیں چھوڑ گئے تم!
مضبوط پکڑتے تھے سرِ رشتۂ اُلفت ـــ یہ کیا کہ جھٹک کر اُسے خود توڑ گئے تم!

اے عالمِ فانی سے نظر پھیرنے والے!
ہے کوئی کشش تجھ کو یہاں پھر جو بُلالے؟

وہ ڈُوب گیا جس نے ہزاروں کو اُبھارا ! کس کس کو دیا ہمتِ عالی سے سہارا !
یعقوب سا اب کوئی نہ آئیگا دوبارا شیریں سخن و دوست نواز، انجمن آرا !

وہ جو کہ لُٹا دیتا تھا احباب پہ دولت
وہ پیکرِ اخلاص وہ تمثالِ محبت !

احباب پرستی کا نمونہ تھے تو تم تھے احباب فراموشوں کو شرماؤ تو آکر !
یعقوب بھی احباب فراموش ہی نکلا اس طعنۂ دل دوز کو جھٹلاؤ تو آکر !

آرام سے کیوں زیرِ لحد جا کے ہو لیٹے
اپنے کو بچاتے ہوئے دامن کو سمیٹے

بیکار ہے بیکار ہے اخلاص و محبت اب کوئی نہ ہوگا مرزن جادۂ اُلفت !
وہ مدعیٔ رہبریٔ راہِ محبت ! کہتا تھا زمانہ کہ وفا اُسکی ہے خصلت

یوں چھوڑ چلا جیسے شناسا ہی نہ تھا وہ
اس طرح گیا جیسے کہ آیا ہی نہ تھا وہ

مَیں اگر شاعر ہوتا تو شاید یہی سب آج سجّاد مرحوم کے متعلق لکھتا ــــ لیکن مَیں کتنا ہی لکھتا، کتنا ہی لکھتا رہوں، وہ قرضہ کبھی بھی ادا نہیں کر سکتا جو ایک عزیز دوست اور ایک بے مثل ادیب اور ایک نازک خیال مفکر کا میرے ذمہ عاید ہوتا ہے! اس قرضہ کو مَیں قرضہ صرف اس لئے نہیں سمجھتا کہ سجاد مرحوم اُردو زبان میں ایک نئے اور ترقی پسند اور بہت ہی دلنواز اسلوبِ بیان کے موجد تھے اور اس لئے وہ خراجِ تحسین کے حقدار ہیں، بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ اُن کے ادبی ذوق سے میرے ادبی رجحانات نے اپنے آغازِ کار میں بہت کچھ حاصل کیا ــــ سجّاد کا ادب جوان ہو چلا تھا۔ جب میری مضمون نگاری اپنی طفولیت کی منزل پر تھی ــــ اُس منزل پر جہاں اگر اخبار یا رسالہ کسی نو مشق کا کوئی اچھا یا بُرا مضمون شائع کردے تو اُس کے لئے یہ واقعہ ایک طُرّۂ افتخار ہو جائے! اور تمنّا یہ ہو کہ اُس نو آموزِ لذتِ گفتار کے دوستوں کے حلقہ میں کوئی ایک ایسا دوست باقی نہ رہ جائے جو اُس کا چھپا ہوا مضمون نہ پڑھ لے! چھپ کر شائع ہو جانے اور اپنے نام کو "زیورِ طبع" سے آراستہ دیکھنے کی خواہش نو آموز مضمون نگاروں کی زندگی کا کس قدر عزیز سرمایہ ہوتا ہے! جس زمانہ میں سجّاد مرحوم کے مضامین مخزن میں شائع ہو رہے تھے مَیں اُن کو بار بار پڑھا کرتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اُن کے ذہنی نقوش کو چُرا چُرا کر اُن سے اپنے مضامین کو سجایا کرتا تھا۔ سجاد کے اندازِ بیان کی دلفریب پرچھائیاں چوری کے مال کی طرح میری گرہ میں آتی تھیں اور مجھے یقین ہے کہ آج تک بھی میری تحریروں میں سجاد کے اندازِ بیان سے میری ابتدائی خوشہ چینی کا اثر باقی ہے۔ اس لئے مَیں کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم کی ادیبانہ زندگی کے نقوش کو ــــ جس سے میرا انتساب میرے لئے قابلِ فخر ہے ــــ منظرِ عام پر پیش کر کے مَیں محبت اور عقیدت کا ایک قرضہ ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ مضمون اُس قرضہ کی پہلی قسط ہے۔ ممکن ہے کہ یہی مضمون یلدرم کے کسی سوانح نگار کے لئے

ایک پیش لفظ بن جائے۔

سجاد مرحوم میرے ہم سبق نہ تھے۔ جس طرح ادب کی دُنیا میں اسی طرح علی گڈھ میں وہ مجھ سے پہلے آئے اور پہلے فارغ ہوئے۔ لیکن چند سال کا یہ فرق اُن روحانی تعلقات نے مٹا دیا تھا جو ادبی اذکار کے توسط سے پیدا ہوئے تھے اور تقریباً ۲۵ سال قائم رہے اُس وقت تک قائم رہے جب تک کہ موت کی بے پناہ مقراض نے اس ریشمی ڈوری کو کاٹ نہ ڈالا! آخر سن ۴۲ء اور شروع ۴۳ء کی وہ ملاقاتیں میری نظروں میں پھر رہی ہیں! لکھنؤ سے چند ہفتوں کے لئے یہ کہکر رخصت ہوا تھا کہ واپس آکر تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، سجاد! لیکن جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ سجاد میرا انتظار نہ کرسکے۔ وہ تین چار دن پہلے ہی ایک دن صبح کو اس فانی دُنیا سے مُنہ موڑ کر آسودۂ خوابِ ابد ہو گئے! لکھنؤ میں وہ میرا انتظار نہ کرسکے۔ لیکن اُس دائمی صبح ازل میں جہاں خواب اور بیداری کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا اب وہ انتظار کریں گے ——— اپنے بعد میں آنے والے بہت سے دوستوں کا!

سجاد حیدر صوبجات متحدہ میں ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ سن ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ چند سال علی گڈھ کالج میں تعلیم پائی اور سن ۱۹۰۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ علی گڈھ میں وہ مولانا محمد علی مرحوم کے ہم سبق تھے۔ مولانا اُن کو بہت چاہتے تھے اور جس زمانہ میں دہلی سے اخبار "ہمدرد" جاری کیا جانے والا تھا مولانا نے اُن سے بہت اصرار کیا کہ وہ اُن کے اخبار کی زمامِ ادارت سنبھال لیں۔ لیکن سجاد کی طبیعت کے رجحانات اخبار نویسی اور اُس کے متعلقات کی کشاکش سے بہت دُور تھے۔ اُنکی فطرت زندگی کا کوئی خاموش گوشہ چاہتی تھی جہاں وہ اپنے افکار کی دُنیا بسا کر

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے!

لیکن دنیا ستم کار اور ستم ظریف ہے، سجاد جن ہنگاموں سے دُور بھاگا کرتے تھے اُن سے بدتر پابندیوں میں مبتلا ہو گئے۔ بجائے اس کے کہ ادب کی قلمرو میں ——— جو اُن کی حقیقی قلمرو تھی ——— اُن کا سکّہ چلتا۔ وہ چاکری کے چند کھوٹے سکّوں کے لئے ایک ایسی دُنیا میں قید کر دئے گئے جہاں "مجموعۂ تعزیرات ہند" گویا اُن کی زندگی کے افکار کا آئینہ دار بن گیا!! غلاموں کے ملکوں کا یہی سب سے بڑا حزینہ ہوتا ہے کہ ہرن اصطبل میں باندھے جاتے ہیں! مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہ سجاد اخبار نویسی کی دُنیا میں قدم رکھنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ یہ کہکر بہت پُرلطف اشارہ کیا تھا کہ "وہ ادب کے لئے وضع کئے گئے اور ہم بے ادبی کے لئے!" ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بہ صحرا رفت و من در کوچہ ہا رسوا شدم

کوچہ و بازار میں محمد علی کا وہ "رسوا" ہونا اور چاکری کے لق و دق صحرا میں سجاد کے کاروانِ ادب کا لُٹ جانا ہماری زبان کی تاریخ کے دو بڑے واقعات، نہیں حادثات ہیں جن سے ایک انقلابی ہندوستان کا مورخ عبرت حاصل کرے گا۔ اگر محمد علی کی خداداد صلاحیتیں قلم اور کاغذ کے لئے وقف ہو جاتیں اور اگر سجاد کی "ڈپٹی کلکٹری" اُن کو حسن خیال کی

رادی گُل میز سے خارج البلد نہ کر دیتی تو نہ جانے ہماری زبان کے خزانے زر و جواہر سے کس قدر معمور ہو جاتے۔ فکر و خیال کی کتنی بستیاں آباد ہوتیں ـــــ اس ریگستان میں کتنے نخلستان سرسبز ہوتے اور کتنے دریا بہتے!! "یلدرم" کی فطری شعریت کا اگر یہ حشر نہ ہُوا ہوتا تو نہ جانے آج دُنیا ہندوستان کے اس "نامق کمال" کے تراوشِ افکار سے کس قدر مالا مال ہوتی! لیکن پھر بھی جو ادبی میراث سجاد نے اپنے ہم زبانوں کے لئے چھوڑی وہ کچھ کم تو نہیں۔ اُن قطروں میں ایک سمندر، اُن چند دانوں میں دہقان کی آرزو کے تمام حاصلات، اُس ایک آہ میں غم کی ساری دُنیا، اور اُس ایک تبسم میں گلبانگِ حیات کی تمام موسیقی! ـــــ یہ سب وہ اپنے چند اوراق میں ہمارے لئے چھوڑ گئے!!

سجاد نے ادبِ لطیف اور مفکرانہ اور فلسفیانہ ادب کا نیا اسلوب اُردو زبان میں پیدا کیا جس کا سرچشمہ ترکوں کی زبان کے متعلق اُن کا وہ ادبی ذوق تھا جس نے ترکی ادب کے ایک انقلابی دَور سے اُن کا رشتہ باندھا ـــــ وہ انقلابی دَور جو نامق کمال اور خالدہ ادیب جیسے مفکرین کا دَور تھا۔ اس وقت تک ہندوستان کی زبانوں کا ادب اس حقیقت سے آشنا نہ تھا کہ کسی قومی ادب کو قومی انقلاب سے کیا نسبت ہُوا کرتی ہے۔ ابھی تک "ادب برائے ادب" کے تھکے ہوئے تصورات اُس "جنّتِ نگاہ اور فردوسِ گوش" کے معمار بنے ہوئے تھے جس جنّت کے دروازے پر عظیم الشان انقلابات کی ایک نئی دُنیا کا نقشہ بنایا جا رہا تھا! اپنے حجروں میں جن کے بھاری پردے گرے ہوئے تھے ہماری دُنیا کے اربابِ قلم بالکل آسودہ تھے اور اُن کو خبر نہ تھی کہ اُن کے حجروں کے باہر ایک طوفان آنے والا ہے! ترکی میں انقلاب کی پہلی لرزش پیدا ہو چلی تھی اور وہاں ترقی پسند ادب کے داعی میدان میں آنے لگے تھے۔ عین اُسی وقت "یلدرم" تُرکی ادب کی اس نئی دُنیا سے آشنا ہوئے جب کہ ترکی ادب کی اس بے چین رُوح کو "ادب برائے زندگی" کی صبحِ صادق کے دھیمے آفتاب کی پہلی کرن نے مس کیا تھا! سجاد کی فطرت نے ترکی ادب کی رُوح سے جو کچھ حاصل کیا۔ اس کو اُردو ادب کی تھکی ہوئی محفلوں تک پہنچانے کے لئے اُنھوں نے سب سے پہلے اُس زمانہ کی ترکی ادبیات کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اس طرح وُہ اُردو ادب میں ایک نیا تصوّر۔ ایک نیا اسلوب، ایک نئی زندگی منتقل کرنے لگے۔ غالباً اُن کا سب سے پہلا ترجمہ ترکی ناول ہاجرہ کا ترجمہ تھا مگر یہ کتاب ترکی ادب کی کچھ زیادہ خصوصیات کی حامل نہ تھی۔ مَیں تاریخوں کا صحیح تعین تو نہیں کر سکتا لیکن غالباً سن ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء میں دوسری دفعہ ترکی ادیب احمد حکمت کے افسانے، "ثالث بالخیر" کا ترجمہ سجاد کے قلم سے اُردو زبان کا لباس پہن کر ہماری زبان کے ادیبوں کے لئے ایک نیا پیام لایا! ان اوراق کے دیباچہ میں اُنہوں نے لکھا تھا کہ:۔

> "میری تمنا تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں۔ اس سے نہ صرف ہمارے ناولوں کے لٹریچر میں ایک نئے قسم کا اضافہ ہو گا بلکہ ترکوں کی سوشل زندگی کا اصلی نقشہ بھی ہمیں نظر آئے گا۔ ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر کی مَیں اُردو میں اس لئے ضرورت سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرزِ معاشرت میں جو انقلاب پیش آ رہا ہے وہ انھیں بھی پیش آ چکا ہے۔ اس وجہ سے

ہمیں اس نقشہ سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے اور اب کہاں ہیں۔

.........مغربی معاشرت کے دلدادہ تو اس قصّے کو پڑھ کر شاید خوش ہونگے مگر مخالفین تو یقیناً مکدر ہوں گے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ کیا کیا جائے زمانہ کا یہی رنگ ہندوستان پہ چڑھ رہا ہے۔ ترجمہ اُکھڑا اُکھڑا اور انوکھا معلوم ہوگا مگر ترکوں کا طرزِ ادا مجھے کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اور مغربی اور ایشیائی طرزِ تحریر کا کچھ ایسا اچھا امتزاج ہے کہ مَیں نے لفظی ترجمہ کی کوشش کی ہے گفتگو انوکھی تو ضرور ہے لیکن سُنیئے تو

عزیبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد!

۱۴؍اگست ۱۹۲۰ء"

آج سے (۲۴) سال پہلے جس اسلوب بیان کو وہ اکھڑا اکھڑا اور انوکھا کہہ رہے تھے وُہ آج ترقی پسند ادب کے ساتھ ساتھ ہماری ادبیات کی ایک نمایاں خصوصیت بن گیا ہے۔ ہمارا ادب اب جن حقائق کو زیادہ گرم اور زیادہ کھلے ہوئے الفاظ میں ہمارے سامنے لا رہا ہے اُس کا ایک دھیما اور معتدل آغاز ہم سجاد حیدر کے ابتدائی ترجموں میں پاتے ہیں۔ اس پہلی منزل کے بعد خود سجاد نے ترقی پسند ادب کی بہت سی منزلیں طے کیں اور اگر سرکاری ملازمت کی زنجیروں نے اُن کے افکار کو باندھ نہ لیا ہوتا تو کیا معلوم ہے کہ آج وہ جدید ادب کی کس منزل پر ہوتے۔ ۱۹۲۵ء میں اُنہوں نے نامق کمال کے طویل ڈرامہ "جلال الدین خوارزم شاہ" کا ترجمہ پیش کیا۔ نامق کمال اپنے زمانہ کے انقلابی اور ترقی پسند ادیبوں میں بلاشبہ سب سے بڑا ترکی ادیب تھا۔ اُس کے متعلق خود سجاد اپنے مختصر دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

"نامق کمال بک ترکی ادبیات جدیدہ کے زندۂ جاوید بانیوں میں سے ہے۔ وہ، وہ ہے جس کے حیات آفرین قلم نے بہ قول پروفیسر براؤن وطن کے عام لفظ کو محض زاد و بوم کے مفہوم سے بلند کرکے عشق ملک و ملّت اور دین و مذہب کا حامل کر دیا۔ مَیں اس ڈرامہ سے جتنا متاثر ہُوا ہوں اگر اُس کا عشرِ عشیر اثر بھی ناظرین کے دل میں پیدا کر سکتا تو مَیں سمجھوں گا کہ میری محنت وصول ہو گئی"

اس کے علاوہ "مطلوبِ حسیناں" "یلدز زہرہ"۔ "آسیبِ الفت" یہ تینوں بھی ترکی افسانوں کے ترجمے ہیں جو یکے بعد دیگرے شائع ہوئے مگر سب سے زیادہ نامق کمال کے ڈرامہ نے سجاد کا رشتہ "ادبیاتِ جدیدہ" سے مضبوط کر دیا چنانچہ ۱۹۲۷ء میں "حکایات و احتساسات" کے عنوان سے اُن کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہُوا جس میں کچھ ترجمے خالدہ ادیب کے مضامین کے اور کچھ دیگر ترکی مصنفین کے شامل ہیں۔ مگر ان کے علاوہ چند طبع زاد مضامین بھی ہیں جو ہمایوں، علی گڈھ میگزین اور مخزن میں شائع ہو چکے تھے۔ یہ "خیالستان" کے سلسلہ کی دوسری کڑی تھی۔ "خیالستان" پانچویں دفعہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کے بعض مضامین "یلدرم" کے شاہکار ہیں جن میں جدید ترکی ادب کے بہترین تاثرات کو اُنھوں نے اُردو ادب کے طبع زاد اور جدید پیرایہ میں مجتہدانہ پیش کیا اور اس نقطہ سے اُردو کے ادب میں وہ نئی راہ پیدا کی ہے

.... جس پر آج ترقی پسند ادب کے قافلے رواں دواں ہیں۔

جو کچھ سجاد کی فطرت نے ترکی ادب سے حاصل کیا اور جو کچھ خود اُنکی فطرت میں ودیعت تھا ان دونوں کے امتزاج کا بہترین نتیجہ "خیالستان" اور "حکایات واحتساسات" میں حاصل ہوتا ہے۔ کہیں کہیں سے چند جواہر ریزے نقل کرتا ہوں۔ زبان اور بیان کی لذتوں سے قطع نظر پہلے اُن افکار پر نظر کیجئے جن میں سجاد کی روح بے قرار نظر آتی ہے۔ اپنی ادبی کاوشوں کے درمیانی دور میں جب اُن کی آرزومند رُوح دُنیا کی کشاکش سے مجروح ہو چکی ہے۔ وہ سرسید مرحوم کے مزار پر جاتے ہیں اور اپنے تاثرات کی ترجمانی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ :۔

"مجھے اعتراف کرنا ہے۔ حرصِ جاہ و مال و ہوسِ نفس سے مغلوب ہو کر وہ شعلہ جو مجھ میں کبھی ــــــ اور یہ زندگی کے علوی لمحے ہوتے ہیں ــــــ تیزی سے بھڑکتا ہے۔ افسوس کہ اکثر ــــــ اور جس زمین سے ہم مربوط ہیں اس زمین میں بیشتر سفلی ہی ہے ــــــ بہت دھیما رہتا ہے، گو شکر ہے کہ بجھتا نہیں اور خدا کرے کہ جس دن یہ شعلۂ قلب میری بے حمیتی سے بجھے اُس دن بلکہ اُسی لحہ یہ شمعِ حیات بھی گل ہو جائے ....

یہ شعلہ یہ لاہوتی نور مجھے چھوڑے جا رہا ہے، مجھے خود اس کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ ملوث محیط جس میں میں تیر رہا ہوں زیادہ کثیف زیادہ غلیظ ہوتا جا رہا ہے! واعظ کا وعظ اور نقیب کی ہیجان انگیز صدا میرے پاس سے اثر کئے بغیر گزر جاتے ہیں ...."

"ویران صنم خانوں" کے عنوان سے زندگی کے حقائق کا تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے وجدان کا مشکل راستہ طے کرکے فکر و نظر کی اُس منزل پر پہنچتے ہیں جہاں بے حقیقت زندگی کی حقیقت اُن کو مایوس کر دیتی ہے ــــــ فرماتے ہیں :۔

"طفلی وعشق کے ویران معبدوں کو چھوڑ کر میں آگے بڑھا۔ افکار و احساسات کے نادیدہ اُفقوں کی طرف زندگی ڈراؤنی تیزی کے ساتھ مجھے لے گئی اور میں نے دوسروں کے معبد کے دروازوں میں سے اندر جھانکا۔ مگر میری نگاہ نے نہایت گہرے پردوں میں سے گزر کر دیکھا تو یہ دیکھا کہ ہر جگہ ویران معبدوں کے سوا کچھ نہیں۔ قلب نے بھی کہا کہ میں کبھی تجلّی گاہِ ارمان تھا۔ کبھی! وہ علوم جس کے لئے علماء سر کھپا رہے ہیں، وہ سوز و گدازِ بشری جس کی ترجمانی شعراء کرتے رہے ہیں، دوستی، عشق، دین، فکرِ بشر، سب کے سب آخر میں دیکھے تو ویران معبد ہی نظر آئے۔ دماغ و قلب کے ویران صنم خانے!

اب اُن میں حسرت و یاس و تمنّا سیر کرتے ہیں!"

سجاد کی زندگی کا کربِ روحانی ــــــ جس کا بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ اُن کی زندگی اُن کے فطری ماحول سے بہت دُور پھینک دی گئی تھی ــــــ اُن کے مضامین میں بار بار ظاہر ہوتا ہے اور وہ اپنے ادبی ذوق کی پُرکیف اور مست جوانی کو

ایک ایسے بے پناہ بڑھاپے میں منتقل ہوتے دیکھتے ہیں — اس انحطاط کا ماتم کرتے ہیں — جس نے اُن کی شعریت کو تباہ کر دیا! جب ہی تو اپنی فطرت کے اس مزار کے سرہانے بیٹھ کر وہ انسانوں کے ویران صنم خانوں کا مرثیہ لکھتے ہیں۔!

میں اگر سجاد کا سوانح نگار ہوتا تو اُن کے مضامین پر تبصرہ کرنے سے پہلے کسی نہ کسی طرح یہ بھی پتہ چلاتا کہ اُن کا ہر مضمون کب اور کس ماحول میں لکھا گیا۔ اُس وقت میں بتا سکتا کہ وہ خود اپنی زندگی کے حوادث سے کس حد تک متاثر ہوئے تھے اور کس طرح اُن کی فطرت نے ان حوادث سے مجروح ہو کر ایک بلند پرواز ادیب کو "حسرت ویاس وتمنا" کے تاریک اور ویران صنم خانہ تک پہنچایا تھا۔

اپریل ۱۹۲۳ء میں رسالہ ہمایوں نے اُن کا ایک مختصر مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان "قوت" تھا۔ ان چند سطروں میں ہم ایک طعن آمیز تمثیل کا پیرایہ دیکھتے ہیں۔ وہ مضمون زمانہ کے حالات پر گویا ایک SATIRE ہے جس کے کانٹوں کی نوک بہت تیز ہے۔ ہم ان سطور میں سجاد کو ہندوستان کے حالاتِ حاضرہ پر تحقیر کی نظر ڈالتے دیکھتے ہیں۔ اُن کے قلم کے ان کانٹوں کی نوک پر ہمیں اُن کے خونِ دل کی سُرخی نظر آتی ہے! — لکھتے ہیں:-

"گلی کے کنارے میں اُس مجمع کو اکثر دیکھا کرتا تھا۔ مزدوروں کے، قلیوں کے لڑکے غول کے غول دوپہر کو وہاں کھیلتے ہوتے تھے۔ وہ آپس میں اُلجھتے تھے، چیختے تھے، چلاتے تھے۔

ایک دن میں اُس راستہ سے گزر رہا تھا۔ لڑکوں کا مجمع تو تھا مگر کھیل نہ تھا۔ بلکہ وہ حلقہ باندھے کسی چیز کا تماشا دیکھ رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مزیدار تماشا انھیں بہت لطف دے رہا ہے۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ میں نے دیکھا کہ جسے وہ ذوق وشوق سے دیکھ رہے تھے وہ ایسا تماشا تھا جو غالباً اُنکی تفریحِ طبع کے لئے روز ہوتا ہوگا۔ ایک بڑا لڑکا جو سن میں سب سے زیادہ معلوم ہوتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ قریب قریب جوان ہو چکا تھا متکبرانہ بیچ میں کھڑا تھا اور ایک چھوٹا لڑکا اُس سے دست وگریبان ہو رہا تھا۔ بڑا لڑکا چھوٹے کو چپتیا رہا تھا اور غلیظ گالیاں دے دے کر اپنے سے علیحدہ کر رہا تھا چھوٹا لڑکا گھونسے کھا رہا ہے، تھپڑ کھا رہا ہے۔ بڑے لڑکے کے ہر جھٹکے سے زمین پر گر پڑتا ہے۔ ہر گھونسے پر ہائے کی آواز اُس کے مُنھ سے نکلتی ہے۔ مگر گر کر اُٹھتا ہے، روتا جاتا ہے روتے سے اور گرنے سے اُس کے بال اُس کا چہرہ خاک آلود ہو رہے ہیں، لیکن وہ پھر بڑے لڑکے سے غصہ میں لپٹ جاتا ہے۔ ہچکیاں بندھ رہی ہیں مگر کہے جاتا ہے "میری ہے لاؤ!" یہ کہہ کر ایک قمچی کو بڑے لڑکے سے چھیننا چاہتا ہے۔ طلبِ حق کے مقابلہ میں اُسے ایک گھونسا ایک لات ملتی ہے جسے کھا کر وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹتا ہے مگر پھر آگے آتا ہے۔ رونے اور چیخنے کی

وجہ سے اُس کی آواز بیٹھ گئی ہے، اُس کا ضعف بڑھتا جا رہا ہے لیکن اپنی قیچی بڑے لڑکے سے واپس لینے کی کوشش کئے جا رہا ہے۔ آخرکار اُس پر ایک ایسا لپڑ پڑا۔ جس سے وہ بھنا گیا اور چکر کھا کر زمین پر آ رہا۔ اب اُس میں اُٹھنے کی قوت نہ رہی تھی۔ کمزوری سے زمین پر پڑا رو رہا تھا۔ اور بڑے لڑکے کو گالیاں دے رہا تھا۔ مگر بڑا لڑکا جبر و قہر سے حاصل کی ہوئی قیچی کو مفتحرانہ انداز سے ہلا ہلا کر اُس چھوٹی مخلوق کے (جو حلقہ باندھے کھڑی تھی اور قوت کے مقابلہ میں عاجز کو ہیچ جانتی تھی) قہقہوں اور تالیوں میں جھومتا ہوا چلا گیا۔

عین اُس وقت اُس منظر کے اوپر سے ایک کوّا جس نے ایک آشیانۂ شفقت میں گھس کر ابھی ابھی انڈوں کو پھوڑا تھا اور انھیں کھا کر شکم سیر ہوا تھا مصنوعی فزار کے انداز سے گزر رہا تھا۔ اور غیض مادرانہ میں بھری ہوئی ایک مینا سادہ لوحی سے ٹھونگیں مارنے کی کوشش کر کے قوت اور حیلہ کو اپنے زعم میں مجروح کر رہی تھی!!

۱۹۲۳ء تک ہندوستان کے گزرے ہوئے دس بارہ سال کی روئداد کی طرف یہ ایک طنز آمیز اشارہ ہے۔ اُس عجز اور بے کسی کی حالت کی طرف جس حالت میں وہ شاید خود اپنے وجود معنوی کو بھی دیکھ رہے تھے۔ اس تمثال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سجاد کی سریع الحس روح ملک سیاسی کش مکش سے بہت دُور رہ کر بھی کتنی قریب تھی

خیالستان سجاد کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے اور ان کی رومانیت اور تخیل کا بہترین عکس ہے۔ وہ بلا شبہ اُردو ادب کے جواہر خانہ میں ایک بہت قیمتی ہیرے کی انگوٹھی ہے۔ ان اوراق میں سجاد اپنی قوتِ فکر اور رعنائی بیان کے اعلیٰ ترین درجہ تک پہنچے ہیں۔ کاغذ کی سطح پر اُن کی فکرِ فلک پیمانے رومانیت کی رُوح کے ہزارہا جلووں کو بے نقاب کیا ہے۔ اور ان کے قلم کی نقاشی نے ایسے دل نواز نقش و نگار بنائے ہیں جن کی نوک و پلک میں افکارِ لطیف کی ایک دُنیا آباد ہے۔ جہاں کہیں وہ مناظرِ فطرت کا عکس اپنی رُوح کے آئینہ میں دیکھتے ہیں وہاں اُن کی تحریروں کا پڑھنے والا اُن کے وجدان کی موسیقی میں محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً خارستان و گلستان کا پہلا منظر پیش کرتے ہیں:۔

> فضا میں خاموشی، بے پایاں سمندر، ڈراونی خاموشی، وحشت انگیز سکوت، کوئی صدا نہیں، کوئی اثرِ حیات نہیں، ایک غیر محدود مگر روشن تنہائی، ایک محشرِ سکون ——— یہ عالم ہے! چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے، موجیں سوچ رہی ہیں، چاند کی کرنوں کے سیلاب سے بچا ہوا آسماں شاید سوچ رہا ہے، بادلوں کے منتشر ٹکڑے سوچ رہے ہیں ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا اس خاموشی کا بھید چپکے چپکے سمندر کے کان میں کہنا چاہتی ہے اور نہیں کہہ سکتی! سمندر کا سینہ سانس لینے کی کوشش کرنا چاہتا ہے ——— تمام موجودات میں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم ہوتی ہے۔

——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے پایاں سُستی اور سکوت میں اگر کہیں سے ذرا سی صدا بھی آ جائے تو دُنیا ہنس پڑے گی ——— اچھل پڑے گی!!"

خارا اور نسرین کی پہلی ملاقات کے منظر کا ایک ٹکڑا دیکھئے:۔

"یہ جزیرہ گو کہ بے انتہا خوب صورت تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک گراں خواب میں سو رہا ہے اور ہمیشہ سے کسی چیز کا انتظار کر رہا ہے۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کا بوسہ لینا تھا کہ جزیرہ کے پرند چہچہا کر اُڑنے لگے۔ تمام کلیاں ایک دم کھل گئیں۔ ایک گرد باد آہنگ و رنگ ایک زمزمۂ جوش و خروش نے کُل جزیرہ کو گھیر لیا ......!......

پہلے نسرین ہوش میں آئی تو دیکھا کہ اُس کے ہونٹوں پر جہاں خارا نے بوسہ لیا تھا ایک پھول کھلا ہوا ہے"!

سجاد کی ادبیت کا شاہکار میری رائے میں خیالستان ہے۔ اس کے بعد دوسرے افسانے اور مضامین جو خاص خاص موضوعات کو مرکزِ نظر بنا کر لکھے گئے ہیں، اُن میں زیادہ تر ایک دھیما طنز اثر پیدا کرتا ہے۔ اسلوب بیان "خیالستان" کی نسبت سے سادہ ہے یعنی گُل کاری کم ہے مگر چٹکیاں کم نہیں ہیں۔ مثلاً "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"۔ میں ایک مضمون نگار اپنے احباب کی کثرت کا شکوہ سنج ہے۔ "صحبتِ ناجنس" میں دو لڑکیوں کی خط و کتابت کو اُس درد و کرب کا پیامی بنایا گیا ہے جو شوہر اور بیوی کے مذاق کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔ اس افسانہ میں سجاد نے مزاحی اور طنزیہ اندازِ بیان کو اپنے بہترین اسلوب میں پیش کیا ہے اور سماج کے ایک بڑے گناہ کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ پڑھنے والا اس نگارش کی ادبیت سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور اُس کانٹے کی خلش بھی محسوس کرتا ہے جس سے ہماری سماج میں ازدواجی زندگی کبھی کبھی بے آہنگ ہو جاتی ہے اور اکثر تلخ آہنگ۔ عذرا اپنی سہیلی سلمیٰ کو اپنے شوہر کا حال لکھتی ہے:۔

"وہ لڑکپن کی امیدیں ایک لال کی ہلکی پرواز کی طرح غائب ہو گئیں، ایک چھوٹی چڑیا کی طرح اُن کا خون ہو گیا!! بیاہ کا تیسرا یا چوتھا دن تھا۔ میں پیانو کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ مجھ سے ذرا دُور آرام کرسی پر ڈھیر ہو رہے تھے، میں یوں ہی بیٹھی بیٹھی پیانو کو بجا نہیں رہی تھی بلکہ کھیل رہی تھی کہ میرے کانوں میں وہ بھاری اور کرخت آواز آئی۔ "ہم سُنتے ہیں آپ اچھے گاین گاتی ہیں، اگر دو ایک ہم کو سنائیں تو بڑی مہربانی ہوگی"

میں رُکی اور استعجاب آمیز انداز سے اُن کی طرف دیکھنے لگی معلوم نہیں کہ اُس نظر کے اُنھوں نے کیا معنی لیئے، کہنے لگے:۔

"کوئی راگنی کوئی ٹپہ کوئی غزل ہمارے واسطے ہونا! ہم یہ نہیں کہتا کہ کیا سناؤ۔ آپکو جو پسند ہو وہ سناؤ"!

میں مبہوت نظر سے دیکھ رہی تھی اور اُس تقریر کو سُن رہی تھی، پھر وہ فرمانے لگے:۔

"اچھا اور کچھ نہیں تو یہ غزل تو سناؤ :-
"دونوں ہاتھوں میں مہندی لگالے پری"!
مَیں کیا جواب دیتی حیران تھی، وہ مسلسل گانے کی چیزیں پیش کرتے جاتے تھے۔
"اچھا صاحب! غزل نہیں تو کوئی ناٹک کی چیز :-
"دیتا ہوں تجھ کو تختِ سلیمان کی قسم"!
(اور اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر پُورے جوش اور نہایت محبت اور حرص بھری نظر سے مجھے دیکھ کر)
"مِل مجھ سے اے پری تجھے انسان کی قسم"!
مجھے چُپ لگی ہوئی تھی، آخر وہ اُٹھ کر پیانو کے قریب آ گئے اور فرمانے لگے :-
"صاحب کیا غضب ہے۔ میں اس قدر التماس کیا ہوں آپ قبول نہیں کرتے! مہربانی کر کے مداری لال یا امانت کی کوئی چیز آپ سُنا دیں گے تو کیا ہوگا!"
ایسے ہی چند دل دوز لطیفے سُنا کر عذرا لکھتی ہے :-
"سلما! سلما! آ میرے حالِ زار کو دیکھ! کھانے کے بعد متواتر زور زور سے ڈکار لینے والے آدمی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہوں۔ کل جو خیال آیا تو دن بھر رو با کی، پیٹ پر ہاتھ پھیر کر اونٹ کی طرح ڈکار لینا ـــــ عا! عا! اف۔ غضب! .... یہ آنکھیں یہ ڈکار۔ یہ آواز، یہ "دونوں ہاتھوں ......، میں مہندی لگالے پری" کا عشق! کچھ نہیں سُوجھتا کہ کہاں پناہ لوں! .....
وہ ایک سیاہ ابر کی طرح گھر پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ .... کیا عمر یوں ہی گزرے گی"؟

اس افسانے میں سجاد نے ہماری سماج کے ایک دل خراش حزینہ کو طشت از بام کیا ہے اور اسی طرح "چڑیا چڑے کی کہانی" میں چڑے کی زبان سے اور اسی طرح "نکاح ثانی" میں ایک نوجوان عروس اور ایک بازاری عورت کی گفتگو میں مرد کی زندگی کے متعلق عورت کے جذبات کی ایک نازک اور لطیف تصویر کھینچی ہے۔ اس افسانہ میں نفسیات، گمشدہ اور شرافت جنسی کا ایک لطیف پہلو نمایاں کر کے ـــــ اخلاقی حُسن اور بدصورتی کے تقابل پر اپنا زورِ قلم صرف کر کے ـــــ انھوں نے مرد کی جنسی آلودگیوں کے دھبے دھوئے ہیں۔ افسانہ کا آخری منظر وہ ہے جب نوجوان بیوی اپنے شوہر کو ایک بازاری عورت کے پنجہ سے رہا کرنے کے لئے جاتی ہے :-

"ایسی آواز سے جس سے ادائے استہزا ظاہر ہوتی ہے اُس نے (بازاری عورت نے) جواب دیا "اپنے شوہر کو مجھ سے چاہتی ہو مگر بی بی جان! آپ غلطی پر ہیں۔ مَیں نے کسی کے شوہر کو ضبط نہیں کر لیا"! وہ (بیوی) اس جواب کی پہلے ہی سے متوقع تھی اُس کے سُنتے ہی اُس نے تار باندھ دیا: "آخر اس کی کیا ضرورت ہے۔ جھُوٹ بولنے کی کوئی حاجت نہیں، مَیں تم سے یہاں لڑائی

لڑنے نہیں آئی ہوں، یقین مانو تم سے بیر رکھنے کا بھی میں اپنے میں کوئی حق نہیں دیکھتی، میں جو آئی ہوں تو اس لئے کہ اب بھی شاید تمہارے دل میں وہ چیز باقی ہو جو ہم سب کا حصّہ ہے میں تمہیں تریا ہٹ کا نہیں تریا پریم کا واسطہ دیتی ہوں! میں تم سے اپنا خاوند چھیننے نہیں آئی، کیونکہ اپنے میں اس کی نہ قابلیت اور نہ طاقت پاتی ہوں! میں اُسے مانگنے آئی ہوں! تمہاری ہتیلی میں اس وقت ایک بڑی چیز ہے! اُسے چاہو مسل دو چاہے چھوڑ دو! ان آنکھوں کو جو برسوں کے رونے سے تر ہو رہی ہیں تم سکھا سکتی ہو! .... یہ جانتی ہوں کہ وہ اس وقت مجھ سے زیادہ تمہارا ہے۔ مجھ سے بھاگ کر تمہارے پاس آتا ہے۔ حالانکہ وہ میرا شوہر ہے۔ اُسے صرف میرا ہو کر رہنا چاہیئے، میرے سوا اُس پر کسی کا حق نہیں۔ میرے سوا وہ کسی کی ملکیت نہیں کسی کی امانت نہیں، تم عورت کے دل کی باتیں سمجھ سکتی ہو۔ سمجھتی ہو نا ملے کہیں سمجھو! تم نے میرا شوہر لے کر مجھ سے کیا کیا لے لیا۔ گھر بھر کا امن، گھر بھر کا چین لے لیا۔ وہ کل رات اور بہت سی راتوں کی طرح یہاں تھا۔ اُس نے ساری رات شاید کیا، یقیناً، تمہارے یہاں گزاری شاید تم جو مجھ سے ملنے اس کمرہ سے آئیں تو اُس کے پہلو سے اُٹھ کر آئیں! لیکن جانتی ہو کہ اُس کی بیوی نے یہ رات کیونکر کاٹی؟ اس طرح کی اور سینکڑوں راتیں کس طرح کاٹیں؟ جہنّم کے انگاروں میں لوٹ کر کاٹیں! میری پانچ برس کی —— ہاں! سُنتی ہو؟ میرے پاس پانچ برس کی ایک ننھی بھولی جان بھی ہے وہ بھی روتے روتے بابا کا انتظار کر کے سوئی ہے۔"!

اُدھر وہ (بازاری عورت) کونے میں ایک مونڈھا کھینچ کر اُس پر بیٹھ گئی اور پاؤں پر پاؤں رکھ اُسے ہلانا شروع کیا اور ایک مستہزی اور بے امان نظر سے نوجوان عورت کو دیکھنے لگی۔ "تو اب میں کیا کروں؟ کیا ہر شام بیگم صاحبہ کے گھر اُن کے شوہر کو ہاتھ پکڑ کر پہنچا آیا کروں؟"

اس گفتگو میں غصہ پیدا ہوتا ہے۔ بازاری عورت بیوی پر حملہ کرنے اُٹھتی ہے۔

"اُس پر حملہ کرنے کے لئے ایک قدم آگے ڈالا مگر صرف ایک قدم، دوسرا قدم اُٹھانا چاہتی تھی کہ پیچھے سے فولادی ہاتھوں نے اُس کے کندھوں کو پکڑ لیا ...."

یہ وہ گم کردہ راہ شوہر تھا جو کسی گوشہ میں کھڑا ان دونوں کی گفتگو سُن رہا تھا —— اس تصویر خانہ کا آخری منظر افسانہ نگار اس طرح پیش کرتا ہے —— اور یہی منظر اس کا وہ "پیام" ہے جسے وہ اس افسانہ کے ذریعے سے پڑھنے والوں کے دلوں تک پہنچانا چاہتا ہے:۔

"اُس نے دیکھا کہ فاحشہ اُس کی بیوی پر ہاتھ چھوڑنا چاہتی ہے، یہ دیکھتے ہی دُنیا اُس کی آنکھوں میں تاریک ہو گئی۔ وہ بجلی کی تیزی کے ساتھ کواڑ کھول کے کمرے میں در آیا۔ اور اپنے

آہنی بنجوں سے اُس کے کندھوں کو پکڑ کر جھنجوڑ دیا اور ایک جھٹکا دے کر اُسے اور اُس کے ساتھ اُس کی محبت کو اپنے سے دُور پھینک دیا اور پھر اپنی بیوی کے پاس جا کر اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور ایک نگاہِ احترام کے ساتھ جس میں آج کے دن تک کے تمام تصوروں کے لئے طلبِ عفو آ کر جمع ہو گئی تھی اُس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا:۔

"میری خطاؤں کو معاف کر دو۔ میں صرف تمہیں چاہتا ہوں اور میں صرف تمہارا ہوں اور تمہارا ہو کے رہونگا"

اور پھر اُس کے چہرے کو جس پر دو آنسوؤں کے قطرے، دو قطرہ ہائے سعادت جھلک رہے تھے اپنی طرف کھینچ کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے!

اور جب کہ فاحشہ اپنے غصہ اور حسد کو ایک کھسیانی ہنسی سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اس بیاہے جوڑے نے جن کے درمیان اب تک ایک سرد مہری کی دیوار حائل تھی جسے وہ ہٹا نہ سکے تھے پاک و صاف محبت بھرا بوسہ لیکر گویا دوسری مرتبہ نکاح کیا اور وہ پیمانِ وفا باندھا جو اب عمر بھر تک نہ ٹوٹے گا ــــ یہ بوسہ اُس پیمانِ وفا کی مہر تھا!"

جس طرح اس افسانہ میں سجاد نے نہ صرف ہماری سطح کی ایک ناخوشگوار حقیقت کو اپنے قلم کے زور سے دل گداز بنایا ہے، بلکہ افسانہ کی رُوح میں ازدواج کے اخلاقی معیار کو سمو دیا ہے۔ اس طرح "سودائے سنگین" میں اُنھوں نے حُسن و عشق کی آویزش کا ایک حزینہ بہت مؤثر انداز میں پیش کر کے جذبات نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ اگر "خیالستان" میں اُنھوں نے انسانی زندگی کے رومان اور جنسی فلسفہ کی شعریت کو ایک ایسی سطحِ مرتفع پر نہ پہنچا دیا ہوتا جو اوسط درجہ کے اہلِ قلم کی دسترس سے باہر ہے تو میں اُن کے تمام افسانوں میں "سودائے سنگین" کے روحانی حزینہ کو اُن کا سب سے بڑا شاہکار قرار دیتا۔ اس افسانہ کا اُٹھان کچھ اس قدر بے تکان ہے کہ گویا اُس کا لکھنے والا "فرامرز" کا نام لیکر فی الاصل خود اپنے وجودِ معنوی کی تصویر کھینچ رہا ہے! جو لوگ سجاد کی زندگی کے اندرون کی کوئی جھلک دیکھ چکے ہیں وہ دیکھیں کہ "سودائے سنگین" میں سجاد نے فرامرز کے وجودِ معنوی کا عکس جس نقش و نگار میں پیش کیا ہے اور اپنے اس افسانہ میں جو تصویر خانہ ترتیب دیا ہے وہ خود اُن کے وجدان اور اُن کی واردات سے کس قدر قریب ہے۔ اس طرح اپنے افسانہ کے ہیرو کا تعارف کراتے ہیں:۔

"فرامرز" کو میں برسوں سے جانتا تھا۔ یہ ایک شاعر تھا۔ حساً و فکراً شاعر، اگرچہ لساناً نہ ہو ــــ اپنی تمام ہئیتِ معنویہ کے ساتھ شاعر تھا کہ زندگی کو نورِ شعر میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ اُن بدبختوں میں سے تھا جو زندگی کی مادیات کے تھپیڑے کھانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں ــــ حالانکہ اُن کا خستہ اور مجروح اور ہائے ستم! شاعرانہ دل مثل ایک مریض بچے کے اُن تھپیڑوں کے کھانے کی طاقت نہیں رکھتا ــــ مگر اُس کی طبیعت میں

ایک میلان نشو تھا کہ سب سے زیادہ مگر زمانہ میں اپنے پُر ملال چہرے پر ایک مسکراہٹ ضرور رکھتا تھا۔ اس تبسم سے میں یہ سمجھتا تھا کہ اُسے زندگی کی مادیات سے جب پالا پڑتا ہے تو وہ اُن کا یقین نہ کرنے میں ثابت قدم رہنا چاہتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دھوکا دیا کرتا ہے ۔ خود کہا بھی یہی کرتا تھا :-

" زندگی میں سے موسیقی اور شعر اور پھول اور روشنی اور پھر ان سب کا مجموعہ ان سب کا ماحصل عورت کو نکال ڈالو، پھر دیکھیں تم کیونکر اس دُنیا میں زندہ رہنے کی قوت اپنے اندر پاتے ہو؟ اگر زندگی ان ہی چیزوں سے عبارت ہوتی اور اُن کی حقیقت بھی صرف تخیل سے مرکب ہوتی تو ہم سب کتنے خوش قسمت ہوتے؟ مگر یہ رنگین چیزیں ہوا میں رنگ بن کر اُڑ جاتی ہیں، غائب ہو جاتی ہیں ـــــ اور یہ عورتیں؟ کتابِ حیات کی اس جلد کو ایک جلد زرا ندوز کی شکل میں دُور ہی سے دیکھتا تھا۔ اُسے پڑھنے اُس کے بابوں اور صفحوں کو جو آنسوؤں سے لکھے گئے ہیں کھول کر دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ابھی اُسے یہ حقیقت معلوم نہ ہوئی تھی کہ زندگی میں شعر ایک نوحہ، ماتم، موسیقی ایک فغان یاس، پھول ایک منجمد قطرہ، گریۂ روشنی، ایک امید گریز، ان کے علاوہ اور کچھ نہیں ـــــ اور ابھی اُس نے یہ نہیں معلوم کیا تھا کہ عورت بھی اُس سراب کے مانند ہے کہ ڈھونڈو مگر نہیں ملتا، دکھائی دیتا معلوم ہوتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا! ...."

فرامرز کے "سودائے سنگین" کا آخری منظر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنے بے وفا محبوب کے مرمریں مجسمہ کے سامنے کھڑا ہے اور اپنے عشق و محبت کی گزری ہوئی داستان کے نقوش کو تخیل کی وسیع دُنیا میں اس طرح اُجاگر کر رہا ہے:-

" یہ تھی، ہاں وہی تھی، اُس کرہ کو اپنے پاؤں تلے لڑھکاتی میرے پاس آئی - اور آتے وقت اُس تاریکی میں لرزتی اور قد میں بڑھتی جاتی تھی۔ بجلی جو چمکی تو میں نے اُسے صاف اور واضح طور پر دیکھا۔ اُس نے باہیں میرے گلے میں ڈال دیں، تاروں کے تاریکی پر اہرمن اپنے چمکدار چنگلوں سے خون گرا رہا تھا کہ ہم ایک لمحہ میں ایک بوسۂ محبت کے ساتھ ساری عمر بسر کر گئے! ـــــ اب اس رات کے بعد ہر رات کی تاریکی میں وہ لرزتی اپنے کرہ کو لڑھکاتی لڑھکاتی اپنی عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیتی ہے اور ایک لمحہ میں ـــــ اُس لمحہ میں جو عمر کے طول کے برابر ہوتا ہے ـــــ مجھے وہ لطفِ زندگی جو کسی عورت میں خاص کر اُس میں نہیں جس نے میرے ساتھ بے وفائی کی ـــــ "

کون کہہ سکتا ہے کہ سجاد نے بھی اپنی زندگی میں اس مجسمۂ مرمر کی طرح کسی ایسے ہی مجسمۂ مرمر کی خوابیدہ رُوح

کو جاگتے نہ دیکھا ہو! کتنی راتوں کی تاریکیوں نے فرامرز کے اُس مجسمہ مرمر کی ٹھنڈی رُوح کو گرمایا ہوگا! کتنے ایسے بوسوں کو جس میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک پوری عمر بسر ہوگئی ہو سجاد نے دُنیا کی تاریکی میں اُجالا کرتے دیکھا ہوگا کیا اُنھوں نے اپنے تصوّرات کی ناپیدکنار وسعتوں میں فرامرز کو اپنا مثیل یا اپنے کو فرامرز کا مثیل پایا؟ ــــــ اب وہ تمام وسعتیں سمٹ کر ایک مشتِ خاک بن چکی ہیں اور وہ مشتِ خاک ایک سر بمہر تودہ خاک کے اندر وہ سب کچھ سمیٹ کر لے گئی جو اُس کا تھا! سجاد کا ورثہ اب صرف یہ چند اوراق ہیں ــــــ کچھ وہ کہ گویا ایک صحن چمن ہے جس میں پھول مُسکرا رہے ہیں اور کچھ وہ کہ گویا کسی شہید کا خون آلود کفن ہے لالہ رنگ اور داغ دار! ــــــ بلکہ میں تو سجاد کے قلم کی گلکاریوں میں موسمِ بہار کا ایک تختۂ چمن دیکھتا ہوں کہ وہیں مسکراتے ہوئے پھولوں کے ہجوم میں ایک خون آلودہ کفن کے ٹکڑے بھی بکھرے پڑے ہیں! ــــــ مزاح اور طنز کی شوخیوں میں بھی سجاد کی غمگین روح کا عکس موجود ہے اور یہی ان کی فطری شعریت کا کمال ہے!

سجاد کی شعرگوئی ان اوراق میں میرا موضوع نہیں ہے تاہم جو کچھ اُوپر کہہ چکا اُسی کی آئینہ داراُن کی ایک نظم کے چند اشعار بھی پیش کیے دیتا ہوں۔ اس نظم کا عنوان ہے "بلبل" فرماتے ہیں:۔

نہالِ گُل پہ جو تیرا مکاں ہے اے بلبل ——— تو پھر یہ کس لیے شور و فغاں ہے اے بلبل؟
خروشِ جوئے بہاری ہے یا ہے خندہ گل ——— تو کس کے واسطے نالہ کناں ہے اے بلبل؟
عجب نہیں کہ جو یہ پوچھیں تجھ سے غنچہ دہن ——— بتا کہ کیا ترا دردِ نہاں ہے اے بلبل؟

کسی کو عشق کی تیرے خبر نہیں افسوس!
مرا قلم ہی ترا ترجمان ہے اے بلبل!

حقیقت یہ ہے کہ سجاد کی غمگین رُوح شکستِ آرزو کی ان طوفانی گرجوں سے اپنے لیے موسیقی حاصل کرتی تھی۔ اُن کا آغاز وہ تھا کہ اگر خود علیگڈھ کے دارالعلوم نے جہاں اُن کی نوجوانی کا بہترین زمانہ گزرا اُن کی قدر کی ہوتی اور اُن کو ایک علمی اور ادبی فضا میں سکونِ قلب حاصل کرنے کا موقع دیا ہوتا تو خدا جانے وہ کتنے بے مثل ادبی شاہکار لکھتے جن سے ہماری رُوحوں کے آتش خانے گرم ہوتے! لیکن ہرن کی پیٹھ پر گھاس لاد دی گئی اور سجاد کو دُنیا نے ادب کی محفل کی بجائے "ڈپٹی کلکٹری" کی کچہری میں دیکھا! شعر و ادب کے اُن چند لمحوں کو جنھوں نے اُن کی زندگی میں راہ پائی وہ عمر بھر ایک جنازے کی طرح اپنے کاندھے پر لیے پھرے ــــــ لوگ اُس جنازہ کے دوشالہ کی زرکاری کو دیکھنے لگے۔ یہ نہ دیکھا کہ اُس دوشالہ کے نیچے کوئی بہت پرانا ناسُور ہے! سجاد کی ادبی زندگی کا خون اُن لوگوں کی گردن پر ہے جنھوں نے اس بہتے ہوئے چشمہ کا رُخ باغ کی کیاریوں سے پھیر کر مینڈکوں کے اس تالاب کی طرف

بدل دیا جہاں ایک چلّو پانی پورا سمندر سمجھا جاتا ہے! اس طرح سجاد مرنے سے پہلے ہی مر چکے تھے ـــ مارے جا چکے تھے!

ــــــــ . ــــــــ

سجاد کی ادبیات میں اُن کا مخصوص اندازِ نگارش بہت نمایاں ہے۔ ترجموں میں بھی اور اُن کے طبعزاد افسانوں میں بھی، غالبؔ کی طرح اُنھوں نے بھی الفاظ کی نئی نئی ترکیبیں ایجاد کیں، ایک نیا اسلوبِ بیان ایجاد کیا اور دو دو چار چار لفظوں کے طبعزاد مرکبات میں قوتِ بیان کی تمام شدت کو مرکوز کر دینے کا ایک نیا انداز اختیار کیا۔ اُن کے اس "تجدد" کو جدید ترکی ادب سے بہت امداد ملی ہو گی لیکن اُردو زبان میں اپنے بیان کی روانی کے ساتھ ساتھ بظاہر مشکل مرکبات کو اس طرح کھپا دینا کہ وہ اُن کے بیان کی موسیقی سے ہم آہنگ ہو جائیں اُن ہی کا کام تھا۔ یہی اُن کی مخصوص انفرادیت تھی۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں:-

"چاہنے اور چاہے جانے کی ایک عمیق احتیاج میری رُوح کو مضطرب کر رہی تھی" "میں نے اپنی زندگی اپنی عصمت اپنی تمام دُنیائے امید تمھارے قدموں پر نثار کر دی تم نے اُنھیں کیا کیا؟ اُن میں سے ہر ایک۔ ایک بڑی مکافات ایک بڑی بڑی قیمتوں کی ارزش رکھتی تھی۔ کہاں ہے اُن کی مکافات؟"

"پلکوں کو اس قدر سیاہ بناؤ کہ اُن میں سے تمھاری نظر نکلے تو نورِ مخمور کی طرح نکلے"۔ "وہ غصہ جو رقابتِ عشق سے پیدا ہوتا ہے............ وہ دل کے ایک کونہ میں دل کی تاریکی سے صلح کر کے ملال کے ساتھ ترقی کرتا رہتا ہے"۔ "ہر رُوح اپنے مابقی نصف کو ہر خوب صورت چیز میں ڈھونڈتی ہے"۔ "ایسے آنسوؤں کے قطرے چاہے کیسی ہی شور و سنگلاخ زمین پر گریں ضرور وہاں ایک نہالِ شفقت اُگے گا"۔

ان مرکبات کا ایک سیلاب ہے جو سجاد کے بے تکان قلم سے بہ رہا ہے:-

"ابتسامِ مسرت۔ خندۂ جگر۔ آہِ خزاں۔ گردباتِ حیات۔ پرستیدۂ یگانہ۔ صمیمیت۔ اضطرابِ وجدانیہ۔ مجبوبۂ سودا انتما۔ عصبی بحران۔ حُسنِ تضرع۔ دستِ تغلب۔ محاکماتِ فکریہ۔ حیاتِ ساعیانہ۔ بیت القسوہ۔ نشوۂ مستی۔ ادائے تسلیمیت فجیعۂ حیات۔ فاجعۂ طولانی۔ مضحکِ خوف۔ رابطۂ مناسبات۔ ضربۂ بے وفائی۔ نوازش کار۔ خندۂ ضبار۔ سلسبیلِ قمر۔ صرصرِ رنگ و سحاب۔ عزمِ آہنین۔ حکمِ عدالت کی مہابت۔ طغیانِ غرور۔ قطرۂ سعادت۔ گرد بادِ آہنگ و رنگ۔ ادیبِ شہیر۔ فغانِ یاس۔ امیدِ گریزاں ـــ"

غالبؔ کی نظم کی طرح سجاد کی نثر نے ان مشکل اور گراں تراکیب سے قدیم اسلوبِ بیان کا شیرازہ بکھیر کر پڑھنے والوں کے ادراک کو ان مرکب الفاظ کی وسعتوں اور گہرائیوں کے قریب بُلایا۔ زبان کے نشو و نما کا یہ دَور اب گزر چکا ہے۔ پھر بھی بلند پایہ

ادبیات میں خندۂ جگر، حُسنِ تضرع، ضربۂ بے وفائی، خندۂ ضیاء، سلسبیلِ قمر، فغانِ یاس، امیدِ گریزاں اور گرد بادِ آہنگ و رنگ کی بلاغت اور عظمت کم نہیں ہوسکتی ہے! ادبیات کے یہ "تاج محل" ہر روز تعمیر نہیں ہُوا کرتے! لیکن جب کبھی دیکھیے تو تعمیر معلوم ہوتے ہیں ـــــ البتہ اب دُنیا کو ان تاج محلوں کے بنانے کی فرصت نہیں! تاہم باوجود اس کے کیا اُس قوتِ تعمیر اور اُس حُسنِ عمل کی عظمت کم ہوسکتی ہے جو تاج محل" کے معماروں کو نصیب ہوئی تھی؟

سجاد ایک ترقی پسند ادیب تھے! ـــــ کیا یہ کوئی عجیب دعویٰ ہے؟ بلاشبہ ترقی پسندی کے صحیح مفہوم کے اندر سجاد کا اندازِ نگارش "ترقی پسند" تھا اُنھوں نے اُردو ادب کو ترکی ادب کے ترقی پسند رجحانات سے متاثر کرکے قدامت کی زنجیریں توڑ دیں ـــ نہ صرف انشا پردازی کے اعتبار سے بلکہ مطالب کے اعتبار سے بھی انھوں نے اپنے پڑھنے والوں کو ترقی پسندی کا پیام دیا۔ اُن کے افسانوں کے تمام موضوعات بھی ایسے ہی ہیں اور خود اُردو زبان کے متعلق بھی اُن کے خیالات نے قدامت پسندی کی حدود کو توڑ دیا تھا۔ زبان کی ترقی اور تہذیب کے متعلق وہ قدیم راستوں سے ہٹ کر آگے بڑھنا چاہتے تھے اور یہ رجحان اُس خطبۂ صدارت میں بھی پوری طرح ظاہر ہوتا ہے جو اُنھوں نے ہندوستانی اکیڈیمی کی چھٹی کانفرنس میں پڑھا تھا اس خطبہ میں اردو زبان کی ترقی کے وسائل سے بحث کرتے ہوئے اُنھوں نے طباعت کے مسئلہ پر کہا تھا کہ:۔

"جب تک آپ لیتھو کے شکنجے سے اپنے اخبارات اور اپنی کتابوں کو آزاد نہ کریں گے میری رائے میں اُردو پوری ترقی نہیں کرسکتی .... سوائے ہندوستان کے اور ہندوستان میں بھی سوائے اُردو کے کہیں اخبار اور کتابیں لیتھو میں نہیں چھاپی جاتیں۔ ایران، مصر، ترکی، عربستان اور تو اور افغانستان اور حجاز بھی اُن تمام ممالک میں لیتھو کی چھپائی یک قلم موقوف کردی گئی ..... ہمارا ہندوستان ـ مَیں نے غلط کہا، ہماری اُردو، ابھی تک "پتھر کے زمانہ" میں ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھی!"

اُنھوں نے اپنے اس خطبہ کا بڑا حصہ ٹائپ کی اس بحث کے لیے وقف کیا تھا اور پھر اس بحث کو یہاں تک پہنچایا تھا کہ اُردو زبان کے لئے رومن رسم الخط اختیار کرلینے کی تحریک پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"ایک اور خیال مَیں نے بار بار آپ کے سامنے پیش کیا ہے ...... اب پھر آپ کو بہکانے اور آپ کے دردِ سر کا باعث ہونے کے لئے مَیں اُسی راگ کو الاپتا ہوں لیکن اس مرتبہ میری ہمت بڑھی ہوئی ہے .... نہایت مختصر طور سے عرض کردوں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ترکی کی طرح قانوناً ہندوستانی کا فارسی حروف یا ناگری حروف میں لکھنا بند کردیا جائے اور ہر شخص مجبور کیا جائے کہ وہ رومن میں لکھے پڑھے، نہیں، میری غرض یہ ہے کہ موجودہ فارسی خط اور ناگری خط جاری رہے مگر ساتھ ہی اس کے رومن کو بھی رواج دینے کی کوشش کی جائے"۔

اس مسئلہ پر مرحوم کی مفصل رائے ایک ضمیمہ کی صورت میں اُن کے خطبہ کے ساتھ ہی اکیڈیمی کے رسالہ کی اپریل ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ قطع نظر اس امر کے کہ یہ تجویز کہاں تک صحیح یا غلط یا قابلِ عمل یا ناقابلِ عمل ہے۔ سجاد مرحوم کے ان

رجحانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اُردو ادب کو ایک بین الاقوامی حیثیت میں دیکھنے کے کس قدر خواہشمند تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ٹیگور کے بعد سجادؔ ہی نے سب سے زیادہ اپنے ادب کو باہر کے (خصوصاً ترکی ادب کے) اثرات سے متاثر کیا۔ اُن کے زمانہ کا ترکی ادب "جدید ادب" تھا۔ وہ ادب تھا جو ترکوں کو نئی زندگی کے دروازہ تک لایا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جو نسبت ۱۹ویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ترکی ادب کو اُس کے عہدِ جدیدہ سے حاصل ہوئی وہی نسبت سجاد کی ادبیات کو کسی قدر کم درجہ میں، ہندوستان کے دَورِ جدید سے حاصل ہے —— کم درجہ میں اس لئے کہ مرحوم اپنی زندگی کا بہت ہی مختصر زمانہ نئے ادب کی تعمیر میں صرف کر سکے۔ بہرحال جو کچھ وراثت وہ اپنی زبان کے لئے چھوڑ گئے اُس کی قدر و قیمت سے انکار کرنا ناحق شناسی کا بدترین گناہ ہوگا۔ اُردو زبان ایک زندہ زبان ہے اُس کی باعمل رُوح سے یلدرم کی روح ہمیشہ بغل گیر رہے گی اور یہ ناممکن ہے کہ ہم اُردو ادب کی ترقیوں کا ذکر کریں اور سجاد کو بھول جائیں!

وہ آخری ملاقات مجھے یاد آتی ہے۔ ایک دن کہنے لگے "کیوں بھائی! یہ کیا بات ہے کہ اُردو زبان کے لئے اب کوئی دوسرا پریم چند پیدا نہیں ہوتا؟" میں نے کہا "کوئی پریم چند ہو یا اقبال ہو یا ٹیگور ہو۔ یہ نوع تو صرف ایک ہی پیدا ہُوا کرتی ہے!۔ قدرت شاہکاروں کے پیدا کرنے میں کبھی بھی فیاض نہ تھی!" —— ایک غمگین اور تھکی ہوئی مُسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے:۔ "اے کاش ......"! اور "اے کاش" کہہ کر رک گئے! —— میں جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ کیا کہتے! اس لئے گفتگو کا رُخ بدل دیا۔

بہرحال میرے پاس سجاد کی آخری یادگار اُن کی وہی غمگین اور تھکی ہوئی مسکراہٹ ہے جو اُس دن شام کو اُن کے ہونٹوں پر میں نے دیکھی تھی! آج جب میں اُن کے متعلق یہ چند اوراق لکھنے بیٹھا اور مجھے وہ آخری ملاقات یاد آئی تو اُن کے افکار کا آئینہ بنکر اُن کے وہی فلسفیانہ الفاظ پھر مجھے یاد آئے جو اُنھوں نے "سیل زمانہ" کو مخاطب کرکے لکھے تھے:۔

> "بہے جا! —— بہائے جا! نہ تجھ میں سلامتی نہ تیرے کنارے سلامتی! مٹے ہُوؤں کے نشان مٹائے جا!۔ تیراکوں کو ڈبا! غوّاصوں کو غرق کر! یہی تیرا کام ہے ...... بہتر یہی ہے کہ لاتعداد خس و خاشاک کی طرح جو مجھ سے پہلے آئے اور بعد میں آئیں گے، بہے جاؤں ......!
> پس اے سیلِ زمانہ بہے جا! بہائے لئے جا! اُس بہر پیدا ناکنارہ میں اُس عمانِ عظیم الشان میں، اُس اوقیانوس ابد میں، اب یا جب، تیرا دل چاہے مجھے گرا دے"!!

رشید احمد صدیقی

یلدرم کی یادیں!

اپنے رفقاء اور طلباء سے مجھے اکثر اس مسئلے پر "بحثنے" کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی نامعقول شاعر نہیں ہوسکتا۔ جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اُس میں فنونِ شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں۔ مرحوم اصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر میرے پیشِ نظر ہیں۔ اُنکی دل افروز شاعری اور انشاء پردازی تمام تر اُن کی دل آویز شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ میرے سامنے ایسے اشخاص بھی ہیں جو شاعر اور انشاء پرداز کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لیکن اُن کی شاعری اور انشاء پردازی میں خامی بھی اُسی حد تک ملتی ہے جس حد تک بحیثیت انسان یہ گھٹیا واقع ہوئے ہیں۔

میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ ایسا کوئی فن نہیں ہے جو انسان سے اُونچا یا اُس سے علیحدہ ہو۔

یلدرم علی گڈھ کے ساختہ پرداختہ تھے اور علی گڈھ کے اُس زمانے کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی تھی تو کچھ نہ تھی۔ نہ اب، جب زندگی سوا خوش باشی سب کچھ ہے۔ میں نے اُن کی طالب علمی نہ دیکھی لیکن علی گڈھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب

ع بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گذری تھی بہت!

جب سے اب تک زمانے کے رویئے اور روانی میں بہت کچھ فرق آگیا ہے کیسا کچھ فرق! جن قدروں پر جب مرنے والے لاکھوں تھے "اب اُن پر" رونے والا کوئی نہیں۔ لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جُداگانہ تھی۔ اُن میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی اور یہ اُن کی سیرت و شخصیت کا بہت اہم اور مہتم بالشان پہلو ہے۔

اُنھوں نے روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں اور سہیں۔ ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو یکسر زیر و زبر کر سکتی تھیں لیکن یلدرم میں فن کا ایسا اعتماد و امید آفرینی تھی کہ اُن کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ سیاسی فرائض بھی اُن کے سپرد ہوئے انتظامی اور ادبی بھی، لیکن وہ شروع سے آخر تک اور سر سے پاؤں تک شریف شاعر اور ادیب رہے۔

مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں سجاد حیدر اُس کے رجسٹرار رہے۔ اُنھوں نے مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب سر مزمل اللہ خاں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا وطیرہ جداگانہ تھا اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا، اُنھوں نے کام سب کے ساتھ کیا، سازش کسی سے نہ کی۔ میرے نزدیک یہی ایک بات یلدرم کی شرافتِ نفس اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

سجاد حیدر کو ڈپٹی کلکٹری راس آئی نہ رجسٹراری۔ وہ یونیورسٹی میں بھی رہے اور کالا پانی میں بھی۔ لیکن روزگار کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو گئے، لیکن کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی پاداش میں نہیں۔ جس کے بغیر کالا پانی کے تصوّر میں نہ گرمی آتی ہے نہ روشنی۔ اور یونیورسٹی آئے تو ایسے منصب پر جسے دُنیا بھر کی سرگرمیوں سے سروکار ہو سکتا ہے، اِلّا شعروادب سے۔ اس یونیورسٹی میں شعروادب کے دیوانے میں نے دو ہی پائے۔ دونوں ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو چکے ہیں۔ ایک مولانا احسن مارہروی۔ دوسرے سید سجاد حیدر یلدرم۔ ترکی، ترک اور ترکی ادب سے سجاد حیدر کو عشق تھا۔ ان کا نام آتے ہی اُن پر عجیب وارفتگی طاری ہوتی تھی۔ میں ترکی سے واقف نہیں ہوں، لیکن ترکی ادب سے آشنا مختلف اصحاب کے ترکی کے اُردو تراجم دیکھے ہیں۔ سجاد حیدر اور دوسروں کے ترجموں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ میں نے ایک بار سید صاحب سے پوچھا کہ ترکی ادب ہی جاندار ہے یا اس میں آپ کی شائبہ خوبیٔ تحریر کا بھی کچھ دخل ہے؟ ایک دفعہ جھوم ہی تو گئے۔ آنکھوں میں روشنی پیدا ہوگئی اور چہرہ جگمگا اُٹھا۔ کہنے لگے "جناب" (سید صاحب جوش میں آتے تو جناب کا لفظ ضرور استعمال کرتے اور اِس پر مخصوص انداز سے زور دیتے)۔ —— "ترکی زبان جانتے ہیں کس کی زبان ہے؟ ہماری آپ کی نہیں ہے"۔ میں نے بات کاٹ کر کہا "یہی تو میں کہہ رہا تھا کہ میری تو یقیناً نہیں ہے۔ آپ کی تو کہیں نہیں ہے"۔ مسکرائے اور بولے۔ "ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے اور اُنھیں کی ہو سکتی ہے۔ یہ اُن لوگوں کی زبان ہے جو نہ کبھی غلام رہے اور نہ کسی کو غلام رکھا۔ معرکہ آراؤں کی زبان ہے۔ اس میں ترک تازی ہے"۔ سید صاحب پر اب کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ چنانچہ اب وہ اپنے بس کے تھے نہ میرے۔

نامق کمال کا مشہور ڈراما "جلال الدین خوارزم شاہ" میری ہی درخواست پر سید صاحب نے اُردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ جس کا بیشتر حصّہ "سہیل" میں شائع ہوا۔ سید صاحب قلم کاغذ لیکر خود ترجمہ نہیں کرتے تھے بلکہ کسی کو مامور کر دیا جاتا۔ سید صاحب ترجمہ بولتے جاتے، وہ لکھتا جاتا۔ شاذونادر کہیں ترمیم کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ترجمہ پڑھتے جاتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مترادفات کیسے ہوتے لیکن جہاں تک اُردو الفاظ، فقروں اور ترکیبوں کا تعلق ہے، میں سید صاحب کے اس کمال کا معترف ہوں کہ وہ بڑے اچھوتے، بڑے جاندار اور بڑے گوارا اُردو الفاظ استعمال کرتے تھے۔ الفاظ کے انتخاب اور ترکیبوں کے اختراع کا ترجمے میں بڑا دخل ہوتا ہے اور یہ بات صرف کسی غیر معمولی مترجم کے حصّے میں آتی ہے۔ یہاں مجھے مولوی عنایت اللہ مرحوم دہلوی یاد آتے ہیں جن کا سا باکمال ترجمہ کرنے والا اُردو ادب میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں کو سمجھنے کی استعداد عنایت اللہ مرحوم میں خرقِ عادت کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ یہ بات اُنھیں کے حصّے میں آ بھی سکتی تھی۔ وہ اُردو کے گھوارے میں نہیں پلے تھے بلکہ اُردو اُن کے گھوارے میں پلی تھی۔ وہ اہلِ زبان ہی نہ تھے اہلِ تمدن بھی تھے۔

یلدرم نے ترکی سے تراجم زیادہ کئے ہیں۔ اُردو مضامین نسبتاً کم لکھے ہیں۔ ترکی انشاء پردازی کا انداز اُن میں کچھ ایسا رچ گیا تھا کہ اُردو لکھنے میں اُن کا قلم ترکی تال وسم قبول کر لیتا تھا۔ سید صاحب کے اِس رنگ و آہنگ پر بعض لوگوں میں چہ میگوئیاں بھی ہوئی ہیں، بذاتِ خود میں اُردو میں اِس اندازِ ترکانہ کو بڑا اچھا اضافہ سمجھتا ہوں۔

سید کے اسالیبِ انشا اور اُن کی موضوعات، سید کی شخصیت کی بڑی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ اُردو میں انشائے لطیف ...... کی ابتدا شرر، ریاض اور یلدرم کی تحریروں سے ہوئی۔ انشائے لطیف کا رشتہ کھینچ تان کر ملا وجہی کی "سب رس" سے بھی ملایا جاتا ہے، لیکن میرے نزدیک "سب رس" کا انداز متعزلانہ تصوف کا ہے، جو انشائے لطیف سے جوڑ نہیں کھاتا۔ انشائے لطیف نے آگے چل کر "ٹیگوریت" کا رنگ اختیار کر لیا اور ٹیگوریت نے اُردو میں سستے اور ادنیٰ درجے کی تحریروں کو اس درجہ عام اور مقبول بنایا کہ ثقاتِ ادب کو سختی سے احتساب کرنا پڑا اور یہ انداز جلد ہی نظروں سے گر گیا۔ یہاں تک کہ جو اصحاب اس کے سب سے بڑے حامی تھے وہ سب سے پہلے تائب ہوئے۔ اُردو میں ٹیگوریت کی جس طرح ابتدا ہوئی اور جیسا اُس کا انجام ہوا، مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے شعر و ادب کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے جس کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں۔

شرر اور ریاض کے عاشقانہ مضامین اور یلدرم کی انشائے لطیف میں فرق ہے۔ شرر کا اسلوب انشا اور اُن کا نفس دونوں کتابی ہیں، بندھے ٹکے، ڈھلے ڈھلائے، شخصی تاثرات کے ترجمانی نہیں، شاعرانہ زبان و بیان کی نمائش ملتی ہے۔ ریاض میں زبان بیان کا مظاہرہ شرر سے زیادہ غیر معتدل ہے۔ ریاض کی شاعری میں جو پُر تفنن لیکن سطحی شوخی ملتی ہے وہ اُن کی نثر میں پہنچ کر سستی اور عامیانہ بن گئی ہے۔ شاعری میں جو اندازِ بیان شاعری کا حُسن ہے وہ نثر میں پہنچ کر مصنوعی اور مہمل ہو جاتا ہے موضوع اور سطحِ نظر کے یکساں ہونے کے باوجود نثر اور نظم کی مقتضیات میں فرق ہے۔ ریاض اور ناصر علی دہلوی نے اس امتیاز کو اپنی اپنی نثر میں نظر انداز کر دیا ہے۔

یلدرم کے ہاں بھی حُسن و محبت کا کاروبار ہے لیکن یلدرم میں مجاز کی طرفگی و تازگی ہے۔ شرر اور ریاض کی پیداوار یکسر مشینی ہے سجاد کی دستی سجاد انصاری کو بھی انشائے لطیف کا پیرو قرار دیا جاتا ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ سجاد انصاری کے یہاں نفسیاتی تحلیل ملتی ہے جس کو انشائے لطیف سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ انشائے لطیف اور غزل سرائی کا سرچشمہ ایک ہے۔ بقولے ع وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے

لیکن جس طرح غزلوں میں آرٹ اور اقدار کے اختلافات ملتے ہیں، ادبِ لطیف میں بھی یہ امتیازات نظر آتے ہیں۔ یلدرم اور ادبِ لطیف کے بعض دوسرے عَلَم برداروں میں، یہ فرق واضح ہے۔ سجاد حیدر کے ہاں شوخی بھی ہے، شرارت بھی، لیکن شہد پنام کو بھی نہیں۔ یلدرم کے ہاں عورت کا بڑا عمل دخل ہے لیکن ان کے ہاں خیالات کی رعنائی ملتی ہے۔ اعصاب کا تشنج نہیں۔ مہدی افادی کے ہاں خیالات کی رعنائی اتنی نہیں ہے جتنی جذبات کی رنگینی۔ مہدی کے اعصاب پر اگر عورت سوار نہیں ہے تو کچھ پیدل بھی نہیں ہے۔ افادی کہیں کہیں تو شوق کی مثنویوں سے جا ملے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں کی تحریروں میں جہاں تک عورت کا تعلق ہے مراتبِ جنسی کا اُتنا ہی فرق ہے جتنا تفاوتِ زمانی کی بنا پر ہونا چاہیے۔ اگر ان دونوں کو ایک دوسرے کے عہد میں منتقل کر دینا ممکن ہوتا تو مہدی شوق بن جاتے اور شوق، مہدی۔!

سجاد حیدر کی تحریروں میں ایک بات نہایت واضح طور پر ملتی ہے یعنی وہ جذبات کی رَو اور روانی میں کبھی اپنے ذہن اور وقار کو بہہ نہیں جانے دیتے۔ سجاد صاحب کے جذبات کچھ زیادہ تیز اور تند نہ تھے۔ جس کے ہاں خیالات کی رعنائی ہو اُس کے ہاں جذبات کا ہیجان و طغیان یوں بھی کم ہوتا ہے۔ پھر بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آ گئے ہیں، سجاد صاحب نے ایک ہلکی جنبشِ قلم سے اُن کو معتدل کر دیا

اس طور پر معتدل کیا ہے کہ اظہارِ مطلب میں کوئی فرق نہ آیا اور شرم و شرافت کا دامن بھی داغدار نہ ہوا۔

میرے نزدیک انشائے لطیف میں خیال کی رنگینی و نزاکت کے ساتھ جذبے کی متانت و عفت کو جس طرح یلدرم نے
توازن رکھا ہے، کسی اور نے نہیں رکھا ہے سجاد حیدر کی تحریروں میں جذبات سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی ہے۔ قاضی عبدالغفار اس
بارے میں یلدرم سے ملتے جلتے ہیں لیکن دونوں کی ذہنی پرداخت میں تفاوت ہے۔ غفار کی تحریر میں طنز کی تیزی و تلخی بھی شامل رہتی ہے۔ اس
بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عبدالغفار، سجاد حیدر کے بجائے سجاد انصاری سے زیادہ قریب ہیں۔ مجھے اکثر یہ محسوس کر کے خوشی اور اطمینان
ہوا ہے کہ انشائے لطیف کے تین بڑے اچھے اور مکمل نمونے ہمارے یہ تین چوٹی کے انشاء پرداز بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ سجاد
حیدر، سجاد انصاری اور قاضی عبدالغفار!

بعض اعتبار سے سجاد حیدر شروع سے آخر تک نوجوان رہے۔ وہ اُس زمانے میں بھی جوان تھے جب جسم و جان کے اعتبار سے
ضعیف و نزار ہو چکے تھے۔ تعلیمِ نسواں، اُردو ٹائپ، اسالیبِ شاعری میں نئے تجربات اور اس قبیل کی اور باتوں میں اوائلِ عمر سجاد حیدر
ترقی پذیر واقع ہوئے تھے۔ اُردو ٹائپ کو مقبول بنانے میں تمام عمر کوشاں رہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی نئی شاعری کے بڑے مدّاح
تھے اور اُن کی ایک مخصوص نظم بڑے مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔

کسی زمانے میں ایک فارسی مجلّہ "ایرانشہر" نامی برلن سے ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ اُس کا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا۔
اس سلسلہ میں ایک لطیفہ مجھے کبھی نہ بھولیگا۔ سجاد صاحب اپنی کوٹھی سے دفتر آرہے تھے۔ سر بمہر بہت سارے لفافے کاغذات کے کچھ
منتشر اجزا ایک آدھ اخبار و رسالے بغل میں دبا کر ایک رسالہ پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ میں اُن سے کوئی ۲۰، ۲۲ قدم پیچھے آرہا تھا۔
کی خبر سجاد صاحب کو نہ تھی۔ سید صاحب کے چلنے کا خاص انداز تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے۔ رفتار اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی، ہموار، کسی قدر
چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے تھے۔ نگاہ نیچی، تقریباً عمودی، دس بارہ قدم چل کر ایک ذرا کی ذرا رُک سے جاتے اور ٹھیک سامنے ایک اچٹتی
نظر ڈال کر پھر گرم رفتار ہو جاتے۔ اِس پر اُن کے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چست کیا تھا کہ "سجاد تم چلنے میں سانپ کو
شرماتے ہو۔ وہ بھی چلتے چلتے رُک جاتا ہے۔ سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر چل دیتا ہے"۔ اِس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے
کہنے لگے "سانپوں میں رہ کر صرف سانپوں کی چال آئی۔ اس کی تعریف نہ کروگے"؟ اُسی انداز سے چلے جا رہے تھے کہ یکایک ایک لفافہ سرک
کر زمین پر آرہا۔ سجاد صاحب کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ میں نے اُٹھا لیا۔ کچھ ہی دُور آگے بڑھے تھے کہ دوسرا لفافہ گرا۔ وہ بھی میں نے اُٹھا لیا۔
دار العلم کے قریب پہنچ کر تیسرے لفافے نے مفارقت کی۔ وہ بھی میں نے قبضے میں کیا۔ سجاد صاحب برابر رسالے کے مطالعے میں منہمک رہے۔
سجاد صاحب کے پیچھے میں بھی یونیورسٹی آفس پہنچا۔ آفس پہنچکر موصوف نے بچے ہوئے لفافے متعلقہ لوگوں کے حوالے کئے۔ معلوم ہوا تین لفافے
نہیں۔ چونک پڑے اور تھوڑی دیر تک سخت متفکر رہے۔ میں نے تینوں لفافے کچھ وقفے سے واپس کئے۔ سید صاحب فرمانے لگے کہ "آپ بھی کمال کرتے ہیں،
کیوں نہ دیدیئے"۔ اُس وقت مجھ پر کیا گزر گئی۔ میں نے کہا "آپ مطالعے میں منہمک تھے، میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا"!

میرا یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے۔ فرمایا "خوب یاد دلایا۔ یہ ملاحظہ فرمائیے "ایرانشہر" ہے۔ ٹائپ میں کتنا ستھرا چھپا ہے اور
کیا اچھے اور جاندار مضامین و نظمیں ہیں۔ ایرانی وطن پرستوں نے برلن سے اسے شائع کیا ہے۔ کاش اردو میں ایسا پاکیزہ اور
ٹائپ رواج پا جائے اور جناب بات تو یہ ہے کہ جب تک آپ "بت سنگی" (لیتھو کی چھپائی) سے رشتہ نہ توڑینگے اُردو کی اشاعت

مسدود رہیگی"۔ میں نے کہا "سید صاحب "بتِ سنگی" کا تو ہمارے شعر و ادب میں ایک درجہ بھی ہے۔ "بتِ آہنی" میں کیا رکھا ہے" بقول شخصے ع "حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا"!

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا "یہی تو ستم ہے۔ آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اچھی بھلی باتوں میں بھُس ملا دیتے ہیں۔ اکبر نے ٹائپ کی خواہ مخواہ مٹی پلید کردی"۔ میں نے عرض کیا "سید صاحب! اکبر نے کہیں بھُس نہیں ملائے، حرف بھُس میں چنگاری لگائی ہے"۔ ہنسے، پھر فرمایا "اور جناب بھی تو کچھ دُور نہیں کھڑے ہیں"!

سید صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ یلدرم کوئی غیر معمولی شاعر نہ تھے۔ اُنکی سب سے پہلی نظم "مرزا بھویا" بتائی جاتی ہے۔ اس میں شاعرانہ خوبیاں کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن گزشتہ علیگڈھ کی زندگی کے بعض دلکش پہلو لطیف انداز سے بیان کئے گئے ہیں۔ ہلکی پھلکی تفریحی نظموں میں اس کو اچھا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ سید صاحب کی نقاشی، نازک خطوط اور ہلکے رنگوں کی ہے۔ اُن کا مزاج رومانی تھا۔ وہ رومان جو انسان کو بلندی کی طرف لیجاتا ہے، پستی کی طرف ہرگز نہیں۔ موجودہ عہد میں رومان کی حیثیت مسخ کر دیگئی ہے۔ اسکو مزاج و خیال کی رنگینی کی بجائے مطالباتِ جنسی قرار دیا گیا ہے۔ وہ بھی اس طور پر کہ جو چیز صحت کی دلیل تھی وہ مستقل (اور لا علاج) مرض قرار پائی۔

سجاد صاحب کی ایک نظم جو اُنکی رنگینی، رسائی طبع، سیرت کی پاکیزگی اور اُنکے نقطۂ نظر کی دلآویزی کی ترجمان ہے، شملہ کالکا لائن پر ایک نظارے کے عنوان سے سب سے پہلے "سہیل" میں شائع ہوئی۔ سید صاحب کی یاد کے ساتھ نظم ہمیشہ وابستہ رہے گی ؎

ماتھے پہ بندی	آنکھ میں جادو
ہونٹوں کی بجلی!	گرتی تھی ہر سُو
چال لچکتی!	بات لہکتی
جیسے کسی نے	پی ہو دارُو
انکھڑیاں ایسی	جن میں تھے رقصاں
لمحے میں رادھا	لمحے میں راہو
ایسی پھڑکتی!	خلق تھی حیراں!
ریل پر آیا،	کہاں سے آہو؟

سجاد صاحب کو جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ترکی، ترکی ادب اور ترکوں سے والہانہ شغف تھا۔ ان میں سے کسی کا نام آجاتا تو سید صاحب وجد میں آجاتے۔ جس زمانے میں وہ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے، ایک بار اُنکو ٹرکی جانے کا موقع مل گیا! میں کیا بتاؤں اُن پر کیا نشاط طاری تھا۔ صحت اچھی نہ تھی۔ میں نے کہا سید صاحب سفر طویل ہے تکلیف دہ بھی، کیسی گزریگی؟ فرمایا۔ ٹرکی کے خیال میں طبیعت مگن ہے یہ شگون اچھا ہے اور ہر اعتبار سے اچھا۔ یا یہ خاک وہاں کی خاک میں مل جائیگی یا پھر دیکھئے گا کیسا رقصاں و شاداں واپس آتا ہوں۔ چند ماہ بعد واپس آئے۔ سید صاحب یوں بھی سبک رفتار تھے۔ واپسی پر ایسا معلوم ہوتا جیسے پاؤں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہیں، جسم میں توانائی، چہرہ پر بشاشت اور سُرخی آگئی تھی۔ میں نے پوچھا ٹرکی میں کوئی تبدیلی پائی؟ فرمایا شروع

سے آخر تک تبدیلی ہی تبدیلی نظر آئی۔ لیکن مجھے تو ترکی سے اُلفت ہے۔ بدلنے نہ بدلنے سے کیا سروکار!

ترکی ادیبہ، خالدہ خانم اور اُن کی ابتدائی تحریروں کے بڑے دلدادہ تھے۔ موصوفہ علیگڑھ تشریف لائیں تو یونین میں سجاد صاحب نے اُن کا خیر مقدم کیا اور ضمناً موصوفہ کے ابتدائی مضامین اور انشاء پردازی کو بڑے لطف سے سراہا۔ خالدہ خانم نے فرمایا۔ کہ اب وہ اپنے اگلے اسلوبِ انشار سے تائب ہو گئی ہیں اور اُسے صرف ایامِ جہالت کی یادگار سمجھتی ہیں۔ سجاد صاحب خاموش ہو گئے۔ بعد میں ایک صحبت میں اس واقعہ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے، خالدہ خانم کو کیا معلوم، اُن کی ایامِ جہالت کی باتوں نے کیا شگوفے کھلائے پھر خلطِ مبحث سے کیا حاصل۔ سوال یہ نہیں ہے کہ خالدہ خانم کو کیا پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ میں کیا پسند کرتا ہوں۔

سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے۔ اُن کو توڑ جوڑ بالکل نہ آتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سُنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ ایک سچے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وہ اہلِ مناصب سے کبھی مرعوب نہ ہوئے لیکن فن کے کمال کی داد دینے میں بڑے سخی تھے۔ سیّد صاحب کو میں نے شاید کبھی "تم" کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سُنا ہو۔ اُنھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو ذاتی رفعت اور منفعت کا کبھی وسیلہ نہیں بنایا۔ اُن کو میں نے برہمی میں آپے سے باہر نہ پایا اور ہنسی دل لگی میں اُن کے منہ سے کبھی ایسے الفاظ نہ سُنے جو مذاقِ سلیم پر بار ہوں۔ یلدرم جیسے کڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب اُن میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں۔ اُن آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حُسن کا حامل ہوتا ہے۔ بغیر کسی ارادے یا تکلّف کے ایلدرم میں رسمی تکلف بالکل نہ تھا۔ اُن کی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اُس حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقے کا تقاضا ہوتا تھا۔ اور بے تکلف بھی اُسی حد تک ہو سکتے تھے جس حد تک بے تکلفی، حسنِ معاشرت کا جزوِ اعظم سمجھی جاتی ہے۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جو اُونچی سے اُونچی اور بڑی سے بڑی صحبتوں میں ہماری اور خود اپنی نمائندگی کر سکتے تھے۔ شعر و ادب کا اُن کا ذوق محض فطری نہ تھا بلکہ وہ شعر و ادب کے رنگ و رفتار پر حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے۔ وہ اچھی اور بے تکلف انگریزی لکھتے تھے۔ جو بات اُن کے عہد کے ہندوستانیوں میں بہت کم ملتی ہے۔ اُن کی قدر کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا۔ شعر و شرافت کے جو لوگ حامل یا قدردان تھے وہ تمام کے تمام خواہ ہندوستان کے کسی گوشے میں ہوں، یلدرم سے واقف اور اُن کی خوبیوں کے معترف تھے۔

سجاد حیدر اُن لکھنے والوں میں تھے جن کا قائل نہ ہونا کم سواد ہونے کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ تک یک رنگی اور توازن ہو۔

وہ ہم سے جُدا ہو گئے، لیکن ہم اور ہمارے بعد آنے والے اُن سے کبھی جُدا نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے، فردوس میں اُن کو وہ رنگینیاں اور نزہتیں بھرپور نصیب ہوں گی جن کی صرف جھلکیاں اُن کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں —!

پطرس بخاری
مترجمہ قرۃ العین حیدر

سیّد سجّاد حیدر

ہمارے موجودہ شور و رستاخیز میں سجاد حیدر کا سانحہ کچھ دب کر رہ گیا۔ اسے محسوس کیا تو صرف انھیں لوگوں نے جن کے لیے ان کی موت ایک ذاتی صدمہ تھی۔ یہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا اس پر کوئی نعرہ چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ واقعہ کہ ان کی موت پر اتنی خاموشی رہی المناک ضرور ہے۔ اُردو ادب پر ان کا اثر بہت عظیم تھا۔ بڑی شوخی اور بڑے لطف کے ساتھ انھوں نے اُردو زبان و ادب کے بوڑھے چہرے کو جوانی اور تروتازگی بخشی اور گو اُن کے تجربے کی جسارت کو اب تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے لیکن رنگ و روپ کی بہت سی لطافتیں جو انھوں نے پیدا کیں ابھی باقی ہیں۔

انھوں نے بہت زیادہ نہیں لکھا۔ ان کی تمام تخلیقات جو کتابوں کی صورت میں شائع ہوئیں، سالگرہ کے ایک کم قیمت تحفے کے طور پر ایک چھوٹے سے ستھرے پیکٹ میں سما سکتی ہیں۔ چند افسانے اور مختصر ناول چند ڈرامے کچھ مضامین تنقیدی یا محض مقالات کچھ ہلکے پھلکے خاکے شاید کچھ نظمیں اور بس۔ اس کے علاوہ جو کچھ انھوں نے لکھا ——— اور وہ زیادہ نہ تھا ——— وہ اس دَور کے مقتدر ماہناموں، مخزن، علیگڑھ میگزین اور معارف کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے اور ان کے مسودات میں چند ایک "کبھی کبھار" لکھی ہوئی نظمیں بھی ضرور موجود ہوں گی جو شائع کبھی نہ ہوئیں۔

وہ بھاری بھر کم نہیں بلکہ رواں و جواں ادیب تھے لیکن معمولی ہرگز نہ تھے۔ اتنا ہمیں بھی معلوم ہے کہ ان کے ادب کی زندگی اور مداح چند روزہ نہیں۔ "خیالستان" ان کی سب سے مشہور تصنیف ہے۔ ان کی ترتیب اور عنوان دونوں کا خیال انھیں ان کے ادبی دوست اور مداح میر غلام بھیگ نیرنگ نے دلایا تھا اور یہ مجموعہ اپنی اشاعت کے چند ہفتوں کے اندر اُردو کی ایسی مقبول تصنیف بن گیا جو بڑی رغبت سے بار بار پڑھی گئی۔ آج ہم اس سے ایک سنگ میل کی حیثیت سے واقف ہیں اور جب ادبی فیشن بدلے گا اور شاید لوگ خیالستان کے شستہ اور شائستہ حسن کی طرف متوجہ نہ ہوں گے اس وقت بھی ہمیں ادبی مطالعہ کی خاطر اس کتاب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور ہمیں ان خصوصیات کا سُراغ ملے گا جنھوں نے بڑی حد تک، اُردو کو اس کا دم خم اور لوچ بخشا ہے۔

سجاد حیدر نصف صدی سے کچھ زیادہ عرصے تک زندہ رہے۔ جوان ہو کر انھوں نے خود کو ہندوستانی مسلمانوں کے تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے تموّج میں رواں دواں پایا اور اگر آپ اس سے کم جوشیلے الفاظ برتنا چاہیں تو یہ کہیے کہ وہ

مسلمانوں کی نئی خود آگاہی کے دھارے میں شامل تھے اور اختتام صدی کے اس عہد انقلاب میں ان کا دم قدم بھی شریک تھا جس میں اس ملک کے مسلمان داخل ہو رہے تھے۔ وہ اس دور کی پیداوار بھی تھے اور سمبل بھی۔ انھوں نے علیگڑھ میں تعلیم پائی اور ساری دنیا میں ان کو نہایت فخر کے ساتھ اس دل پذیر گروہ میں شامل سمجھا گیا جس نے اس مرکز سے باہر آکر ایک نئے مسلم طرز فکر اور طرز زندگی کی تحریک کی تزئین کی۔ ابھی ہم اس عہد سے اتنے قریب ہیں کہ غالباً آسانی سے یہ نہیں جان سکتے کہ اس تحریک و تزئین کی قدر و قیمت کیا ہے۔ لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے مورخ کو اس اولین دور میں اس قومی وجاہت اور امید کو دوبارہ حاصل کرنے کی تمنا ضرور کارفرما نظر آئے گی جو سلطنت مغلیہ کے آخری نام لیواؤں کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنی زندگیوں میں کھو چکے تھے۔

اقتدار کی خواہش بعد کے عہد میں پیدا ہوئی اور اس میں سجاد حیدر اور ان کے ہم عصر شریک نہ تھے۔ لہٰذا عمرانیات کے لحاظ سے اقبال کے برعکس سجاد حیدر موجودہ دور سے تعلق نہیں رکھتے۔ اقبال دونوں ادوار میں شامل تھے چنانچہ عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ لوگوں کی زبانوں پر رہے لیکن سجاد حیدر کی ادبی اہمیت بہر صورت قائم ہے۔

وہ اس نسل کے فرد تھے جس نے مسلمانوں کی زندگی میں ایک ترکیب نو پیدا کرنا چاہی۔ اس کے اجزائے ترکیبی قدیم و جدید مغرب اور مشرق، سائنس اور مذہب عربی اور انگریزی پر مشتمل تھے۔ یہی نظریہ تھا جس نے علیگڑھ اکیڈمی کے لئے "اینگلو اورینٹل" کا نام اختراع کیا۔ اس نظریے کے چند مظاہر نے اکبر الہ آبادی کے ایسے لوگوں کو بہت طول کیا مگر وقت آگے بڑھتا گیا۔ اور جدید مدنیت کے پیمبر اپنے مشن میں کامیاب رہے۔

اس جدید مدنیت و شائستگی کے لئے سجاد حیدر نے ایک متناسب اور مناسب طور پر ترقی پسندانہ نگارش جمیل سے اردو زبان کو روشناس کیا۔ ترکی ٹوپی، مغل شیروانی اور انگریزی پتلون میں ملبوس نوجوان ادیبوں کی ایک پوری نسل اس طرز تحریر کی طرف جوش و خروش سے لپکی۔ گویا صرف یہی چیز تھی جس کا وہ اب تک انتظار کر رہے تھے اور یہ واقعہ بھی تھا۔ اس میں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی انھیں آرزو تھی۔ یہ آرزو تھی مگر ساتھ ہی ساتھ اس میں ایک واضح مغربی رنگ بھی موجود تھا۔ الفاظ عربی اور فارسی کے تھے ——— لیکن ——— اسے دیکھئے ——— پل کی پل میں ان الفاظ کی "سختی اور بھاری پن غائب ہو گیا ——— " گویا کسی نے ملٹن کے زور بیان میں آسکر وائلڈ کے رنگ کی آمیزش کر دی ہو۔

قومی نوجیون کے ساتھ تجدید ماضی کے خواہشمند نوجوانوں نے اس نئے انداز تحریر کو بڑے غرور اور بڑے پیار سے اپنایا ——— ان کو مسرت اس بات کی تھی کہ یہ طرز تحریر نفیس، ترقی پسند، نرم و نازک اور آزاد خیال تھا۔ مغرور اس وجہ سے تھے ——— کہ یہ طرز تحریر قوم کے شاندار ماضی سے بھی وابستہ تھا، مشرقی تھا۔

ترکی نئے امتزاج کا سمبل تھا ——— ترکی جو مشرق اور مغرب کے تہذیبی سنگم پر واقع تھا یا کم از کم لوگ یہی تصور کرتے تھے لہٰذا یہ بات معنی خیز ہے کہ سجاد حیدر نے اتنی لگن کے ساتھ ترکی یا کم از کم ہندی مسلمانوں کے اس آدرش کی اپنی تحریروں میں جھلک دکھلائی

ان کی بیشتر کہانیاں اور ڈرامے تراجم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اصل تصانیف سے اُن تراجم کا مقابلہ کیا گیا ہے یا نہیں اس لئے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سجاد حیدر نے اپنے آپ کو صحیح معنوں میں مترجم کی ہی حیثیت سے پیش کیا ہے یا یہ محض ان کا حسنِ بیان ہے یا محض انکسار جو انھیں ایک نئی تکنیک برتنے کی معذرت کے طور پر برتنا پڑا۔ چند داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے شبہ ہے کہ یہ تراجم دراصل تقریباً طبعزاد تخلیقات ہیں اور جیسا سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ اوریجنل واقع ہوئی ہیں۔ ان کی ترغیب سجاد حیدر کو ترکی کے معاشرتی پس منظر نے دلائی۔ کیونکہ جدید مدنیت یورپین کے بجائے ترکی لیبل کے ساتھ کہیں زیادہ دل آویز نظر آسکتی تھی۔ گویا مسلمان نوجوان اپنے تصورات کو ایسے انداز میں پیش کرنا چاہتا تھا جنھیں اجنبی نہ کہا جاسکے۔ اس دَور سے پورم پور تعلق رکھنے کی وجہ سے سجاد حیدر نے خود اس کشش کو محسوس کیا اور اسے ایک ادبی رُوپ میں ڈھال کر اپنی نسل کے نثر نگاروں کے سامنے ایک ایسے دلنشین سمجھوتے کی شکل میں پیش کر دیا جسے نہایت جوش کیساتھ قبول کیا گیا۔ انھوں نے ایک ترکی قلمی نام یلدرم اختیار کیا جس نے قلمی نام اختیار کرنے کے نئے فیشن کی بنا ڈالی۔ یہ تفصیل گو غیر اہم ہے لیکن اپنی جگہ پر ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس عہد میں الفاظ کے نت نئے رُوپ دریافت کئے جا رہے تھے۔ نئے سمبل تلاش کئے گئے جنھیں تصورات اور نئے آدرشوں کے اظہار کے لئے تراشا اور سنوارا گیا۔ نئے رجحان، نئے جذبات و احساسات، نئی پُر مسرت اور تخلیقی طرزِ زندگی کے حصول کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ پرانے لیکھکوں نے نئے ادب عالیہ اور قدیم کلاسک کھود نکالے اور وطن پرست سیاحوں اور محققوں کی مانند ہمیشہ نئے نئے خزانے لے کر اپنے دیس کو لوٹے۔ ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان، اقبال اور ان سے زیادہ واقعیت پسند مصنف ــــ شبلی، نثر نگار حالی اور سر سید احمد خاں ــــ سب کے سب کسی نہ کسی طور پر زبان کو مالا مال کرنے کی خاطر دُور دُور کی سیاحتوں پر نکلے۔ سجاد حیدر کا میدان ان کے مقابلے میں زیادہ بے تکلف اور ذاتی ہے۔ شائستہ، خوش ذوق اور پُر تکلف طرزِ معاشرت، شستہ مذاق، رعنائیِ خیال، نزاکت جذبات اور رومانی حُسن کے اظہار کے لئے سجاد حیدر ۔۔۔ نے ایک نئی زبان کا تار و پود جمع کیا اور اسے پروان چڑھایا اور اُردو نثر کو ایک ایسی مدھرتا عطا کی جو اب تک محض شاعری سے ہی منسوب کی جاتی تھی۔ انہوں نے زبان کو ایک نیا ترنّم اور آہنگ اور وزن بخشا جس نے بہت سے خوابیدہ جملوں کو جگایا اور اس بے کیفی اور مجہولی کو دُور کیا جو نثر پر چھا چکی تھی۔

یہ ایک ایسا دل آویز موضوع ہے کہ بری طرح جی چاہتا ہے اس پر تفصیل سے گفتگو کیجئے۔ مگر یہ سطور ایک ایسے دلکش اور جوان طبیعت ادیب کے لئے نذرِ عقیدت کے طور پر لکھی گئی ہیں جو اب دُنیا میں موجود نہیں رہا۔ یہ تنقیدی جائزہ نہیں ہے اور میں اس کی کوتاہیوں کا معترف ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میرے پڑھنے والے کیفی ان کوتاہیوں سے چشم پوشی کریں گے۔

امتیاز علی تاجؔ

انشائے سجاد

زبان قاری یا سامع کے ذہن کو دو طرح متاثر کرتی ہے۔ ایک تو حروف الفاظ کے ذریعے ذہن میں ایک معنی خاص منتقل کرتی ہے۔ دوسرے اصوات الفاظ کی امداد سے غیر محدود خیالات کی محرک ہوتی ہے۔ جہاں تک سامع کے علم کو دخل ہے۔ مدلولاتِ الفاظ سے صرف ایک معنی خاص مفہوم ہوتے ہیں۔ مگر التزاماً مدلولاتِ الفاظ کے متعلق بہتیری دوسری صفات کا بھی علم حاصل ہوتا ہے۔ جب زبان کے یہ دونوں اثر یعنی معنی اصلی اور لوازم و متعلقات یا ادراک مطلب و احساس کیفیت ایسی مساوی قوت سے عمل کرتے ہوں کہ قاری یا سامع کے ذہن پر بجائے اس کے کہ دو جداگانہ اثر پڑیں۔ دونوں مدغم و منضم ہو کر اثر واحد کا حکم رکھتے ہوں تو ایسی زبان بلحاظ فصاحت ایک "اندازِ خاص" رکھتی ہے۔ لیکن اگر صرف حروف الفاظ کے ذریعہ ذہن میں ایک معنیٰ خاص مفہوم ہوتے ہیں۔ لیکن بذریعہ تجنیس یا نغمۂ اصوات اس معنیٔ خاص کو ذہن نشین یا زیادہ واضح کرنے کے لئے کوئی مدد نہ پہنچے تو وہ اسلوب "اندازؔ[1]" سے معرا رہے گا۔ ایسی صورت میں زبان سے مخاطب کے ذہن پر ایک ایسا اثر واقع ہوگا جو واحد نہیں بلکہ دو جدا جدا اثر ہیں۔

خیالستان کے تمام مضامین "انداز" کے مندرجہ بالا اوصاف سے مالا مال ہیں مثلاً "سودائے سنگین" کے اس فقرے میں کہ "اہرمن اپنے لمبے ہاتھوں کے لمبے ناخن بڑھا بڑھا کے گاڑ گاڑ کے سینۂ ظلمت کو پھاڑ رہا تھا"۔ جہاں الفاظ کے معانی سے ایک خاص مفہوم دماغ کو معلوم ہوتا ہے، وہاں محض "ڑ" اور "ل" کی اصوات سے بھی معانی کو ایک ایسی مدد ملتی ہے کہ برسات کی بادلوں والی رات کی کیفیات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔

یا مثلاً اس فقرے کی جگہ کہ "رات کی تاریکی میں لرزتی لرزتی اپنے کرہ کو لڑھکاتی اور آتے وقت قدمیں بڑھتی بڑھتی آتی ہے"۔

اگر سجاد صاحب لکھتے کہ "رات کی سیاہی میں کانپتی اپنے کرہ کو ڈھکیلتی اور آگے آہستے وقت قدمیں لمبی ہوتی ہوئی آتی ہے" تو گو معانی میں تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ لیکن اصوات الفاظ سے جو فقرے میں ایک وحشت کی تھرتھری پیدا ہوگئی ہے وہ بالکل مفقود ہو جاتی۔

---

[1] Style

سید سجاد حیدر صاحب ہر جگہ موقع کے مناسب الفاظ استعمال کرنے میں بہت محتاط رہتے ہیں۔ کہیں وہ ایسے الفاظ تلاش کر کے لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں کہ جن کی اصوات اُن کے معنوں کا سُراغ دیتی ہیں۔ کہیں آپ صرف ایک موزوں لفظ یا نفیس و نازک ترکیب سے فقرے میں زندگی کی لہر پیدا کر دیتے ہیں اور بعض اوقات اُن کے الفاظ ائتلاف کا ذہنی عمل بیدار کر کے پڑھنے والے کے معمولی تجربات و مشاہدات کو ایک عجیب دلکش روشنی پیش کرتے ہیں۔ خیالستان کا ہر صفحہ اس قسم کی مثالوں سے پُر ہے۔ جن میں سے چند ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

۱۔ تیر ایک ہوا چاک سرسراہٹ سے اس کی طرف گیا۔

۲۔ ادھر سلسبیلِ قمر اس کے بدن پر پڑ رہی تھی۔

۳۔ بدھا رواں بادلوں پر نظر گاڑ کر سوال کا جواب دیتا۔

۴۔ یہ صرصرِ رنگ و سحاب سمندر کے کنارے رُک گئی۔

۵۔ اس آواز میں ایک عزمِ آہنیں کی قوت، ایک حکم عدالت کی مہابت موجود تھی۔

۶۔ اس کے دل میں ایک طغیانِ غرور اُٹھا۔

۷۔ جس کی ہیئت کذائی سے بوئے فحش کے بھبکے نکل رہے تھے۔

۸۔ دو آنسو کے قطرے، دو قطرۂ سعادت ڈھلک رہے تھے۔

۹۔ ان سب چیزوں کو لرزشِ حیات دینے والی موم بتی تھی۔ جس سے مختصر سی روشنی نکل رہی تھی۔

۱۰۔ وہ شفقت و رقت، روحانیت و انسانیت کی دیوی ماں۔

صورت و معنی کا کامل اتحاد اس قدر الفاظ پر منحصر نہیں جس قدر ان کی ترتیب پر موقوف ہے۔ فنِ تحریر میں دیگر فنون کی طرح سب سے پہلا کام الفاظ کا انتخاب ہے اور اس کے بعد ایک نمونہ خاص کے مطابق اُن کی ترتیب۔ چنانچہ اس باب میں "نمونہ[1]" کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔

تحریر کے سحر کے متعلق انگریزی مصنف آر ایل اسٹیونسن نے نہایت دلچسپ بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہر جملے میں بجز اس کے وہ بہت ہی مختصر ہو۔ ایک قسم کا عقدہ یا گرہ ہوتی ہے۔ ایک حد خاص تک مطلب میں بتدریج تعقید یا ایک طرح کا اجمال بڑھتا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد حل یعنی تفصیل کا درجہ آتا ہے۔ فن کلام کا اقتضا یہ ہے کہ اس طبعی اجمال و تفصیل یا حل و عقد خیالات کے مقابلہ میں الفاظ جملہ میں بھی اسی قسم کا حل و عقد بالمقابل پایا جائے۔ جب تک خیالات کے عقدے کے مقابل میں الفاظ میں بھی تعقید نہ ہو گی۔ کلام کے دو جداگانہ اثر جو عقل و سماعت پر ہونے چاہئیں بجائے مجموعی واحد اثر پیدا کرنے کے ایک دوسرے کے مخالف اثر پیدا کریں گے، لہذا کلام کے تار و پود میں معانی، الفاظ اور اصوات کا ایک انداز خاص ہونا ضروری ہے۔ کلام کا وہ اثر ہی جو سامع سے تعلق رکھتا ہے۔ فصاحت کی

---

[1] Pattern

بنیاد ہے۔ اور خوبیِ کلام بہ نسبت کسی اور چیز کے زیادہ تر اسی پر موقوف ہے۔ اس باب میں مصنّف کو نظم کی نسبت نثر میں زیادہ آزادی اور سہولت رہتی ہے۔ نظم کا نمونہ زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ نثر میں ایک انداز خاص سامع کے مطابق بنا دینا چنداں مشکل نہیں۔ اس کے بعد صرف اتنا کام باقی رہ جاتا ہے کہ مصنّف پُر لطف تنوع سے کام لیکر تکرار و اعادہ الفاظ سے حتی الامکان گریز کرے۔

اُردو مصنفین میں اثر کی اُن باریکیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا اور بہت کم مصنفین کا کلام اس قسم کی تنقید کا متحمل ہو سکتا ہے۔ مگر سید صاحب کے کلام میں انداز کی یہ خصوصیات اکثر موقعوں پر موجود ہیں۔ ان کے فقروں کی موسیقی مطالب و معانی سے ہم آہنگ ہوتی ہے، اور سامع کے کانوں کو کہیں کسی قسم کی غیر متوقع مایوسی یا بے آہنگی محسوس نہیں ہوتی۔

خیالستان نہ صرف انداز کے محاسن گوناگوں ہی سے مرصع ہے۔ بلکہ لطیف جذبات، نازک شاعرانہ خیالات، اور ظرافت کے شگفتہ مضامین کا ایک بے نظیر مجموعہ ہے اور مصنف نے ہر موضوع کے مطابق مختلف مضامین میں اتنا موزوں طرزِ بیان اختیار کیا ہے جس پر تفصیلی تنقید ایک کتاب کی ضخامت کی محتاج ہے۔

اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ خیالستان پہلی کتاب تھی، جس کی اشاعت نے ادبِ اُردو میں ایک نہایت حسین، دلکش "انداز" پیدا کر دیا اور ادب کی وسعت کے لئے نئے نئے راستے کھول دیئے۔

غلام بھیک نیرنگ

خیالستان

ان چند سطروں کے لکھنے کا مقصد نہ تقریظ ہے۔ نہ تنقید، بلکہ اس کا مقصد محض ایک تمہید۔

آج اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ناظرین سے سیّد سجّاد حیدر صاحب کی تقریب کی جائے۔ سیّد صاحب موصوف کا نام دلدادگانِ فنِ ادب کے لئے نیا نام نہیں ہے۔ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس مجموعے کے مدعائے اشاعت کے متعلق چند ضروری باتیں درج کروں۔

یہ تحریریں مختلف موقعوں پر مختلف رسالوں میں زیادہ تر مخزن میں شائع ہو کر قبولِ عام کا (شاید یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ قبولِ خاص کا) تمغہ حاصل کر چکی ہیں۔ سیّد صاحب میرے حال پر خاص التفات فرماتے ہیں۔ اس اختصاص کی وجہ سے مَیں نے اصرار کیا کہ ان تحریروں کا رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہونا (اور وہ بھی بسا اوقات بہ اقساط) ان کے لئے کافی انصاف نہیں ہے۔ مَیں نے کئی دفعہ گذارش کیا کہ ان تحریروں کو ایک مجموعے کی شکل دی جائے تاکہ خیالات کی ان بولتی چالتی تصویروں کا ایک مرقع مرتب ہو جائے اور "حکایۂ لیلیٰ و مجنوں" جیسے دلچسپ مضامین ناظرینِ تک دست و پا بریدہ حالت میں نہ پہنچیں۔

مَیں خوش ہوں کہ میرے متواتر تقاضے نے آخر اثر کیا اور سیّد صاحب نے یہ مجموعہ چھپوایا۔

اس گئے گذرے زمانے میں بھی اُردو فنِ ادب کے خیر اندیشوں اور خادموں کی تعداد (بحمد اللہ) معقول ہے اور جس کسی کو بھی اس معاملے سے کچھ دلچسپی ہے وہ یہ دیکھ کر ضرور خوش ہوگا کہ طرزِ خیال اور اندازِ بیان کی توسیع کی کوشش مختلف سمتوں میں علیٰ قدرِ مراتب ہو رہی ہیں۔ مَیں پُرانے رنگ کا قدر ناشناس نہیں ہُوں لیکن ان لوگوں میں ضرور ہوں جو یہ چاہتے ہیں کہ نئے نئے طرزِ خیال، نئے نئے اندازِ بیان ایجاد ہوں۔ جدت کو بدعت (اور وہ بھی بدعت سیہ) نہ سمجھا جائے۔ فطری جذبات جن کی اصلیت سے عامۂ شعرا مصنفین دُور جا پڑتے ہیں۔ نظم و نثر میں سچائی کے ساتھ ظاہر ہوں۔ لفظی ٹیپ ٹاپ کو بجائے خود مدعا نہ بنا لیا جائے۔ الغرض حسنِ بیان نہ صرف قائم ہی رہے بلکہ ترقی کرے۔ اس ترقی میں رنگارنگی اور تنوع کو شامل سمجھا جائے اور ساتھ ہی حسنِ خیال کو حسنِ بیان کی بنیاد قرار دیا جائے۔

ان کوششوں میں سیّد سجاد حیدر بھی شریک ہوئے ہیں۔ شاہدِ رعنائے سخن کے شیداؤں میں وہ کسی سے پیچھے نہیں۔

آگے ہی ہیں۔ لیکن وہ عاشق بھی ہیں اور مشاطہ بھی، وہ "اسبابِ حسنِ یار" کے بڑھانے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟ اس کا جواب اُن حضرات سے پوچھیے جو اہلِ نظر اور صاحبِ طبیعت ہیں۔ اُن کے اندازِ بیان میں کہیں کہیں تو انگریزیت کی جھلک ہے۔ اور کہیں کہیں غالباً ترکی طرزِ بیان کا چربہ ہے۔ مگر داد کے قابل یہ بات ہے کہ انگریزی اور ترکی کی یہ تقلید عملی طور پر ایجاد کا حکم رکھتی ہے۔ کیوں کہ وہ غیر مانوس اور ناخوش گوار نہیں ہونے پاتی۔ ان میں انوکھا پن ہوتا ہے مگر اجنبیت نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں ان تحریروں میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ وہ صرف پُرمعنی ہی نہیں بلکہ معنی خیز ہیں۔ صرف معنی خیز ہی نہیں، بلکہ خیال انگیز ہیں۔ گویا یہ خیالات ہی نہیں ہیں، بلکہ خیالات کے تخم بھی ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس لحاظ سے "خیالستان" ناموزوں نام نہیں ہے۔ یہ نام میں نے ہی تجویز کیا تھا اور میں خوش ہوں کہ یہ خیالستان "خیالستان" ہی کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

صلاح الدین احمد

چند لمحے سجاد حیدر کے ساتھ

بیسویں صدی کے آغاز میں ہمارے ادب پر اخلاق اور افادیت کا گہرا اثر چھایا ہوا تھا۔ سرسید احمد خاں کی تحریک بار آور ہو چکی تھی۔ اور حالی اپنے سیل سخن کو تنگنائے غزل سے نکال کر قومی شاعری کی رو و بار نو میں رواں کر چکے تھے۔ لکھنؤ کے سخنوران اور انشاپردازوں نے اگرچہ ابھی اپنے قلم نہیں توڑے تھے۔ لیکن وہ ایک بوجھل اور مٹتے ہوئے کلچر کو سہارا دیتے دیتے عاجز آ چکے تھے اور اب اُن کی ساری ہنگامہ آرائی چند دوراز کار لفظی بحثوں اور طنزیہ چشمکوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ سرشار، شرر اور سجاد حسین نے اس بجھتی ہوئی شمع کو اکسانے کی کوشش کی، جس سے کبھی شام اودھ کے سہانے دھندلکے روشن تھے لیکن تجدد کے اُبھرتے ہوئے آفتاب کے سامنے اس کی لو کچھ اس طرح سے شرما کر رہ گئی۔ کہ پھر ایک عرصہ دراز تک ہمارے ایوان ادب کے در و دیوار پر اس کا رقص لرزاں نظرافروز نہ ہوا

ادھر علی گڈھ ہماری جدید تعلیمی تحریک کا مرکز بن چکا تھا اور یو۔پی کے مغربی اضلاع اور پنجاب کے مشرقی اور وسطی دوآبے بڑی شدت اور شوق سے اس کے زیر اثر آ چکے تھے۔ حالی اور آزاد دونوں باری باری سے لاہور آئے اور اس صوبے میں انگریزی ادب کے روز افزوں نفوذ و رسوخ سے بدرجہ غایت متاثر ہوئے۔ آزاد تو یہیں کے ہو رہے اور حالی اگرچہ واپس چلے گئے۔ لیکن اپنی طبع رسا پر اتصال مغرب کا ایک گہرا اثر لے کر گئے اور جب وہ سرسید کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک خالص ادب کے لئے ایک مضر تحریک تھی اور اس نے افادیت ریختہ کاری سے وہ حسن آفریں سوتے خشک کر دیئے جو ہمارے ادب کے چشمۂ صافی میں کم و بیش ڈیڑھ صدی سے جاری تھے۔ حالی خود ایک بڑے پائے کے غزل نگار تھے اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی صحبت نے ان کی سادہ اور خشک طبیعت میں بھی ایک پُر کیف سوز پیدا کر دیا تھا۔ لیکن سرسید سے متاثر ہوتے ہی اُن کا اندازِ فکر ایسا بدلا کہ وہ غزل اور ہر اس پارۂ ادب کے مخالف ہو گئے جو کوئی ٹھوس افادی قدر پیش نہیں کر سکتا تھا۔

حالی کے اس رجحان طبع پر میں نے چند الفاظ خاص طور پر اس لئے کہے ہیں کہ حالی سرسید اور ان کی طرح کے نقیب تھے اور انہوں نے اپنی مثال اور اپنی تخلیقات سے انیسویں صدی کے آخری دو عشروں کے ادب کو بدرجہ غایت متاثر کیا۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد ایک حد تک ان اثرات سے بچے رہے۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کی نگارشات نظم اُردو، نظم فارسی اور عہد اکبری کی تاریخ ہی میں محدود رہیں اور عوام کی زندگی پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ نیرنگ خیال میں انہوں نے اپنے

اسلوب خاص کے جو طوطا مینا اُڑائے ہیں وہ بھی اُن کے آسمان تخیل ہی میں پرواز کرتے رہے۔ زندگی کے بام و در پر کبھی آن کر نہ بیٹھے۔

اتنے میں انیسویں صدی نے بیسویں صدی کو کروٹ دی اور ہماری ادبیات میں مخزن کے اجراء سے آزاد نگاری کے ایک نئے رجحان اور نئے دَور کا آغاز ہوا۔ مخزن ایک خالص ادبی پرچہ تھا اور اگرچہ اس کے صفحات ہر نوع کے علمی اور ادبی مضامین کے لئے کھلے ہوئے تھے لیکن وہ کسی دبستان خیال کا ترجمان نہیں تھا۔ مخزن کے اجرا نے ہمارے اُبھرتے ہوئے ادیبوں اور اُن کی آمادہ طبائع پر وہی اثر کیا جو تازیانہ سمندِ ناز پہ کیا کرتا ہے اور اس میں مطلقاً کوئی کلام نہیں۔ کہ شیخ عبدالقادر مرحوم اپنے عہد کے ادبی تقاضوں کے بہت بڑے نبض شناس تھے۔ انہوں نے نہ جانے یہ بات کس طرح محسوس کر لی تھی کہ ادب پر افادیت بڑی بُری طرح سوار ہو چکی ہے اور وہ وقت آگیا ہے کہ ادب کو اس کی یبوسیت اور تسلط سے جا سے رہائی دلائی جائے اور ان صحتمند عناصر کو متحرک کیا جائے جو اس کے جسمِ بے جان میں از سرِ نو ایک رُوح پھونک کر اسے اس کا قدرتی اور فطری حق دلائیں۔ خوش قسمتی سے اُن کا تجربہ بدرجۂ غایت کامیاب رہا اور مخزن کی تحریک اور اسکی صلائے عام نے ہماری زبان اور ادب کو جو انمول اور بے بہا جواہر عطا کئے اُن میں اقبال کی نظم اور سجاد حیدر کی نثر ایک امتیازِ خاص رکھتی ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کو فطرت سے ایک باغیانہ طبیعت اور ایک شاعرانہ مزاج عطا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جوہر کمیاب بھی ارزانی کیا گیا تھا۔ جسے بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں حسن شناسی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار نہیں تھے اور ہمارے افسانوی ادب میں اُن کا کوئی مقام نہیں ہے۔ وہ افسانے کا تار پود تیار کرنا نہیں جانتے اور نہ انہوں نے اس کے کوئی قابلِ ذکر تجربے کئے ہیں۔ اس کے برعکس وہ ایک بہت بڑے انشا پرداز تھے۔ اور زندگی کے حسن کو ایک نادرہ کار چابک دستی سے وہ الفاظ کے حسن میں منتقل کرنے کی ایک بے مثال قدرت رکھتے تھے۔ میں نے حُسن کا لفظ یہاں عمداً استعمال کیا ہے کیوں کہ اُن کے ہاں بدصورتی کے انتقال کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت بڑے اسٹائلسٹ تھے۔ ایک بہت بڑے صاحبِ اسلوب اور اگر مولانا محمد حسین آزاد اُن سے پہلے نہ پیدا ہو گئے ہوتے تو وہ یقیناً اُردو کے پہلے صاحب طرز انشا پرداز قرار دیئے جاتے۔

سجاد حیدر نے جب لکھنا شروع کیا تو ہمارے ادب پر سے ابھی ہماری اصلاحی تحریک کا زوال پذیر سایہ ٹلا نہیں تھا۔ اور ادبیات اعلیٰ میں عورت کا وجود تو کیا، اُس کا ذکر بھی معیوب تھا۔ اسے حسن اتفاق کہئے یا اُردو کی خوش بختی کہ سجاد حیدر نے اپنا قلم اُٹھانے سے پہلے جو مطالعات کئے اُن میں ہم عصر ترکی ادب کا مطالعہ بھی شامل تھا۔ اس زمانے میں ترکی سے مسلمانانِ ہند کو ایک خاص عقیدت تھی اور شاید یہ عقیدت بھی ایک حد تک سجاد حیدر کے اس اقدام کی محرک ہوئی ہے۔ ترکی ادب پر فرانسیسی ادب کا خاصا ادب پایا جاتا ہے اور مشرقی اقوام میں ٹرکی یورپ سے قریب ترین ہونے کے باعث اسکی ادبیات سے داخلی طور پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہم انگریزی پڑھ تو رہے تھے اور ایک حد تک انگریزی معاشرت سے بھی آشنا ہو چکے تھے لیکن بجز تراجم کے ہم نے مغربی اسالیب فکر و اظہار کو

اپنے ادب میں سمویا نہیں تھا۔ ترکی ادبیات یہ منزل طے کر چکی تھیں اور ان میں فرانسیسی اور ترکی ادب کے محاسن ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہو گئے تھے اور مشرق کی جلوہ سامانیاں مغرب کی بے حجابیوں میں کچھ اس طرح گھل مل گئی تھیں کہ ایک دوسرے کو دوسرے سے علیحدہ کرنا آسان نہیں رہا تھا۔

نوجوان سجاد حیدر جب ادب عالیہ کی اس صنفِ لطیف سے آشنا ہوا تو اخذ و جذب کی اوّلین کیف آشامیوں ہی نے اظہار و انتقال کے لئے مچلنا شروع کر دیا۔ اُدھر قدرت نے اسے ذوق سلیم سے بہرہ وافر عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نطق اعجاز آفریں بھی ارزانی کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب اس نے قلم اُٹھایا تو صفحات قرطاس ایک گلشن بے خزاں کے اُن سدا بہار تختوں میں منتقل ہو گئے کہ جن کی شمیم روح افزا سے شیفتگان ادب کے مشام، شام ابد تک معطر رہیں گے۔

سجاد حیدر نے مخزن کے اوّلین دور کی ابتدا میں اپنے پارہ ہائے نثر پیش کر کے ہمارے خالص ادب میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ مَیں انہیں عہد آفریں اس لحاظ سے بھی کہتا ہوں کہ اُن کی نمود کے ساتھ ہی ہماری ادبیات ایک موڑ پر پہنچ گئیں۔ جس کے برتے ہی ہم ادب میں عورت سے دوچار ہوئے ہیں۔ عورت اپنی تمام تر رطانت اور اپنی بھرپور جنسی خصوصیات کے ساتھ عین ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اگرچہ اُسے دیکھتے ہی ہم ٹھٹھک ضرور جاتے ہیں لیکن جھینپتے نہیں شاید اس لئے کہ وہ سحابِ شفق کی رنگینیوں میں ملبوس ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک کرۂ مرمریں لڑھکاتی ہوئی بصد جلوہ و ناز ہماری طرف بڑھتی ہے۔ یا پھر شاید اس لئے کہ وہ اس زریں ادب کے صفحات میں سے نکل کر آتی ہے جس کی امیں قوم کو ہم عزت و عقیدت کی نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ اردو کی ادبیات عالیہ میں عورت کی وہ بے محابہ نمود اور اسکی جنسی کشش کا وہ کھلا کھلا اعتراف جو ہمیں خارستان و گلستان کے صفحات میں، صحبت ناجنس کی سطور میں، چڑیا چڑے کی کہانی میں، سودائے سنگین کے بیان میں اور حکایت لیلیٰ و مجنوں کے طلسمی دامنوں میں نظر آتا ہے۔ درحقیقت ہمارے ادب میں ایک نئے اور صحت مند رجحان کا آغاز کرتا ہے۔ یہ اپنے زمانے کی مسلّمہ اخلاقی اقدار کے خلاف سجاد حیدر کی ایک کھلی ہوئی بغاوت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی کے افسانوی ادب میں ہمیں جا بجا عورت کا سُراغ ملتا ہے لیکن غور کیجئے تو اس سے آپ کہیں اس طرح دوچار نہیں ہوتے جس طرح خارا کی آغوشِ تمنا میں، یا سلمیٰ اور عذرا کی نجی مراسلت میں، یا گمنام خط کی ہیروئن خورشید لقا بیگم کے پیکر میں اس سے پہلے اگر وہ نظر بھی آتی ہے تو کہیں محاربات صلیبی کے دھندلکوں میں، یا بڑی بیگم کی محل سرا میں یا پھر بازارِ حسن کے کسی بالا خانے میں، لیکن اس عورت میں نسرین نوش کی معصوم جذباتیت یا سلمیٰ کی تشنہ نسوانیت آپکو کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔

مختارات کے علاوہ یلدرم نے ترکی ادب کے تتبع میں جو طبعزاد چیزیں لکھی ہیں، تمدن میں بھی ایک جرأت رندانہ اور ایک جبلی و لطیف اندازِ معصومانہ پایا جاتا ہے۔ جس کا شفاف خلوص، تصنع یا بناوٹ کے تصوّر سے بھی میلا ہو جاتا ہے۔ اور میں پھر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ سجاد حیدر کا یہ حیرت انگیز اور جرأت آفریں اقدام اپنے عہد کی جھوٹی وضعداری اور خشک ملّائیت کے خلاف ایک مجاہدانہ یلغار کی حیثیت رکھتا تھا اور اُسے ہر ہر قدم پر ایک بے مثال کامیابی حاصل ہوئی۔ اس لئے طباع

مطالعہ ادب میں ایک صحت مند کروٹ کو قبول کرنے کے لئے بدرجہ غایت آمادہ تھیں اور اس لئے بھی کہ اُن کی ذہنی سطح اپنے عہد کی عام سطح سے بے حد بلند تھی اور کشتگانِ فن اور تخلیقات کو گردن اونچی کر کے ہی دیکھ پاتے تھے۔

اور اب ایک لفظ یلدرم کے اندازِ نگارش کے متعلق۔ میرا یہ ذاتی عقیدہ ہے کہ ایک پُر زور اسٹائل یا طرزِ بیان طبیعت کے اندرونی طوفان سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے باطن میں جو ایک تخیلی دُنیا آباد ہے۔ اس کے عناصر جب ہماری خارجی دُنیا سے ٹکراتے ہیں تو تصادم کا اظہار لامحالہ زبان زبان کے اس مرکب رنگ ہی میں ہو سکتا ہے۔ جو اپنی روشنائی خارجی فضا سے اور سرخی لکھنے والے کے خونِ دل سے مستعار لیا ہے۔ اسی لئے جو مصنف محض ایک خارجی انداز رکھتے ہیں وہ کبھی کوئی امتیازی سٹائل پیدا نہیں کر سکتے۔ اسٹائل دیگر اوصاف طبع ہی کی طرح ایک وصف ہے جو لکھنے والے کی باطنی اور جذباتی دُنیا سے ایک بنیادی نسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ یلدرم کا اسلوب نگارش بھی بلاشبہ اُس کے سیماب صفت طبیعت، اسکی حُسن پرست نظر، اس کے پُرجوش اور گرم دل اور اس کے وہبی سلیقہ انتخاب کی گوناگوں کیفیتوں سے مرکب اور انہیں کا عکاس ہے اور یہ اسکی کتنی بڑی جیت ہے کہ اگرچہ اس نے اپنے بیشتر مضامین کو ایک ایسے خالص اور زندہ اسلوب میں پیش کیا جو سرتاسر اس کا دینا تھا اور جس کی تگ و تاز کا میدان اور فضا بھی سراسر ہندوستانی تھی۔ مثلاً سلمیٰ اور عذرا کی خط و کتابت ایک ترکی مضمون ہے اور مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ ایک انگریزی چربہ، لیکن دیکھئے دونوں کی فضا کس درجہ خالص ہندوستانی اور حیدرآبادی ہے۔ اسی طرح جب وہ خارستان کا ذکر کرتا ہے تو پیشِ منظر کی تعمیر کچھ اس طرح کرتا ہے:-

"تاڑ، برگد، سال، چیڑ اور ببول وغیرہ درختوں کے اصلی اور قدیم جنگل میں سُوکھے پتوں پر درندوں کے چلنے کی آواز، بیچ جنگل سے اُٹھنے والی آندھی کے شور سے مل کر سمندر کے خروش سے باتیں کر رہی تھی۔ ہر زندہ شے اس فریاد کار ظلمت میں تدارکِ غذا و گزران زماں کے لئے کبھی شیرانہ جرأت سے کام لیتی تھی اور کبھی ایک بودی جھجک سے کانپ اُٹھتی تھی۔ ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے۔"

آپ نے دیکھا، خارستان کی سختی اور ویرانی کی تعمیر میں ان خالص ہندی الفاظ یعنی تاڑ، برگد، سال، چیڑ اور ببول نے نہ صرف ایک واقعی بلکہ ایک صوتی حصہ بھی لیا ہے اور مواد کے سٹائل کو کسی طرح متاثر یا پابہ زنجیر نہیں کیا۔

یلدرم کا انتخاب الفاظ اور اس کا امتزاج تراکیب ہمارے ادب میں ایک یگانہ اور منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اس نے نہ صرف اپنے عہد میں ہمارے اسالیب ادب میں ایک چونکا دینے والا اضافہ کیا بلکہ بعض دوسرے لکھنے والوں کے طرز نگارش پر ایک واضح اثر ڈالا۔ نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، ل۔ احمد، میرا فضل علی اور میری ناچیز رائے میں ایک حد تک مولانا ابوالکلام آزاد بھی یلدرم کے پُرجوش اور حسین الفاظ اور اچھوتی اور بحر در آغوش تراکیب سے اپنے زمانے میں متاثر ہوئے اور پھر اپنی باری میں دُوسروں کو متاثر کرتے رہے اور یونہی یہ چراغ دوسرے چراغوں کو جلاتا اور اپنی جلوہ پاشیوں سے ہمارے خالص ادب کے در و دیوار کو فروزاں کرتا رہا۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر

اردو انشائے لطیف

یلدرم اور ان کے ساتھی

سجاد انصاری کے انشائیے "حقیقت عریاں، محبت کی ماہیت نفسی، پیام زلیخا اور عفت نسوانی" مہدی افادی کے انشائیے "فلسفۂ حسن و عشق، بنت عم، خواب طفلی اور آرزوئے شباب"۔ سجاد یلدرم کے انشائیے "حضرت دل کی سوانح عمری، چڑیا چڑے کی کہانی، اگر میں صحرا نشیں ہوتا اور ویران صنم خانے"۔ اور نیاز کا انشائیہ "فنون ادبیہ اور حقیقت نگاری" رومانی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان انشائیوں میں باقاعدہ اور مرتب انداز میں کسی جمالیاتی اصول کی ترجمانی نہیں ملتی۔ غیر مربوط اور بکھرے ہوئے چند خیالات ہیں جن کے سوتوں کو جمال پرست، انشا پردازوں کی تحریروں میں بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن ان انشائیوں میں زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کا حوصلہ ہے۔ اور حسن کے تصور میں ایک خاص شدت اور تیزی محسوس ہوتی ہے۔ ان انشائیوں میں عورت، شباب، معصیت اور رنگینی کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ جوان ادیبوں کی جمالیاتی حس اور ان کے احساس رنگ کی غمازی کرتا ہے۔ اس دور کے انشائیے اپنی شعریت، سحر انگیزی، مٹھاس، تابناکی اور رنگینی کے اعتبار سے اردو کے بہترین انشائیے کہلانے کے مستحق ہیں۔ اردو اردو نثر میں جرأت فکر، انفرادیت اور آزادی خیال کبھی اس اعتماد اور شدت کے ساتھ نہ ابھری تھی جیسی اس دور کے انشائیوں میں نظر آتی ہے۔ ان انشائیوں میں اس فلسفۂ لذتیت کی جھلک پائی جاتی ہے جس میں زندگی کی رعنائیوں اور اس کی لذتوں کو چوس لینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس دور کے انشائیے ادب لطیف اور فلسفے کا بڑا حسین امتزاج پیش کرتے ہیں۔ ان انشا پردازوں نے فلسفیانہ انداز کو انشائیہ میں سمونے کا سلیقہ سکھایا اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انشائیہ کی صنف ہر قسم کے موضوعات کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ انشائیہ دقیق اور ہلکے پھلکے مضامین کو بھی جذب کر سکتا ہے اور ادبِ لطیف کی نزاکتوں پر انشائیہ کی صنف بار نہیں بنتی بلکہ بعض اور اصناف سے زیادہ انشائیہ نگاری میں ادب لطیف کو نکھرنے اور اپنا جادو جگانے کا موقع ملتا ہے۔ اس دور کے انشائیہ نگاروں نے نہ صرف نئے خیالات ہمارے ادب میں داخل کئے بلکہ طرز تحریر میں بھی ایک انوکھا کیف، لطافت اور شادابی پیدا کی۔ اس عہد کی انشائیہ نگاری کا ایک اور میلان یہ ہے کہ ان انشا پردازوں نے اردو نثر میں جدید ترکیبوں، اچھوتی ساختوں اور اظہار کے

نئے نئے پیکروں کو روشناس کیا۔ لسانی اعتبار سے بھی یہ انشائیے ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ ان میں مفہوم کو زیادہ صاف اور بیان کو زیادہ مرتکز کرنے کے لئے بعض اوقات دو دو تین تین ارکان کے طبعزاد مرکبات بنائے گئے ہیں اور ان مرکبات سے انشائیہ نگاروں کے حسن تعمیر اور ذوق ترتیب کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ زمانہ اردو نثر میں انگریزی ادب سے اثر پذیر ہو کر ان کے طرز ادا، ان کے انداز بیاں کو سانچوں اور اظہار کے پیکروں کو جذب کرنے کا دور تھا اور اس زمانے کے اکثر انشائیہ نگار شعوری یا غیر شعوری طور پر اس رجحان کی زد میں آ چکے تھے۔ اس دور میں کئی نئے انگریزی الفاظ اردو میں منتقل ہوئے۔ ان میں سے کچھ جو بڑے سڈول، موزوں اور بلیغ تھے، چل نکلے اور باقی مرکبات اور الفاظ کا رنگ بہت جلد پھیکا پڑ گیا۔ مہدی افادی نے بعض انگریزی مرکبات اور الفاظ کا بڑا دلچسپ ترجمہ کیا تھا۔ مثلاً "ہنی مون" کے لئے "عہد زفاف"۔ "ایٹیکیٹ کے لئے" عوائد رسمیہ"۔ ماسٹر پیس کے لئے "اختراع فائقہ" اور لٹریری اکیڈمی کے لئے" بیت الحکماء"۔ انہی کی طباعی اور ذوق ترکیب تراشی کی یادگار ہیں۔ "غیر ستائشی جنس ادب"۔ "آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ"۔ "پیارے جناب"۔ "دماغی حجتیں ـــــ غیر فانیوں کے ساتھ" اور اس قسم کے بہت سے نقوش مہدی افادی نے انگریزی ادب سے اپنائے اور ان سے اپنے اسلوب میں ایک نئی چمک، تابناکی اور گہرائی پیدا کی۔ یلدرم نے تراشوں اور مرکبات کو وضع کرنے میں عربی اور فارسی سے استفادہ کیا اور مرکبات بنانے کا یہ شعور انہیں ترکی زبان سے بھی ملا تھا جو ایک امتزاجی زبان ہے اور جس میں آسانی کے ساتھ مرکبات ڈھالے جا سکتے ہیں۔ "ادائے تسلیمیت"۔ "خندہ گیر"۔ "اضطراب وجدانیہ"۔ بحران حسن"۔ "تفرع"۔ "حکمات فکریہ" اور "دست تغلب" اس کی چند مثالیں ہیں جو یلدرم کے اسلوب کی انفرادیت اور ندرت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس دور کے انشا پردازوں نے انشائیہ کو بہترین اسالیب اور طرز ادا کے حسین مرقعوں سے سنوارا اور سجایا۔ انداز بیاں کا اتنا رچاؤ اور اتنا نکھرا ہوا رنگ انشائیہ نگاری کے کسی دور میں نہیں ملتا۔ عبارت آرائی، تشبیہوں کی رعنائی اور استعاروں کی آب و تاب نے انشائیہ میں ایک نئی اور رسیلی انشا پردازی کا اضافہ کیا۔ اس دور میں تشبیہات اور استعارے برتے گئے ہیں۔ اس کی مثال اردو نثر میں نہ اس سے پہلے ملتی ہے نہ اس کے بعد۔ بقول قاضی عبدالغفار "ادبیات کے یہ تاج محل ہر روز تعمیر نہیں ہوا کرتے"۔

اس دور کی انشائیہ نگاری اپنے صوتی حسن، اپنی ٹھمی غنائیت اور اپنے مخصوص نغمے کی وجہ سے ہمیشہ یادگار رہے گی۔ سجاد حیدر یلدرم کے ایک انشائیے "تیتری" کا اقتباس ملاحظہ ہو، جس سے اس دور کی انشائیہ نگاری کے اسلوب کے بانکپن اور اس کی جاذبیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"یوں کہئے کہ تیتری محویت عاشقانہ کی حالت میں پڑی بہار کے جسم سے نکلی ہوئی ایک خوشبو ہے جس نے شکل اختیار کر لی ہے یا وہ نیچر کے سب سے زیادہ روح پرور رنگوں سے مرکب ایک شہتیر ہے جس میں لرزش حیات پیدا ہو گئی ہے یا ایک نور سیال ہے جسے پریوں نے چھو کر قطرے میں تبدیل کر دیا ہے یا یوں کہئے تیتری ایک نسیم سحر ہے کہ چلتی ہے..... ایک خندہ ہے کہ ہونٹ پر جم گیا۔ ایک تبسم ہے کہ لرزاں ہے۔ سب سے بہتر یوں کہئے کہ تیتری ایک سودا ہے بے قرار، ایک نسیم ہے معنبر، ایک بوسہ ہے ذی روح، ایک شعر ہے رقصاں!"

نیاز فتح پوری اور احتشام حسین

یلدرم ـــــ اُن کے ساتھی

اور

رومانی افسانہ نگاری

احتشام :- نیاز صاحب! اُردو میں رومانی افسانہ نویسی کی عمر تقریباً پچاس سال ہوگئی ہے اور مَیں آپ کو بھی اُس کے جم
داتاؤں میں شمار کرتا ہوں - آپ کو کچھ خیال ہے کہ آپ نے اپنا پہلا افسانہ کیا لکھا، کیوں لکھا اور اُس کا کیا عنوان تھا؟
نیاز :- ایک ہی سانس میں اتنے سوال! اگر مجھ سے کبھی کسی عدالت گاہ میں ایسی A brupt جرح کی جاتی تو گھبراہٹ میں
خدا جانے مَیں کیا سے کیا کہہ جاتا - گو یوں مَیں اس لحاظ سے کہ آپ اُردو کے پروفیسر ہیں، آپکے سوالوں کا جواب دیتے
ہوئے اپنے اندر ایک طالب علمانہ پس وپیش ضرور محسوس کرتا ہوں اور اس خیال سے ممکن ہے فرار کا کوئی گوشہ مجھے مل
جائے - مَیں خود کوئی جواب نہ دوں گا بلکہ سب سے پہلے آپ ہی سے سوال کروں گا کہ رومان سے آپ کی کیا مراد ہے
اور افسانہ آپ کسے کہتے ہیں؟
احتشام :- رومان سے میری مراد حسن وعشق کا افلاطونی وتخیلی بیان نہیں بلکہ روایات سے بغاوت، نئی دنیا کی تلاش،
خوابوں اور خیالوں سے محبت، اَن دیکھے حُسن کی جستجو، وفورِ تخیل، وفورِ جذبات، انانیت میں ڈوبی ہوئی انفرادیت، آزادیٔ
خیال، حُسن سے تا بمقدور لطف اُٹھانے میں نا آسودگی کا احساس اور اس کا کرب! میں ان سب کو رومانیت کہتا
ہوں - رومانی اُسے بھی کہتا ہوں جو حقائق کی جستجو مادّی اسباب سے زیادہ خیالات وتصورات کی رنگین دُنیا میں کرتا ہے -
نیاز :- رومان کی آپ نے ایسی دلچسپ اور شاندار تعریف کم بیان کی ہے کہ اگر اسے رومانی قسم کی تنقید کہا جائے تو غلط
ہوگا - مَیں شاید اتنی وسعت اسے نہ دے سکتا لیکن روایات سے بغاوت اور نئی دُنیا کی تلاش کا ذکر کر کے آپ نے مجھے
فرقہ معتزلہ اور کولمبس کی یاد دلا دی - پہلے ان دونوں کی وضاحت بھی آپ فرمائیں تو مناسب ہے - اس کے بعد مَیں
یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ افسانہ سے آپکی کیا مراد ہے - قصہ گوئی داستان سرائے تو اُردو میں بہت پہلے سے رائج ہے او
اس میں بھی بہت سی وہ باتیں پائی جاتی ہیں جن کا ذکر آپ نے رومان کی تعریف میں کیا ہے - پھر آپ ان داستانوں کو رومانی

افسانے کیوں نہیں لکھتے ؟

احتشام :- نیاز صاحب! آپ نے اچھا کیا کہ ان لفظوں کی وضاحت مجھ سے چاہی ہے۔ کیونکہ اگر ہم دونوں نے اُنکے دو مفہوم پیشِ نظر رکھے تو شاید ہی کوئی نتیجہ نکل سکے۔ بہر حال روایت سے بغاوت اور نئی دُنیا کی تلاش سے میرا مطلب ہے ایسی ذہنیت اور ایسے شعور کا اظہار جسے اس بات کا احساس ہے کہ دُنیا وہی نہیں ہے جسے ہمارے بزرگوں اور پیش روؤں نے دیکھا تھا۔ اس کا حسن تہہ در تہہ ہے اور ہر تلاش کرنے والا اس میں کوئی نہ کوئی ایسا انوکھا پن پاتا ہے جسے اُسی کی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ اس کوشش میں بنے بنائے راستوں سے انحراف ہوتا ہے۔ وہ راستے چاہے اخلاقیات سے متعلق ہوں، چاہے احساسِ حُسن سے۔ رہی افسانے کی بات، تو اس کے متعلق صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ میرے پیشِ نظر جدید مختصر افسانہ ہے۔ جس میں قصے کی بنیاد کسی ایک واقعہ تاثر یا خیال پر رکھی جاتی ہے۔ اس وحدتِ تاثر کے لئے لکھنے والا زمان و مکان کا خیال بھی رکھتا ہے۔ اس طرح داستانوں کے برعکس اس میں انتشار کی جگہ ارتقاء اور بیانیہ تسلسل ملتا ہے۔ اس کا موضوع جو بھی ہو، اس لئے رومانی افسانہ بھی اسی دائرے میں آئے گا۔

نیاز :- صاف فرمایئے۔ رومان کی تعریف اب بھی پوری طرح میرے ذہن نشین نہیں ہوئی۔ یہ تو میں نہیں کہتا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ کچھ اُلجھی ہوئی سی بات ہے لیکن جو وضاحت میں چاہتا ہوں اُس کا تعلق اصول یا نظریوں سے نہیں بلکہ مثال و نظائر سے ہے۔ قدیم داستانوں کو جن کی بنیاد قطعاً حُسن و عشق پر قائم ہے، آپ رومان قرار دیتے ہیں یا کہ نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ ان میں بھی انوکھا پن ہے۔ ان میں بھی پُرانی کہانی سے بغاوت یا انحراف ہے۔ جدت و ندرت محض معیاری چیز ہے۔ وہ نہ کوئی اصولی چیز ہے اور نہ اُسے آپ کسی خاص دائرے میں محدود کر سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آپکے سامنے مقصدیت و ٹیکنک کا بھی سوال ہو، اور اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو زیادہ مناسب ہوگا اگر آپ اس پر کوئی ایسی روشنی ڈالیں جو داستان سرائی و فسانہ نگاری دونوں کو ایک دوسرے سے ممیز کر سکے۔

آپ نے جو کچھ فرمایا اُس سے بے شک گفتگو کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے اور رومانی افسانہ نگاری کے زمانے کی بھی ایک حد تک تعین ہوسکتی ہے۔ اب آپ اپنے پہلے سوالوں کا جواب سُن لیجئے، گو وہ میرے لئے تکلیف دِہ ہیں۔

اب سے پچاس سال پہلے میں جس دَور سے گزر رہا تھا وہ دراصل افسانہ نویسی کا نہیں بلکہ افسانہ خیزی کا دَور تھا۔ اور اب آپ نے یہ پُوچھ کر کہ میں نے اپنا سب سے پہلا فسانہ کب اور کیوں لکھا، میری وہ عمر رفتہ یاد دلا دی جس کو بُھلا دینے کے بعد ہی میں اس وقت تک زندہ رہ سکا ہوں۔

بہر حال اب آپ پُوچھتے ہیں تو بتانا ہی پڑے گا کہ میرا سب سے پہلا انشائیہ قسم کا افسانہ بقول آپ کے بِن دیکھا حُسن تو نہیں لیکن محیّر العقول حسن سے ضرور تعلق رکھتا تھا۔

احتشام :- اُس افسانے کا کیا عنوان تھا اور وہ کہاں شائع ہُوا ؟

نیاز :- میں اُس افسانے کا عنوان تو نہ بتاؤں گا کیونکہ باوجود خیال ہونے کے بڑی حد تک واقعاتی بھی تھا اور اسی لئے یہ تعمیلِ حکم (اب نہ پوچھئے کہ حکم کس کا تھا) میں نے اُسے "نگارستان" کے دوسرے ایڈیشن سے نکال دیا تھا۔ تاہم یہ ظاہر کر دیتا ہوں کہ

کوئی حرج نہیں۔ وہ ۱۹۱۰ء کی نمائش الہ آباد سے متعلق تھا اور یہی میرا سب سے پہلا افسانہ تھا جو حالات کے لحاظ سے کم، لیکن جذبات و تاثرات کے لحاظ سے ایسی طوفانی چیز تھا کہ اگر اُسے ماورائے رومان یا کچھ اور کہا جائے تو غالباً غلط نہ ہوگا جب دہلی کے "صلائے عام" میں یہ فسانہ شائع ہُوا تو سید سجاد حیدر یلدرم نے مجھے ایک بڑا رنگین خط لکھا اور پوری تفصیل دریافت کی۔ اُس زمانے میں سید غلام بھیک نیرنگ کی ایک غزل شائع ہوئی تھی۔ خط کے جواب میں اُس غزل کا مقطع مَیں نے سید سجاد حیدر کو لکھ کر بھیج دیا کہ ؎

نہ ہوئی لیلیٰ و مجنوں کی حکایت تازہ اُس کا عالم وہی نیرنگ کا نقشہ ہے وہی!

احتشام:- کیا سید سجاد کا تعارف اس سے پہلے بھی آپ سے ہو چکا تھا؟

نیاز:- ہاں! اس سے قبل ایک بار مَیں اور سجاد دونوں مسوری میں یکجا ہوئے تھے۔ قاری سرفراز حسین عزمی بھی وہیں تھے اور میرا پورا اتوار اُنھیں کے یہاں گزرتا تھا۔

احتشام:- سجاد صاحب تو عمر میں غالباً آپ سے بڑے تھے اور آپ سے پہلے اُنھوں نے لکھنا شروع کیا ہوگا اس لئے اُن کے افسانے ضرور آپ نے پڑھے ہوں گے اور اُن کا اثر بھی قبول کیا ہوگا!

نیاز:- سجاد حیدر یقیناً عمر میں مجھ سے بڑے تھے اور "مخزن" کے نورتن میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سجاد حیدر ترکی زبان کے انشائے حالیہ کو جو خالص رومانی صنفِ ادب ہے، اُردو میں منتقل کر رہے تھے۔ یوں تو اُنھوں نے انشائیہ قسم کے بھی متعدد مضامین ترکی سے ترجمہ کر کے شائع کئے اور افسانے بھی مثلاً "لیلیٰ مجنوں"۔ "چڑیا چڑے کی کہانی"، وغیرہ۔ لیکن جب "مخزن" ہی میں اُن کا "خاورستان"، "گلستان"، "شیرازہ"، شائع ہوئے جو ترکی انشائیہ کا بے مثل رومانی شاہکار ہے تو مَیں اُس سے بالکل اُسی طرح متاثر ہُوا، جیسا نمائش الہ آباد میں کسی والہانہ حُسن رکھنے والی ہستی کو دیکھ کر متاثر ہُوا تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ میرے زخمِ دل سب ہرے ہوگئے اور جذبات میں اتنا شدید ہیجان پیدا ہُوا جو کہ دفعتاً میرے مطالعے کا رُخ بدل گیا اور یونانی صحافت کے مطالعے میں محو ہوگیا اور اُنھیں کی رومانیت کی بنیاد پر مَیں نے فسانے لکھنے شروع کئے۔ چنانچہ میرا افسانہ "کیوپڈ اور سائکی" بھی اسی سلسلے کی ایک چیز ہے۔

بہر حال مَیں اس کا اعتراف کروں گا کہ میرے مخصوص ذوقِ ادب کے اُبھارنے میں سید سجاد حیدر کا بڑا ہاتھ تھا۔ اور رومانی افسانہ نگاری میں یقیناً اُن کی حیثیت موجد کی سی ہے اور میری مقلد کی سی!

احتشام:- سید سجاد کے علاوہ آپ کسی اور انشار پرداز سے متاثر ہوئے؟

نیاز:- سجاد حیدر کے بعد میر ناصر علی دہلوی کا رنگِ انشار بھی مجھے بہت پسند تھا۔ اور میرے مضامین اُنھیں کے رسالے "صلائے عام" میں شائع ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ اُن کا طرزِ تحریر خالص انشائیہ قسم کا تھا اور افسانہ نگاری سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا، اس لئے مَیں اس طرف مائل نہ ہو سکا۔ اگر مائل ہوتا بھی تو شاید کامیاب نہ ہوتا۔ وہ اپنے رنگ کے منفرد انشار پرداز تھے اور یہ رنگ اُنھیں کے ساتھ ختم ہوگیا۔

احتشام:- کسی مغربی یا ہندوستان کی کسی دوسری زبان کے افسانہ نگار سے بھی آپ متاثر ہوئے مثلاً ٹیگور یا کوئی اور؟

نیاز :- مغربی ادیبوں میں مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وکٹر ہیوگو نے، ولیم ہیزلٹ نے اور آسکر وائلڈ نے۔ وکٹر ہیوگو کی عمیق جذباتی صدا، ہیزلٹ کے اندازِ بیان کی چستی و رنگینی اور آسکر وائلڈ کا منطقی Paradox مجھے بہت پسند تھا اور میرے بعض افسانوں میں ان سب کی جھلک پائی جاتی ہے۔

علی الخصوص "شہاب کی سرگزشت" میں تو آسکر وائلڈ بہت چھپا ہے۔ میں ٹیگور سے بھی متاثر تھا۔ یہاں تک سنہ ۱۹۱۸ء میں میں نے "گیتا نجلی" کا ترجمہ "عرضِ نغمہ" کے نام سے کر ڈالا اور اُس نام سے شائع بھی ہوا۔ لیکن خاص ٹیگور کے رنگ کی چیز میں نے کبھی نہیں لکھی۔

احتشام :- ٹیگور سے آپ کیوں متاثر ہوئے؟

نیاز :- محض اِس لئے کہ اُس کے اندازِ بیان میں میں نے بیدل کی سی طاقت و ندرت پائی اور بیدل کا اثر مجھ پر زمانۂ طالب علمی ہی سے بہت زیادہ تھا۔ علاوہ اس کے ٹیگور سے متاثر ہونے کا ایک سبب اور بھی تھا وہ یہ کہ ٹیگور کی شاعری بھی داستانِ ناآسودگی و ناتمامی تھی اور میری زندگی بھی یکسر حسرت و ناکامی۔ فرق یہ تھا کہ ٹیگور کے سامنے خالص حقیقت تھی اور میرے سامنے خالص مجاز۔ حقیقت ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ مجاز میرے ہاتھ نہ آیا اور آخر کار ہم دونو صوفی ہو گئے۔

احتشام :- آپ نے بعض سماجی مسائل، تاریخی مسائل اور نفسیاتی تصوّرات کو بھی اپنے افسانوں میں بنیادی جگہ دی ہے۔ جس کی مثالیں "جمالستان" - "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" "حسن کی عیاریاں" اور بعض دوسرے مجموعوں میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن آپ کا انداز ہر جگہ رومانی ہی رہا ہے۔ موضوع و اسلوب دونوں اعتبار سے یہی بات یلدرم کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے کرداروں میں بھی جذباتی آرزومندی عمل کا بدل بن جاتی ہے اور سیاسی یا سماجی پس منظر بالکل دب کر رہ جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں اس رومانیت کا کیا سبب ہے؟ کیا ہندوستان کا ذہن بھی آپ لوگوں کے رومانی افسانوں کے خیر مقدم کے لئے تیار معلوم ہوتا تھا؟

نیاز :- میرے ان افسانوں میں جیسا کہ آپ نے ظاہر کیا کہیں کہیں سماجی مسائل اور تاریخی واقعات اور نفسیاتی تصوّرات بھی ملتے ہیں لیکن ان سب کا پسِ منظر رومانی ہی ہے اور اس لئے سماجی مسائل اور تاریخی و نفسیاتی تصورات کو میں نے پیش کیا ہے، وہ وہی ہیں جو سماجی و تاریخی حقائق سے علیحدہ ہونے کے بعد کافی رومانیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ "جذباتی آرزومندی" یہ فقرہ آپ نے بڑا پیارا استعمال کیا ہے۔ اس کو آپ اپنی تنقیدی اصطلاحات میں شامل کرلیں ــ تو مناسب ہے۔ اس سے بہتر فقرہ میری افسانہ نگاری کی رُوح کو ظاہر کرنے والا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

رہا افسانے میں سیاسی و سماجی پس منظر! سو اس کا خیال آپ کو ۱۹۵۸ء میں ہونا ہی چاہیئے، جب کہ انسان سیاسی و سماجی حیوان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر آج سے پچاس سال قبل کی دُنیا میں آپ ہوتے تو شاید یہ سوال آپ نہ کرتے جبکہ انسان محض انسان تھا۔ بے سوچے سمجھے انسان تھا اور ایسا انسان خالص رومانی انسان ہی ہو سکتا ہے۔

آپ نے میری رومانیت پسندی کا سبب بھی دریافت کیا ہے۔ اس کے جواب میں سوا اس کے کہ فطرت کو

ملزم قرار دوں اور کیا کہہ سکتا ہوں ؟ اس کا نام آپ کی زبان میں انفرادی پسندیدگی ہے۔ رہا یہ امر کہ ہندوستان کا ذہن بھی اس کے خیر مقدم کے لئے تیار تھا یا نہیں ؟ سو اس کے جواب میں صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ اس انداز کے رومانی افسانوں سے لطف اُٹھانیوالوں میں آپ بھی تھے گو اس وقت آپ اُس نام سے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ زمانہ اس رنگ کے افسانوں کے لئے ناموزوں نہ تھا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ لوگ قدیم طرزِ تحریر سے کچھ اُکتا سے گئے تھے اور وہ کچھ نئی باتیں نئے لب و لہجہ میں سُننا چاہتے تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ سیاسی و سماجی حیثیت سے یہ دَور ایک برزخی قسم کا دَور تھا اور ملک میں اس وقت انقلاب کی دو لہریں ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ ایک سیاسی، دوسری سماجی انقلاب کی لہر، اور ان دونوں نے اپنا اپنا کام کیا۔ ایک نے ملک کو آزاد کرایا، دوسری نے ترقی پسند ادب کو جنم دیا۔

احتشام :۔ تاریخی اعتبار سے بعض لوگ پہلا افسانہ نگار پریم چند کو مانتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنا قابلِ ذکر افسانہ "انمول رتن" ۱۹۰۷ء میں لکھا اور کئی حیثیتوں سے اُس افسانے میں داستان کا رنگ بھی ہے اور رومانی انداز بھی لیکن چونکہ مجموعی طور پر وہ سماجی و سیاسی مسائل سے اُلجھتے رہے۔ اس لئے رومانی اندازِ نظر کی جھلک تو اُن کے یہاں بھی مل جائے گی لیکن ہم اُنھیں رومانی نہیں کہیں گے۔ قرعۂ فال آپ کے اور سجاد حیدر یلدرم کے نام پڑیگا۔ ویسے سلطان حیدر جوش نے بھی اس زمانے میں افسانے لکھے۔ لیکن اُن کے سامنے کسی قدر علی گڈھ تحریک کا مقصد تھا اس لئے میں اُنھیں زیرِ بحث نہیں لانا چاہتا۔

یلدرم کے یہاں اور آپ کے یہاں کہانی سنانی ہی مقصد ہے اور اگر کوئی اور مقصد پیدا بھی ہوگیا ہے تو وہ کہانی کے تابع ہے۔

نیاز :۔ پریم چند بڑے پائے کے افسانہ نگار تھے لیکن وہ اتنے سرپھرے نہ تھے کہ محض رومان نگار ہو کر رہ جاتے سُلطان حیدر جوش کا مقصد چاہے کچھ رہا ہو، لیکن وہ تھے یلدرم کے مقلّد۔ میں مسوری ہی میں تھا کہ سلطان حیدر جوش کا ایک افسانہ "مخزن" میں شائع ہُوا اور جب یلدرم سے اس کا ذکر آیا تو وہ صرف یہ فقرہ کہکر خاموش ہو گئے کہ :۔ "Imitation is the secret of flattery"

پھر اگر اس سلسلہ میں سلطان حیدر جوش کا نام لیا جاسکتا ہے تو بھی صرف مقلّد کی حیثیت سے۔ ایجاد کا سہرا یقیناً یلدرم کے سر رہے گا۔

احتشام :۔ نیاز صاحب! آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ان سوالوں کے جواب سے سرفراز فرمایا۔ ہاں اس کے لئے ضرور شرمندہ ہوں کہ میرے بعض سوالوں نے آپکے ماضی کے زخموں کو کُرید دیا۔ لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ اس سلسلہ میں بعض ایسی باتیں معلوم ہوگئیں جن کے جاننے کے لئے ہمارے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں تھا!!

اسلوب احمد انصاری

یلدرم — رومانی نثر کا ایک معمار

سجاد حیدر یلدرم کے مختصر افسانے اور مضامین رومانی انشاء پردازی کے ایک خاص پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ
(ا)س لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان کی وجہ سے رومانی انداز تحریر کو بہت فروغ نصیب ہوا۔ یلدرم ترکی ادب کے دیوانہ وار عاشق
(ت)ھے۔ انھوں نے اُردو افسانوی ادب میں ترکی افسانوں کے تراجم کے ذریعہ قابلِ قدر اضافہ کیا۔ ان کے افسانوں کے عنوانات
"خارستان وگلستان"، "حضرتِ دل کی سوانح عمری"، "حکایۂ لیلیٰ ومجنوں"، "اگر میں صحرانشیں ہوتا"، "سیلِ زمانہ" وغیرہ خود
ان کے رومانی مواد کا پتہ دیتے ہیں۔ اُن کا نقطۂ نظر سراسر جذباتی ہے۔ مہدی الافادی اور یلدرم کے درمیان جو فرق ہے، وہ یہ
(کہ) مہدی الافادی کے مضامین میں مادیت کا غلبہ ہے اور یلدرم کا تخیل ماورائی ہے۔ مہدی الافادی مظاہر کی رُوح میں بے دھڑک
(د)اخل ہو جاتے ہیں۔ یلدرم پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتے ہیں اور ان کی پرواز کی سطح سے بلند ہو کر فضاؤں میں گم ہو جانا
چاہتی ہے۔ یلدرم کے انداز میں ایک طرح کا نیکھا پن ہے۔ اُن کے یہاں داخلیت کی آنچ بہت تیز نہیں ہے۔ اُن کے یہاں
جگہ جگہ جذبات کی تندی کو معتدل اور متوازن بنانے کی کوشش میں وہ جھجکتے اور لجاتے ہیں اور بھرپور قوت کے ساتھ جذبات
کے لاوے کو چھیڑنے سے گھبراتے ہیں۔ انہیں نقاش نہیں کہا جا سکتا۔ وہ خط وخال کو نمایاں کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اُن میں
ایک طرح کی معصومیت پائی جاتی ہے، مگر یہ معصومیت نہیں ہے۔ جو تجربہ کے تمام مراحل سے گزر چکنے کے بعد پھر عود کر آتی ہے
اور اسی لئے زیادہ باکیف، پہلودار اور معنی خیز ہوتی ہے اور جس کے لئے انگریزی شاعر بلیک (BLAKE) نے
تھارمیس (THARMAS) اور ارتھونا (LORTHONA) کے خیلی اصنام (MYTHS) کے اتحاد کا تصور وضع کیا
ہے۔ یہ بچوں جیسی معصومیت ہے جو تیتری کے تعاقب میں بھاگے چلے جاتے ہیں اور گرد وپیش اور عواقب سے بے نیاز
ہوتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں۔ جو ستاروں پر اتنی دیر تک نظر جمائے رکھتے ہیں۔ کہ پھر کرۂ زمین کے مطالبات
سے حیران وپریشان ہو جاتے ہیں۔ اُن کی معصومیت شیلے کی معصومیت سے مختلف ہے۔ کیوں کہ اس کے یہاں فرزانگی
اور زندگی وزمانہ کے آہنگ کا شعور ملتا ہے۔ سجاد حیدر تشبیہیں اور استعارے بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر استعمال کرتے ہیں
منظرکشی کا بھی التزام کرتے ہیں اور جذبات اور احساسات کی لطافت اور رنگینی سے بھی پڑھنے والے کے شعور کو چھونا چاہتے
ہیں مگر ہر جگہ کسی عنصر کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں فراوانی اور بھرپور کیفیت پائی جاتی ہے۔ زیروبم نہیں ملتا۔

ان کی رومانیت کے عناصر ان کا جذباتی اور تخیلی نقطۂ نظر، ان کے موضوعات کا انوکھا پن اور اُن کی تحریر کی مرصع کاری ہے
وہ رنگین و رعنا نقوش سے ایک ایسی فضا تیار کر دیتے ہیں، جہاں حقیقت تحلیل ہوتی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اُن کے یہاں
تحیّر کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ مگر اُن کے نقوش ہلکے ہوتے ہیں۔ اُن کی تراکیب میں ندرت تو ضرور ہے۔ مگر اس انفرادیت
میں توانائی اور کس بل کسی قدر کم ہے۔ اُن کے یہاں ہر جگہ ایک تکلف اور تذبذب پایا جاتا ہے۔ اُن کے یہاں زندگی
ڈرائنگ روم کی آرائشوں اور صحبتوں تک محدود ہے یا طبقۂ اعلیٰ کی خواتین تک، یا مفروضہ جزیروں کی مدہوش کن فضا
تک یہ نظریہ کتنا محدود اور سطحی ہے۔ اُن کے یہاں زندگی کا رس نہیں۔ صرف تہذیب کی چمک دمک ہے اور اسی لئے
ہمارے ذہن، تخیل کو اُکسانے اور آسودگی بخشنے سے معذور رہتے ہیں۔ اُن کے افسانے محدود پیمانے پر مینا کاری کے
نمونے ہیں اور مینا کاری بھی صرف نظر افروز ہے۔ دل نشیں نہیں۔ اُن کے خواب بھی ادھورے ہیں اور اُن میں وہ بلاغت
رمزیت اور اثر آفرینی نہیں جن سے خوابوں پر حقیقت کا گمان ہونے لگے۔ یلدرم کے یہاں بیکراں کیفیت نہیں پائی جاتی
ایک جوئے آب کا ارتعاش زیریں ہے۔ وہ جذبہ کی متانت و عفت پر زور دیتے ہیں اور اس حد تک کہ جذبہ احساس میں
تبدیل ہو جاتا ہے اور احساس بھی گھٹا گھٹا اور کمزور سا۔ یلدرم کی محبت بھی ایک نوجوان کی پُرزور جنسی کشش نہیں، جو
جنسِ مخالف کے لئے محسوس کرتا ہے بلکہ آغازِ شباب کی سادہ، انجان، دل گرفتہ، ماورائی اور انجام و منتہا سے بے خبر اور مستغ
ترسیل جذبات سے یلدرم کبھی حقیقت سے اتنے آشنا ہی نہیں ہوئے کہ اسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے۔ اُن کے
افسانے باقاعدہ افسانے نہیں ہیں بلکہ اندرونی کیفیات کے مدوجزر کا ایک تصویر خانہ ہیں۔ یلدرم کے مزاج میں شعریت
کا احساس ہے مگر گہرا اور رچا ہوا نہیں۔ وہ جذبات کی کشمکش سے دامن بچا کر نکل جانا چاہتے ہیں۔ صرف "نکاح ثانی" ا
سے ایک حد تک مستثنےٰ ہے۔ یلدرم زندگی کی ایک حسین، رنگین اور کیف و وجد میں ڈوبی ہوئی، رواں دواں تصویر پر ایک
نظر ڈال لینے پر قناعت کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے حُسن کو متحرک، مجسّم اور منقلب انداز میں دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ وہ صرف
جلوؤں کی تاب لا سکتے ہیں۔ پوری تصویر کے حُسن کو جس میں لامحدودیت کے امکانات پوشیدہ ہوں۔ اپنے تخیل اور تصور کی گرفت
میں لانا اُن کے بس کا کام نہیں۔ اُن کی ماورائیت بھی کھوکھلی ہے۔ یلدرم کی ترکیبیں بھی پڑھنے والے کے ادراک پر اثر انداز نہیں
ہوتیں۔ میرا خیال ہے کہ ترکی افسانوں کے کثیر تراجم نے یلدرم کی تخلیقی قوتوں کی آزاد نشوونما میں ایک طرح کی رکاوٹ ڈال دی
یہ بیان عام رائے کے خلاف معلوم ہوگا مگر یہ واقعہ ہے کہ غیر زبانوں کے اثرات کو تخلیقی طور پر بارآور بنانے کے لئے یہ ضروری ہے
کہ یہ اثرات ایک پُرزور متنوع اور گہری شخصیت کی تہوں میں جذب ہو کر برآمد ہوئے ہوں اور یلدرم کی شخصیت میں تاہم یلدرم کی
تحریروں میں ایک متوازن شعریت، ایک رنگین خوش نوائی اور ایک نادر تصویر کشی ملتی ہے جو چند لمحوں کے لئے حقیقت کی بے رنگی کو ڈھ
دیتی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ کیجئے۔

"ان دونوں کی رُوحیں ایک مبہم شوق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں اور اس دفعہ دونوں کی آنکھوں
میں ایک جاں فزا چمک ایک دلفروز چنگاری نکلی، موجیں ساحل کی طرف کیسے آتی ہیں؟ آفتاب کائنات پر کس طرح روشنی ڈالتا
ہے؟ شہد کی مکھی کس طرح پھولوں کی طرف جاتی ہے؟ بس بالکل اسی طرح ان دو بیگانہ رُوح آشنا کے ہونٹ ایک قدرتی

کشش، ایک فطری شوق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے۔"

"ان دونوں کا ایک دوسرے کا بوسہ لینا لینا تھا کہ جزیرے کے پرند چہچہا کر اُڑنے لگے۔ تمام کلیاں ایک دم کھل گئیں۔ ایک گرد باد آہنگ، ایک زمزمۂ جوش و خروش نے کُل جزیرے کو گھیر لیا۔"

"اس کے ہنستے ہی اس جزیرے کے پہاڑ اور گھاٹیاں سبز ہو گئیں۔ سیاہ غمناک کانٹے پھول اور سنبل بن گئے اور عورت کی جادو بھری نظر اور نیم خندہ سحر نے اس مصیبت زدہ طائفہ کو جو مدت سے شفقت کے لئے ترس رہا تھا، جان تازہ بخش دی۔"

"اگر میں صحرا نشین ہوتا تو طلوع و غروب آفتاب کے نظارے سے ہر روز متاثر ہوتا، چاندنی رات کو میں دیکھتا کہ چاند اور ستارے زمین کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ اندھیری رات میں تمام عالم کی تاریکی اور ہر چیز کی خاموشی مجھ پر اثر کرتی اور میں اپنے دل میں عمیق حیات محسوس کرتا۔ میں کسی وادی میں گڈریہ ہوتا، پُر فضا گھاٹی کے پھول اور اُن پھولوں کو دیکھ کر رنگین اور لطیف گانے گانے والی بلبل، ہلکے آواز سے گرنے والے آبشار مجھے گھنٹوں حیرت زدہ رکھتے اور میں پُر مسرت زندگی بسر کرتا۔"

"اسے تا ابد لڑکی رہنا چاہیئے تھا اور مجھے تا ابد لڑکا رہنا چاہیئے، یہ حالت بڑھنے والی، کبھی نہ گھٹنے والے برسوں کی نامتناہی مدت کے ساتھ قائم رہنا جاری رہنا چاہیئے تھی۔ یہ خواب بغیر اس کے کہ حقیقت کا فریب اس پر لگے۔ یہ افق گریزاں بغیر اس کے کہ حد پر پہنچے۔ یوں ہی دراز ہوتے رہنا چاہیئے تھا۔ ضرور ایک نہ ایک وقت آتا۔ ضربِ حقیقت میں شگوفۂ خیال پڑ کر اسے بکھیر دیتا۔ اس کے مقابلہ کے لئے ہم کیا کر سکتے تھے"

"سمندر کے قریب، سمندر کے کنارے، پارسنوں کا لشکر فریب مجمع تھا .... لڑکیاں بال کھولے طرح طرح کی پھول دار ٹوپیاں پہنے، سمندر کے کنارے گھونگے اور سیپیاں جمع کرتی تھیں۔ آسمان پر قوسِ قزح نکلی ہوئی تھی جس کے کنارے سمندر سے آکر ملتے معلوم ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوس و قزح کی اقلیم میں قوس قزح کی پریاں پھر رہی ہوں اور قوس قزح کی ملکہ کا یہ حکم ہے کہ جسے رنگ کی لطافت سے لگاؤ نہ ہو۔ وہ یہاں نہ آئے۔ مسلمان عورتیں یہاں نہ تھیں۔ وہ پھولوں کے درمیان، سمندر کے کنارے، آبشاروں کے قریب سبزہ کے اُوپر، موسیقی سے بھری ہوئی، فضا میں کب ہوتی ہیں؟"

"تاڑوں کی تاریکی پر اہرمن اپنے چمکدار چنگلوں سے خون گرا رہا تھا کہ ہم ایک لمحہ میں ایک بوسہ کے ساتھ ایک عمر بسر کر گئے۔ اب اس رات کی تاریکی میں لرزتی لرزتی اپنے کرہ کو لڑھکاتی اور آگے آگے آتے وقت قدمیں بڑھتی آتی ہے اور اپنی عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیتی ہے۔"

(علی گڑھ میگزین — ۱۹۵۵ء علی گڑھ نمبر)

سیّد اظہار الحسن، بی، اے، ایل ایل، بی

سیّد سجاد حیدر

ادیبِ جمیل سیّد سجاد حیدر، بی اے، نہٹور ضلع بجنور کے ایک ممتاز خاندانِ سادات کے چشم و چراغ ہیں جس کے اکثر افراد صاحب عزت و حشمت ہیں۔ لیکن جو شہرت اور عزت سیّد سجاد حیدر کو حاصل ہوئی ۔ وہ کسی دوسرے کا مقدر نہ تھی۔ بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں لیکن کالج میں پہنچنے کے بعد ہی سے یہ قول حضرت سعدیؒ بالائے سرش ستارہ بلندی چمکنے لگا تھا۔ شبلیؒ جیسے باکمال اُستاد اور مولانا محمد علی اور حسرت موہانی جیسے صاحبِ ذوق رفیقوں کے فیضِ صحبت نے سیّد صاحب کی ہونہار طبیعت کے ساتھ سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور بالآخر سیّد صاحب نے دُنیائے ادب میں وہ پوزیشن حاصل کرلی جس پر ہر ایک ادیب کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے

آپ کی شادی ضلع بلند شہر کے ایک معزز خاندان میں ہوئی اور اُردو ادیبوں میں یہ فخر تنہا آپ کو حاصل ہے کہ آپکی بیگم صاحبہ بھی دُنیائے ادب میں بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔ محترمہ نذر سجاد صاحبہ عالمِ نسواں کا ایک گوہرِ درخشندہ ہیں اور ادبِ اُردو متعدد تصانیف کے لئے آپ کے رشحاتِ قلم کا ممنون ہے۔

علی گڈھ کالج نے اپنے پچاس سالہ دَورِ حیات میں جتنے باکمال پیدا کئے، اُن میں سیّد صاحب کا درجہ بہت ممتاز ہے۔ کالج کی زندگی آپ نے نہایت ناموری کے ساتھ گذاری۔ انجمن اُردوئے معلیٰ اور یونین وغیرہ کی خدمات آپ سے وابستہ رہیں۔ شاعری کا آغاز بھی اسی زمانہ سے ہُوا اور کالج کی چہل پہل اور روایتوں کے درمیان اُس کی پرورش ہوئی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد آپ برطانوی سفارتخانہ سے متعلق ہوکر بغداد شریف چلے گئے۔ لیکن ادبی ذوق نے وہاں بھی اس غریب الوطن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور "یلدرم از بغداد" کے اکثر مضامین ہندوستان کے اُردو رسائل بڑے فخر سے شائع کرتے رہے۔ نصیح الملک کا ماتم ارض عراق میں کیا۔ بنزئی جاپان بنزئی کی مشہور رزمیہ نظم بھی سواحلِ دجلہ و فرات کے حصہ میں آئی۔

علی گڈھ کالج کے سابق متعلمین کو جو وابستگی اپنی مادرِ تعلیمی کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ کچھ اُنھیں کے لئے مخصوص ہے۔ سیّد صاحب کو بھی الفت کالج سے بہرہ وافر ملا ہے جس کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ہوتا رہتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے آغاز سے سال گذشتہ تک آپ رجسٹرار اور شعبۂ اُردو کے اعزازی ریڈر رہے۔ اسی دوران میں آپ نے مرحوم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے حق میں مسیحائی کی۔ نہ صرف ایسوسی ایشن مذکور آپ کی اَن تھک کوششوں سے از سرِ نو زندہ ہوگیا بلکہ اُس کی اپنی "لاج" بھی واپس مل گئی۔ اسی زمانہ میں آپ ممالک ترکیہ کی سیاحت کے واسطے تشریف لے گئے۔ وہاں کے اکثر مشاہیر سے آپکے دوستانہ تعلقات ہیں۔

سیّد صاحب مغربی تہذیب کو پسند فرماتے ہیں۔ لباس قطعی انگریزی ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی ترکی ٹوپی زیبِ سر فرما لیتے ہیں۔

طرزِ معاشرت میں بھی انگریزی تہذیب کی جھلک بہت نمایاں ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ آپ ایک ایسے محکمہ سے وابستہ کر دیئے گئے جس سے آپکی ادب دوستی کو قطعی کوئی مناسبت نہیں یعنی آپ ڈپٹی کلکٹر ہیں۔

معارف (علی گڈھ) اُردوئے معلیٰ۔ مخزن (دورِ اوّل) زمانہ علی گڈھ میگزین۔ ہمایوں۔ سہیل اور نیرنگِ خیال کے صفحات اکثر آپ کے نقوشِ قلم سے مزین ہوتے رہے ہیں۔ "خیالستان"، "حکایات و احساسات"، "ثالث بالخیر"، "زہرا" اور "جلال الدین خوارزم شاہ" آپ کی مستقل تصانیف ہیں۔ خیالستان اور حکایات آپکے متفرق مضامین اور افسانوں کے مجموعے ہیں جن میں سے بعض طبعزاد ہیں اور بعض ترکی وغیرہ سے ملخص اور ماخوذ۔ "جلال الدین خوارزم شاہ" مشہور ترکی ادیب نامق کمال بے کے معرکتہ الآرا ڈرامہ کا بے مثل ترجمہ ہے۔ "ثالث بالخیر" اور "زہرا" بھی ترکی کے تراجم ہیں۔ اگرچہ سید صاحب فنِ شعر میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں لیکن اس صنف میں ہنوز کوئی مستقل تصنیف آپکی شائع نہیں ہوئی ہے اور نہ غالباً آپ ایسی کوئی تصنیف شائع کرنا پسند فرماتے ہیں۔

میر سوزؔ مرحوم نے ایک دفعہ شاعروں کی کثرت کے سلسلہ میں کہا تھا ؎

ڈھونڈتے ہیں پر تخلص بھی نیا ملتا نہیں

سید صاحب نے اس مقولہ کو بالکل غلط ثابت کر دیا ہے۔ کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا کہ اُردو کے کسی اور شاعر کا تخلص یلدرم ہو۔ اس سے آپکی جدت پسندی کے علاوہ اُس شغف کا بھی اظہار ہوتا ہے جو آپکو ترکی زبان و ادب سے ہے۔

سید صاحب ہندوستان کی اُن چند معدودے ہستیوں میں سے ہیں جن کو ترکی زبان و ادب میں دستگاہ حاصل ہے۔ آپ نے ترکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ترکی ادیبوں کے دلکش اور اچھوتے خیالات نے سید صاحب کی بے چین طبیعت پر خاص اثر کیا۔ یہاں تک کہ ترکیت نے آپکی تصانیف میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ اُردو دان طبقہ کو ترکی ادب سے روشناس کرانے کا فخر تنہا سید صاحب کو حاصل ہے۔ آپکے بیشتر مضامین اور تصانیف ترکی سے ماخوذ ہیں۔

اب سے کچھ عرصہ قبل اُردو میں ادبِ لطیف کا عنصر بالکل نہ تھا۔ یا نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس معاملہ میں بھی ادبِ اُردو سید سجاد حیدر کا ممنون ہے۔ اس رنگ کو سچ پوچھو تو آپ نے چار چاند لگا دیئے بہ قول ایک ناقد کے:۔

"اس وقت ملک میں جتنے نمونے ادبِ لطیف کے موجود ہیں۔ ممکن ہے اُن کے متعلق اختلافِ آرا ہو سکے لیکن سید صاحب کی تصانیف کے متعلق کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔"

سید صاحب ایک مخصوص رنگ کے مالک اور صاحبِ طرز اُستاد ہیں۔ آپ کا تتبع آسان کام نہیں اور یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص آج تک آپکی کامیاب تقلید نہ کر سکا۔ آپکی عبارت نہایت صاف، شگفتہ، پُرزور اور دلچسپ ہوتی ہے۔ کوئی مضمون یا افسانہ اُٹھا لیجئے۔ ناممکن ہے کہ آپ اُس کو ختم کئے بغیر چھوڑ دیں۔ جملوں کے اندر روانی اور جوش کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سلاست بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتی۔ موقع اور محل کا لحاظ بھی رہتا ہے۔ بندش بھی چست ہوتی ہے۔ اندازِ بیان کی رنگینی عبارت کو اور بھی دلآویز بنا دیتی ہے۔ غرض آپکی تحریریں انشا پردازی کی جان اور فصاحت و بلاغت

کا اچھا نمونہ ہوتی ہیں۔

آپ کے مضامین تخیل سے مالا مال ہوتے ہیں۔ آپ جس خیال کو اس کی مکمل تصویر ناظرین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ اُسی ماحول میں ہے جس میں کہ خود مصنف ہے اور یہی تصنیف کا کمال ہے۔ ذیل میں آپکے مضمون " ہجوم میں تنہائی " سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:۔

" دوست سے دوست، محبوبہ عاشق سے یا بالعکس محبوبہ عاشق سے جدا ہو رہا ہے۔ ہار پہنائے جا رہے ہیں۔ گلدستے پیش کئے جا رہے ہیں۔ لنگر اُٹھا۔ جہاز آہستہ آہستہ ساحل سے ہٹنا شروع ہوا۔ رخصت کرنے والوں کی ساحل اور ڈک پر صفیں کھڑی ہو گئیں۔ رومال کبھی آنکھوں پر جاتے ہیں، کبھی ہلتے ہیں۔ کوئی مسکرا مسکرا کر جانے والے کو ساحل پر بلا رہا ہے۔ جانے والا ساحل کے دوست کو اشارے سے ڈک پر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ پرنشہ وداع، حزین فراق دونوں یہاں موجود ہیں۔ جہاں ہر طرف مصافحے، معانقے ہو رہے ہوں، وہاں اپنا ہاتھ جیب میں ہونا بھی دل پر عجیب اثر کرتا ہے۔ میں ہجوم میں تنہا ہوں "

" ان سینکڑوں رومالوں میں سے میرے لئے ایک میں جنبش نہیں اور نہ میرا ہاتھ رومال کو اُس کے آرام کی جگہ سے کسی کے لئے باہر لانے کی کوشش کرتا ہے "۔

" جس طرح کسی دوسرے سیارہ کا باشندہ ہمارے حرکات کو بے پروایانہ انداز سے دیکھتا ہوگا۔ اسی طرح میں اس ہجوم کی حرکات پر نظر ڈال رہا ہوں۔ انداز بے پروایانہ ہو مگر نظر رشک آمیز ہے "۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ محض چند جملوں میں اس زبردست ادیب نے کتنی کامیاب مصوری کی ہے۔ جہاز کے ساحل چھوڑنے کی مکمل تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے۔ کیا " ہجوم میں تنہائی " کی اس سے بہتر مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ آخری فقرہ بجائے خود ایک تصویر ہے۔

مزاح (Humour) کا عنصر بھی آپ کے مضامین میں بہت نمایاں ہوتا ہے اور جس خوبی سے آپ اس کو نبھاتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ ظرافت کے پیرایہ میں واقعات کا خاکہ کھینچنا بلکہ فطرت کی مصوری کرنا آپ کا خاص انداز ہے۔ لیلیٰ مجنوں کے واقعات بہت فرسودہ ہو گئے ہیں اور اب اُن میں دلفریبی کی شان پیدا کرنا آسان کام نہیں لیکن سید صاحب نے اس " ایام جاہلیت " کے فسانہ کو کچھ اس طرح سے بیسویں صدی کے " متمدن " دور سے متعلق کر کے پیش کیا ہے کہ بے ساختہ ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ حکایہ لیلیٰ مجنوں پڑھیے اور سید صاحب کے کمال کی داد دیجیے۔ ضمنی طور پر جو فوٹو تہذیب مغربی اس فسانہ میں پیش کیا گیا ہے وہ خاص طور پر قابل التفات ہے۔ اس فسانہ کا اقتباس پیش کرنا دراصل مصنف پر ظلم کرنا ہے۔ اس کا لطف اُٹھانا ہو تو " خیالستان " ملاحظہ فرمائیے لیکن میں اس کا آخری جزو یہاں پیش کرتا ہوں جس سے سید صاحب کی شان انشاپردازی کا اندازہ ہو سکے گا:۔

" قیس کا باپ اپنے " دُنیا کی نظر میں دیوانے " بیٹے کی حالت سے مایوس ہو کر اجابتِ دُعا کی

اُمید میں مکّہ آیا - وہاں آیا جہاں ہر شخص اپنی عزیز ترین تمنائے کر آتا ہے اور جہاں جس در کے سامنے، جس چھت کے نیچے۔ سب سے زیادہ صمیمی اور سب سے زیادہ دلی دعائیں مانگی جاتی ہیں - یا زیادہ صحیح یہ کہ ہر جگہ سے زیادہ توی امید اجابت کے ساتھ تخت سماوی کی طرف جاتی ہیں (ورنہ صمیمیت تو دُنیا کے ہر گوشہ میں فریادِ قلب کر رہی ہے) وہاں وہ اُسے لیکر پہنچا - خود خضوع و خشوع سے دُعا مانگی اور قیس سے بھی کہا کہ اپنی قابلِ رحم حالت سے نجات پانے کے لئے دستِ دعا اُٹھائے۔"

"اور قیس نے دستِ دُعا اُٹھائے اور انتہائے صمیمیت غایت تضرع سے، اعماقِ دل سے نکلنے والی صدائے دعا مانگی - مگر کیا ؟ وہی جو اُس نے سیکڑوں برس پہلے مانگی تھی - اور جو ہر قیس طبیعت چاہے وہ کہیں ہو، اور کسی زمانہ میں ہو، مانگے گا :-

"میں جس مصیبت میں مبتلا ہوں، خدا کرے وہ کبھی کم نہ ہو۔"

سیّد سجّاد حیدر قدرت کی طرف سے گداز دل لے کر آئے ہیں - فطرت نے آپ کو شاعر پیدا کیا ہے اور شعریت آپ سے جُدا نہیں ہو سکتی - آپ نے نثر میں بھی شاعری کی ہے - "خارستان اور گلستان" اور حضرتِ دل کی سوانح عمری جو اُنھوں نے اپنے کاتب خصوصی سیّد سجّاد حیدر سے لکھوائی - پڑھیئے - کیا آپ اس کو شاعری نہ کہیں گے ؟

حضرتِ دل فرما رہے ہیں :-

"دوسری حسین اور خوب صورت چیز جس نے مجھے اپنی طرف کھینچا وہ شمع تھی - یہ نورِ عُریاں مجھے گھنٹوں محوِ حیرت رکھتا تھا اور کہیں قریب ہُوا تو مَیں اُس سے ملنے کے لئے بے اختیار اُسکی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔"

"لیکن یہ کیا ؟ مجھے روکتے تھے - کیوں ؟ کیوں مجھے اس حسین شے سے ملنے نہیں دیتے تھے ؟ اس لئے کہ پہلے کی طرح ہر حسین شے شفیق نہیں - یہ حقیقت، یہ دلکش حقیقت مجھے بعد میں معلوم ہوئی - اچھا ہوتا جب ہی معلوم ہو جاتی۔"

خط کشیدہ عبارت کسی شعر سے کم دلچسپ نہیں - جنابِ دل اپنا مغرب کا تجربہ یوں بیان فرماتے ہیں :-

"مگر مغرب میں سب سے زیادہ ظالم (فریاد - فریاد اُنکے ستموں سے) وہ تھے جو تیر مارتے تھے - برچھیاں کھبوتے تھے - لیکن جب ہم شکایت کرتے تھے تو صاف مُکر جاتے تھے "ہم نے نہیں مارا" پہلے تو مَیں اسے بناوٹ سمجھا - ملتجی نظروں سے اُن کی طرف دیکھا اور عرض کیا "مَیں آپکو جھوٹا نہیں بنانا چاہتا - لیکن مَیں نے دیکھا کہ آپ نے تیر مارے"

"میری ملتجی آنکھوں کا اُن آنکھوں سے ملنا تھا کہ سیکڑوں ہزاروں تیروں کی پے در پے بوچھاڑ پڑنے لگی - مگر اُن کو اُس وقت عین اس بوچھاڑ کے وقت بھی اپنی بے تقصیری پر اصرار تھا۔"

"یہ ہم پر بہتان ہے - تیر و یر کیسا (اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے) ہم کچھ نہیں جانتے اور ہزاروں تیر برسا دیئے - تم اس قدر زخمی کیوں نظر آتے ہو - کس نے گھائل کیا ؟ اور ایک نظر - ایک ترحم انگیز اور ہوش رُبا نظر

ڈالی اور ایک لاکھ برچھیوں نے مجھے چھلنی کر دیا۔"

"ہے ہے، اس قدر نہ تڑپو، کس بے رحم نے تمھیں خون میں سرابور کر دیا مگر بجریا کی کٹر یا سے اور کچو کے لگا دیئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت میں اُنھیں اپنے ظلموں کی خبر نہیں۔ تیروں کی بوچھاڑ عمداً نہیں کی جاتی بلکہ اپنے آپ ہوتی رہتی ہے۔ اُف اُف! خدا ان تیر اندازوں سے پالا نہ ڈالے۔ کھلے بند قزاق زخم لگا کے بھاگ جانے والے قزاق یا ٹھگ۔ ان سب سے میں سینہ سپر ہو سکتا ہوں اور ہوا ہوں لیکن اس تیسری صنف سے تاب مقاومت نہیں۔ نہیں بالکل نہیں۔"

میں نہیں سمجھ سکتا کہ شاعری میں اس سے زیادہ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ شاعری نہیں تو کیا ہے۔

آپکے مضامین کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپکو اپنے گرد و پیش کے حالات پر گہری نظر ڈالنے اور معمولی معمولی واقعات سے اہم نتائج اخذ کرنے کی عادت ہے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ "انسان کے لیے بہترین مضمون مطالعہ خود انسان ہے"۔ سید صاحب نے بھی اس "طرفہ معجون" کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ "چڑیا چڑے کی کہانی" سب نے اپنے بچپن میں سنی ہوگی۔ سید صاحب نے بھی یہ کہانی اپنے مخصوص طرز میں لکھی ہے۔ اس سے جہاں آپکی جدت پسندی، انوکھے طرز بیان اور زبان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فطرتِ انسانی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ دو بے زبان جانوروں کی زبانی جبلّت انسانی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کس قدر دلکش مضمون ہے، کتنا دلفریب انداز بیان ہے۔ کیا یہ آپکا روزمرّہ کا تجربہ نہیں کہ "دوستوں" میں آپکا کس قدر وقت ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات کتنا بے محل دخل در معقولات آپکے نظام میں دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی آپ خود بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ مجبور ہیں۔ آپ کو سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر اس پر بھی آپ دوست نہیں ہیں تو آپ خود کو بدقسمت سمجھیں گے۔ یہی معمولی باتیں ہیں جن کو سجاد حیدر نے اپنے اچھوتے انداز میں پیش کر دیا ہے۔ سر سید نے بھی ایک مضمون میں مہمان نوازی کے طریقوں پر نکتہ چینی کی تھی، لیکن دونوں میں فرق محض اتنا ہے کہ سر سید کا مضمون کسی زاہد خشک کا وعظ ہے اور سجاد حیدر کا فسانہ کسی زندہ دل کا چبھتا ہوا فقرہ۔ آپ خود خیال کر لیجئے کہ اثر کس کا زیادہ ہوگا۔

محترمہ ز۔ خ۔ش صاحبہ ضلع علی گڈھ کے مشہور شروانی خاندان کی ایک رُکن اور دورِ موجودہ کی ایک باکمال اور ادب نواز خاتون تھیں جنھوں نے عین عالمِ شباب میں سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ اس سانحۂ جاں گداز سے جو ناقابلِ تلافی نقصان ادب اُردو کو پہنچا اُس سے سید صاحب کا حساس دل تلملا اُٹھا اور حُسن عقیدت کے یہ پھول "ہمایوں" کے صفحات پر بکھیر دیئے گئے:۔

"وہ عندلیبِ خوش الحان جس کے عرفان پاش نغمے اس کے قفس کی تیلیوں سے نکل نکل کر ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے یکایک خاموش ہوگئی۔ نغمے فضا میں متلاطم ہیں مگر عندلیب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساکت! وہ حقیقت طراز مگر شیریں آواز سراپردہ دولت کے پیچھے سے (جہاں سے بے معنی خندہ اور فضول مکالمہ کے سوا کچھ کم سنائی دیتا ہے) سُنا رہی تھی کہ صدق و صفا، علم و عرفان، سوز و التہاب، درد و گداز کیا ہیں! اور صدق و صفا، علم و عرفان، درد و گداز سوگوار ہیں کہ اُن کی مشاطہ اُنکو دل آویز آرائشوں میں اب پیش نہ کرے گی۔

وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی۔ قفس میں جی اور اُس نے قفس ہی میں دم توڑا۔ اس چند گز نیلگوں آسمان کے سوا جو اُس کے صحن خانہ پر حسرت بار رہا اُس نے فطرت کی زیبائش، آفریدہ دست انسان کی آرائش نہ دیکھی۔ آفتاب جو دُنیا کو حرارت بخشتا ہے۔ تیلیوں کے لپٹے ہوئے کپڑے سے گزر نہ سکا لیکن خود اُس کے قلبِ منور نے ایک شمع روشن کی جس نے اُسے باہر کے نور سے بے نیاز کر دیا۔ شمع تخیل!

وہ اپنی مختصر مگر متجلی زندگی میں اپنے تئیں خاک نشین ز۔خ۔ش کہاں کی۔ آج حقیقتاً وہ خاک نشینی کی آرزومند آسودۂ خاک ہے ؏ خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود"

مرزا داغ اور امیر مینائی کے مرثیے نظم میں ہیں۔ مگر آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ مرثیۂ نثریہ بھی کس قدر پُرسوز و تاثیر ہے۔ خاتون مرحومہ کی حیات اور تصانیف پر ایک مجمل مگر مکمل تبصرہ ہے۔ بندشوں کی چستی اور موزونیت۔ الفاظ کی برجستگی، عبارت کی بیساختگی، اور روانی سب نے مل کر مرثیہ کو کتنا پُر اثر بنا دیا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے ایک دفعہ مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کی تعریف اپنے ایک شعر میں اس طرح فرمائی تھی ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

ابوالکلام کی نثر میں کس کو کلام ہو سکتا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ حسرت کے رفیق التعلیم یلدرم کی نثر بھی نظم پر فوقیت رکھتی ہے۔

"ثالث بالخیر" "زہرا" اور "جلال الدین خوارزم شاہ" ترکی کے تراجم ہیں اور اُن کا کمال یہ ہے کہ تراجم معلوم نہیں ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میدان میں سید صاحب کو خاص مہارت ہے۔ ترکی سے جس قدر نفیس ترجمہ آپ کرتے ہیں وہ آپ اپنا جواب ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ترجمہ میں اس کا لطف باقی نہیں رہا کرتا۔ مگر سید صاحب بعض اوقات ترجمہ کو اصل سے زیادہ دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ "جلال الدین خوارزم شاہ" سید صاحب کا تازہ کارنامہ ہے۔ ترکی میں اس ڈرامہ کو کلاسکس کی حیثیت حاصل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اُردو میں بھی اس کی یہ حیثیت برقرار رہے گی۔ اُردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ اس میں اب تک بلند پایہ ڈراموں کی بہت کمی ہے۔ عامیانہ مذاق کے ایک دو نہیں درجنوں ڈرامے موجود ہیں لیکن ذوقِ صحیح مفقود ہے اور (بعض قابل تعریف مستثنیات کو چھوڑ کر) قومی خدمت کا خیال عنقا۔ اس طوفانِ بدتمیزی میں سید صاحب کی یہ کاوش مستحق ہزار تحسین ہے۔

پرنسپل مشتاق احمد زاہدی

سیّد سجّاد حیدر یلدرم

بحیثیتِ شاعر

سید سجاد حیدر یلدرم کی شہرت بحیثیت ایک مصنّف اور مضمون نگار کے ہے جس نے ایک پسندیدہ طرزِ تحریر کی طر
ڈالی۔ لیکن عام طور پر اُن کے مضامین کے شائقین کو یہ معلوم نہیں کہ سید صاحب موصوف شاعر بھی تھے۔ اگرچہ اُنھوں
شاعری کو کبھی ذریعۂ عزت نہیں بنایا اور نہ کبھی شاعر ہونے کا دعویٰ کیا۔ بلکہ جب اُن کو لکھنؤ کے ٹریننگ کالج والو
نے اپنے مشاعرے کا صدر بنایا تو اُنھوں نے تیسری دفعہ صدارت کرتے ہوئے ذیل کی نظم میں اس طرح کی شاعر
کے دعویٰ سے انکار کیا ہے اور آئندہ کے لئے صدارت سے معافی مانگی ہے:۔

کیوں مجھ کو کیا ہے صدرِ مجلس — کیوں مجھ کو عطا ہوئی یہ جاگیر!
جب دیکھئے تخت پہ ہُوں بیٹھا — منبر پہ ہو جیسے واعظِ پیر!
مانا کہ ہے میرا نالہ دِل کش، — ہے دِل میں تڑپ زباں میں تاثیر
رنگینی بھی ہے سخن میں ایسی، — ہوتا ہے جوان ــــ عالمِ پیر
ہے توسنِ طبع شوخ و طرار — چال اس کی کڑی کماں کا۔ تیر
لیکن نہیں شاعری کا دعویٰ — ہاں نثر میں کچھ کیا ہے تحریر
یہ شوخیٔ محض ہے وگرنہ — کیا ہیچمدان کی ہیچ، تحریر
ہُوں شاہدِ شعر کا مَیں شیدا — بس اس لئے ہے مری یہ توقیر
صد شکر ز سعی نوجواناں — یک قصر ادب شدست تعمیر
اس بزم میں ایک ادیبِ کہنہ — کیوں لائے ہیں آپ بہر تشہیر!
تھا گوشۂ انزوا میں مخفی، — کیوں کھینچ کے لائے پا بہ زنجیر
ممنون کرم ہوں لیکن اب تو — ہے تیسری مرتبہ ــــ یہ تعزیر
رسم است کہ شائقین تحریر، — آزاد کنند ــــ بندۂ پیر

سید سجاد حیدر صاحب اس معنی میں شاعر نہیں تھے کہ وہ بڑے بڑے مشاعروں میں دادِ سخن حاصل کرتے۔ اور صاحب دیوان ہوتے۔ لیکن اس معنی میں شاعر ضرور تھے کہ شعر کہتے تھے اور اچھا شعر کہتے تھے۔ ان کا توسنِ طبع جس طرح نثر میں شوخ و طرار تھا۔ اسی طرح نظم میں بھی ہوا سے باتیں کرتا تھا۔ "مرزا پھویا" کے عنوان سے جو نظم انہوں نے طالب علمی کے زمانہ میں اب سے چالیس برس قبل لکھی تھی۔ اُن کے مضامین کے مجموعے "خیالستان" میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ نظم شروع میں "تفنن طبع" ایک دو ورقی اخبار میں نکلی تھی۔ یہ اخبار علی گڈھ کالج میں خفیہ طور پر طلباء کے تفنن طبع کے لئے وقتاً فوقتاً نکلا کرتا تھا۔ کبھی دستی لکھا ہوا اور کبھی چھپا ہوا۔ یہ نظم چونکہ عام طور پر مشہور ہے اس لئے اس موقع پر اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کی شانِ نزول دلچسپی سے خالی نہ ہوگی اس نظم میں لکھنؤ کے ایک نوجوان علی گڈھ کالج میں نئے نئے داخل ہو کر اپنے گھر خط لکھتے ہوئے کالج کی زندگی کی مصائب کا رونا روتے دکھائے گئے ہیں۔ ان نوجوان صاحب کی نظمی تصویر جو سید سجاد حیدر صاحب نے کھینچی ہے وہ "مرزا پھویا" کے نام ہی سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ "مرزا پھویا" کالج میں "خالہ اماں" کہلاتے تھے۔ کیوں کہ جس دن پہلی دفعہ یہ گاڑی سے اُتر کر بورڈنگ میں داخل ہوئے ہیں تو حضرت ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے تھے اور پاؤں میں گتھیلی جوتی۔ اور لطف یہ ہے کہ ہاتھ میں ایک پاندان لٹکائے ہوئے تھے۔ اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی یار لوگوں نے اُن پر خالہ اماں کی پھبتی کہدی جو ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ گئی۔ مگر سید صاحب نے اپنی نظم میں اُن کو "مرزا پھویا" کا خطاب دیکر اُنکے حلیئے کو بدل دیا۔ ان صاحب کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں، صرف اتنا اتا پتہ کافی ہے کہ وہ ہمارے مشہور قومی کارکنان میں سے ہیں۔ ایک زمانہ میں جیل کی ہوا کھا آئے ہیں۔ مزدوروں کے زبردست حامی ہیں اور ہندوستان کے مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ اگرچہ وہ بہت مالدار نہیں ہیں اور اس لئے جاہ پرست اُن کو لیڈر نہیں مانتے، لیکن اُن کو لیڈر بننے کی حسرت بھی نہیں۔

سید صاحب موصوف کی چند ایسی نظمیں میں پیش کرتا ہوں جو انہوں نے گزشتہ چند سال میں لکھی ہیں۔ اُن میں سے بعض اخباروں میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ "خطاب بہ نوجوانان" کے عنوان سے ۱۹ دسمبر ۱۹۳۴ء کو انھوں نے ایک نظم لکھی جس میں شاعر، ادیب و اہلِ قلم کی زندگی کو ناکامیاب اس لئے دکھایا گیا ہے کہ اُن لوگوں نے علم کو عقل سے جدا کر دیا ـــــــ فرماتے ہیں ؎

میدانِ جد و جہد میں اے نوجوان اُٹھ	کب تک پڑے رہوگے یونہی کوئے یار میں
کب تک قتیلِ دلبریِ شاہدِ سخن	مانا کشش بلا کی ہے اس سحر کار میں!
میں جانتا ہوں تشنۂ ذوقِ سخن ہو کیا	مدہوش رہ چکا ہوں میں اسکے خمار میں
دُنیائے حسن و عشق ہی پیشِ نظر رہے	داخل ہُما نہ زیست کے میں کارزار میں
بیٹھا رہا تصورِ جاناں کئے ہوئے	غالب کا میں شریک رہا انتظار میں

آہ و فغاں و نالہ تھا سرمایۂ حیات — حسرت ہی جانگزیں تھی دلِ داغدار میں
میں انقلابِ چرخ کا قائل رہا — مگر — منکر کہ انقلاب بھی ہے روزگار میں
جاگا تو دیکھا زیست ہے اہلِ عمل کی زیست
شاعر ہے کوئے یار میں وہ کارزار میں

ایک غزل ملاحظہ ہو جو سیّد صاحب نے ۲۴ر نومبر ۱۹۳۲ء کو بمقام غازی پور لکھی تھی :- ؎

بے حس ہے گرچہ داغ بظاہر نظر میں ہے — غم کی کسک ہمارے ہی داغ جگر میں ہے
کہتے ہیں حسرتوں کو مرے دل کی دیکھ کر، — ساماں اٹا ہوا بہت اس ٹوٹے گھر میں ہے
جس کو نہ ہو تمیز بھی زیبا و زشت کی، — اللہ کی شان آج وہ اہلِ نظر میں ہے
طفلی میں تیرہ بخت تو پیری میں تیرہ بخت — کیا فرق ہمنشیں مرے شام و سحر میں ہے
اظہارِ مدعا پہ فقط ہاں — مگر کہا — کیا جانے کیا چھپا ہوا ان کی مگر میں ہے
ایوانِ آرزو ہی میں ہے شانِ آرزو — جبتک ہے دل میں تب ہی تک اُنکی نظر میں ہے
کیوں اہلِ درد ہوتے ہیں اس درجہ اہلِ راز — حیرانی ایسی کس لئے اہلِ صبر میں ہے
سجاد بے قرار لئے قلب بے قرار
ہر وقت رہ نورد ہمیشہ سفر میں ہے

ایک اور کچھ غزل اور کچھ بقول سیّد صاحب کے عقدۂ لاینحل کے چند اشعار سُن لیجئے۔ عقدۂ لاینحل یہ ہے۔ سجاد صاحب کی طبیعت اچھی نہ تھی۔ یعنی مرض ذات الجنب سے خدا خدا کر کے نجات پائی تھی مگر اُن کو حج بیت اللہ کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ گھر والوں سے لڑ بیٹھے۔ اور کسی کے روکے نہ رُکے۔ چنانچہ اس عزم حجاز کے شوق کا اظہار اس رنگ میں کیا ہے ؎

○

کوئی اب شاملِ اربابِ وفا ہوتا ہے، — آج وہ مائلِ اندازِ جفا ہوتا ہے
کوئی اب داخلِ زندانِ بلا ہوتا ہے — کوئی اب عیش تنعم سے جدا ہوتا ہے
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مہ وانگنِ عشق — ہوس جاہ پہ اسے کون فدا ہوتا ہے
میری گستاخی پہ کیوں کوئی خفا ہوتا ہے — شوقِ پابوسی میں کیا اسکے سوا ہوتا ہے
چارہ سازِ غم و ہمراز سے کہا کہ اُٹھو! — مجھ سے پوچھے کوئی کیا اس میں مزا ہوتا ہے
چھوڑ کے کعبہ کو اب جائیں کہاں لات و منات — اُن پہ کیوں ظلم یہ اے میرے خدا ہوتا ہے
قیس عامر سا وہ مجنوں بھی ہے لاغر بھی ہے
نام سجاد ہے اور تم پہ فدا ہوتا ہے

سجاد صاحب آخر جب اپنے عزم بالجزم میں کامیاب ہوئے تو بیت اللہ پہنچکر اُنھوں نے ذیل کے چند اشعار موزوں کئے - جن میں سے بعض اس زمانے کے سیاسی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں - یہ اشعار مکہ مکرمہ میں ذالحجہ سن ہجری ۱۳۵۲ مطابق مارچ ۱۹۳۴ عیسوی کو لکھے گئے تھے۔

کعبہ کے سامنے

آوارہ گرد آج ترے در پہ ہے کھڑا — اللہ کیا کشش ہے ترے آستانے میں

تشکیک و شبہ دشمنِ ایمان ہی رہے — سُنتا ہوں دل کا چین ہے تیرے خزانے میں

صحرائے بے گیاہ ہو اور کوہ ہائے خشک — کیا رمز تھا یہاں چمنِ دیں کھلانے میں

دل کو نہ جب خشوع و خضوع ہی ہوا نصیب — کیا فائدہ ملا مجھے سر کے جھکانے میں

احرام و طوف سارے ظواہر تو مِل گئے — اے کاش اور کچھ بھی ملے اس ٹھکانے میں

مسلم کو جس طرح سے ستاتے ہیں اہلِ دہر — ہے پاسبانِ حرم کا بھی ماہر ستانے میں

رنگین حجاز ترک عرب کے لہو سے تھا — کوشاں ہے نجدا اور اسے رنگیں بنانے میں

یہ سب تو ہے مگر مرے اللہ یہ نہ ہو — اغیار دخل پائیں ترے آستانے میں!

واقف ہے تو کہ درد بھرا ہے ہمارا حال — کیا تیرے آگے درد بھروں اس فسانے میں

طیارہ کامراں میں ہے جدے پہ ہے جہاز
تو اپنے گھر کو خود ہی بچا اس زمانے میں

چند اشعار اُن حضرات کی شان میں لکھے ہیں جو سیاسی شہادت حاصل کرنے پر تلے ہوئے تھے - فرماتے ہیں ؎

کوئی میری تعریف کرتا نہیں — کروں میں تو خود آپ اپنی کروں!

میرے دل میں ہے شوقِ جنگ و ستیز — نہیں مجھ کو پروائے صلح و سکوں

میں خواہاں ہوں آزادیٔ ملک کا، — نہ اس کے عوض دین و دنیا میں لوں

نہیں منطق و فلسفے سے غرض، — نہیں جانتا میں بہت صید و چوں

ز نقارہ آواز آمد ـــ بروں — کہ دوں ست و دوں ست دوں ست دوں

علی گڈھ یونیورسٹی کے انتظام کے سلسلہ میں سید صاحب نے خوب تضمین کی ہے :-

لڑکے کو فکر صبح و مسا امتحاں کی ہے — بیوی کو سوچ یہ مری لڑکی کہاں کی ہے!

پڑھنے سے کچھ غرض نہ پڑھانے سے واسطہ — اُستادِ جامعہ کو ہوس اب عز و شاں کی ہے

بھائی کو ٹھونس دوں کہ بھتیجے کو ٹھونس دوں — اب اپنے بعد فکر انہیں خانداں کی ہے

ہو جامعہ میں روز نیا معرکہ تو کیا! — ہم کو تو یاد فصلِ گل و گلستاں کی ہے

اے کاش لالہ زار ہو پھر صحنِ بوستاں — حسرت یہی بس ایک دلِ خونچکاں کی ہے

شاید مرا فسانہ انہیں لطف دے گیا
سُنتا ہوں اب تو روز طلب قصہ خواں کی ہے

سیّد سجاد حیدر صاحب نہ خوشامدی تھے اور نہ اُن کو اس عمر میں کسی ملازمت کی ضرورت تھی۔ مگر جب نواب صاحب چھتاری حیدر آباد میں اعلیٰ ترین منصب پر سرفراز ہوئے تو محض خلوص سے جوان کو علی گڈھ والوں سے تھا۔ سیّد صاحب موصوف نے ذیل کے چند اشعار سر احمد سعید خاں صاحب کی شان میں موزوں کر کے "سرگزشت" میں شائع کرایا۔ سُنا گیا ہے کہ نواب صاحب والاشان نے ان اشعار کو خوش خط لکھوا کر اپنے کمرہ میں نصب کروا رکھا ہے۔ حقیقت میں سیّد صاحب نے جو نصیحت کی ہے۔ وہ سونے کے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

وہ فاتحِ قلوب دلوں کا وہ حکمراں — پرچم ظفر کا کھول کے ہوتا ہے پھر رواں
ہندوستاں کے بعد ہے فتحِ دکن کا عزم — نصرت تمہیں نصیب سر احمد سعید خاں
اللہ نے کیا ہے تمہیں صاحبِ نفوذ — اور شاہ نے کیا ہے رعایا کا پاسباں
کوشش یہ ہو کہ خلقِ خدا کا رہے خیال! — اور یہ نہ ہو، تمہاری جبیں شہ کا آستاں!
سونپی گئی ہے تم کو دکن کی مقدرات — اب اس کو خار زار بناؤ کہ گلستاں!
ہو معدلت اساسِ سیاست مدار کا — اوروں کے واسطے ہو خطا بخش و مہرباں
دلدار و دلنواز کرم گستر و جواد، — زر پاس و سیم پاش و گہر بار گلفشاں!

ہو غلغلہ دکن میں کہ ہاں آگیا وزیر
حق کوش، حق شناس بہی خواہ و قدرداں

سیّد صاحب موصوف گو کہ اب خاصے عمر رسیدہ ہو گئے تھے۔ اور مُجثّے کے ہمیشہ سے دھان پان تھے۔ اور ذیابطیس جیسی بیماری نے ان کا کس اور بھی نکال دیا تھا۔ لیکن اُن کی بے چین طبیعت اُن کو ایک جگہ نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ بیماری میں بھی وہ سفر سے نہ گھبراتے تھے۔ چنانچہ مرنے سے ایک سال قبل کابل کی بھی سیر کر آئے تھے۔ اور یہ سب کچھ اس وجہ سے کر سکتے تھے کہ وہ کبھی ہمت نہ ہارنے کا سبق اوروں کو بھی پڑھاتے رہتے تھے۔ چنانچہ راقم الحروف نے ایک دفعہ طویل بیماری کی اذیتوں سے تنگ آکر دو سال ہوئے ایک مایوسانہ خط اُن کو لکھا۔ افسوس ہے کہ اس کی نقل مَیں نے اپنے پاس نہیں رکھی۔ اس لئے وہ شائع نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو اس کا جواب سجّاد صاحب نے دیا وہ پیش کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ چونکہ میرا خط منظوم تھا۔ اس لئے جواب بھی نظم میں ہے۔ اس نظم سے اُن کے اصلی خیالات خوب واضح

ہوتے ہیں۔ وہ نظم یہ ہے:۔

ایک غم زدہ دوست کے نام

نہ مرنے کی کرنا کبھی آرزو شکستہ نہ کر اپنا جام و سبو!

بچاتا ہے جاں کو ہر اک جاندار وہ بدبخت ہو یا کہ ہو کامگار

وہ بلبل کہ جو ہے اسیرِ قفس اُسے بھی ہے جینے کی از بس ہوس

اِدھر دیکھو ہر ایک شیر ژیاں وہ سلطانِ صحرائے وحشت نشاں

اُدھر ہے اک آہوئے چالاک تیز وہ آنکھیں رسیلی ہوا میں وہ خیزا

جھپٹتا ہے آہو پہ شیر ژیاں وہ آہو جلد جیسے تیر از کماں

یہ کیا ہے؟ یہ ہے آرزو زیست کی اسی سے ہے سب آہ و ہو زیست کی

وہ شہباز جنگ آور تیز پر اُدھر آسماں کے ہے جس کا گذر

کبوتر کو پنجے میں اس نے لیا کبوتر چھٹا بھی تو کے دن جیا

مگر کس قدر پھڑپھڑاتا ہے وہ اور اپنے کو آخر چھڑاتا ہے وہ

ہے آغشتہ خوں سے تنِ نازنیں مگر خواہشِ زیست دل میں مکیں

اگرچہ امیدِ رہائی نہیں قفس میں بھی ہے نغمۂ دل نشیں

غرض زاہدی یہ نصیحت سنو! جیو گرچہ جینے میں غم ہی سہو

مگر کر رہا ہے یہ جو وعظ و پند نہیں خود نصیحت پہ وہ کاربند

وہ دنیا سے نومید و بےزار ہے غم و رنج کا اس پہ انبار ہے

وہ قلبِ حزیں وہ دلِ دردمند وہ سوزِ دروں و فغانِ بلند

شب و روز صبح و مسا تلخ کام چہ خوش دادہ ام زندگی را نظام

مبارز الدین رفعت

شعر یلدرم

"سید سجاد نثر شعر نما خوب لکھتے ہیں، عبارت دل پذیر اور اس میں ایک خاص نشتریت ہوتی ہے"[1]۔ یہ تاریخ ادب اُردو کے ایک مورخ کی رائے ہے اور سجاد حیدر یلدرم کی تحریروں کے مداحوں کو بھی اس رائے سے پورا پورا اتفاق ہے لیکن ان کے کم مداحوں کو یہ معلوم ہے کہ یلدرم شعر بھی کہتے تھے۔ جن میں ان کی مخصوص "نشتریت" ایک نئے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اُردو کے ایک مشہور مزاح نگار نے یلدرم کو ان کے آخری زمانے میں دیکھا ہے۔ لکھتے ہیں: "بوڑھے ہو چکے ہیں، مگر اب تک شرمیلی طبیعت ہے۔ اپنی ادبی خدمات کا شاید احساس ہی نہیں، غرور تو دوسری چیز ہے"[2]

یہی افتادِ طبیعت تھی جس کی وجہ سے غالباً یلدرم نے کبھی اپنے کلام کا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ نہیں کیا اور تُک بندوں اور قافیہ پیماؤں کی طرح صاحبِ دیوان ہونے کی ہوس انھیں دامنگیر نہ ہوئی۔ ان کے کلام کا یہ مختصر سا مجموعہ مختلف رسائل کے سینکڑوں اوراق کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ بہت ممکن ہے ان کا اور بہت سا کلام ان کی بعض نثری تصانیف کی طرح ابھی غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہو۔ جب تک خود محترمہ نذر سجاد یا محترمہ قرۃ العین حیدر اس طرف توجہ نہ فرمائیں، پرستارانِ سجاد حیدر یلدرم کو اسی پر قناعت کرنی ہوگی۔

یلدرم "عموماً شعر نہ کہتے، بس ایسے ہی تاثر کے موقعہ پر کہہ لیتے"[3]۔ یہ اُردو کے ایک مسلّمہ ادیب کی رائے ہے اور یلدرم کی پوری شاعری اس کی گواہ۔ ان کی شاعری دلی تاثرات اور احساسات کا ایک جیتا جاگتا مجموعہ ہے، "تُک بندی، قافیہ پیمائی یلدرم کا کبھی شعار نہیں رہا، "آورد" کے عیب سے ان کی شاعری ہمیشہ پاک رہی۔

"سید سجاد حیدر صاحب اس معنی میں شاعر نہیں تھے کہ وہ بڑے بڑے مشاعروں میں دادِ سخن حاصل کرتے اور صاحب دیوان ہوتے، لیکن اس معنی میں شاعر ضرور تھے کہ شعر کہتے تھے اور اچھا شعر کہتے تھے۔ ان کا توسنِ طبع جس طرح نثر میں شوخ و طرار تھا اسی طرح نظم میں بھی ہوا سے باتیں کرتا تھا"[4]

اس مشاعرہ بازی سے گریز کے سلسلہ میں لکھنؤ ٹریننگ کالج کے مشاعرہ کی صدارتی نظم یلدرم کی افتادِ طبیعت

---

[1] رام بابو سکسینہ - تاریخ ادب اُردو [2] شوکت تھانوی۔ شیش محل ص ۱۵۲ [3] مولانا عبدالماجد دریا بادی، صدق، ۲۶-اپریل ۱۹۴۳ء - [4] پرنسپل مشتاق احمد زاہدی، سجاد حیدر بہ حیثیت شاعر - ادیب ستمبر ۱۹۴۳ء

پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ اس نظم سے ایک طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یلدرم کو اپنی نثر کا احساس تو تھا لیکن اپنی شاعری کا اعتراف نہ تھا، اپنے مخصوص منکسرانہ انداز میں فرماتے ہیں :- ؎

لیکن نہیں شاعری کا دعویٰ — ہاں نثر میں کچھ کیا ہے تحریر
یہ شوخیٔ محض ہے وگرنہ — کیا ایچ مداں کی ہیچ تحریر

"نوجواں سے" میں بھی یلدرم نے یہی پیغام دیا ہے کہ نوجوان تک بندی کو اپنا شعار بنا کر میدانِ عمل سے نہ ہٹ جائیں۔

اس مجموعہ کی پہلی نظم "مرزا پھویا" ہے جو خیالستان سے لی گئی ہے۔ یہ یلدرم کے طالب علمی کے زمانے کی پیداوار ہے اور علی گڑھ کی طالب علمانہ زندگی کا ایک دل چسپ مرقع ہے۔ اس کی شانِ نزول کے متعلق سجاد کے ایک ہم درس اور ہم سن دوست زاہدی صاحب کا بیان سُنیئے :-

"یہ نظم شروع میں "تفنن طبع" ایک دو ورقی اخبار میں نکلی تھی۔ یہ اخبار علی گڑھ کالج میں خفیہ طور پر طلباء کے تفنن طبع کے لیئے وقتاً فوقتاً نکلا کرتا تھا، کبھی دستی لکھا ہُوا اور کبھی چھپا ہُوا .... اس نظم میں لکھنؤ کے ایک نوجوان علی گڑھ کالج میں نئے نئے داخل ہو کر، اپنے گھر خط لکھتے ہوئے کالج کی زندگی کے مصائب کا رونا روتے دکھائے گئے ہیں۔ ان نوجوان صاحب کی نظمی تصویر جو سجاد حیدر صاحب نے کھینچی ہے وہ "مرزا پھویا" کے نام ہی سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ "مرزا پھویا" کالج میں "خالہ اماں" کہلاتے تھے، کیونکہ جس دن پہلی دفعہ یہ اکتے سے اُتر کر بورڈنگ میں داخل ہوئے ہیں تو حضرت ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے تھے اور پاؤں میں گھیتلی جُوتی، اور لطف یہ ہے کہ ہاتھ میں ایک پاندان لٹکائے ہوئے تھے۔ اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی یار لوگوں نے ان پر خالہ اماں کی پھبتی کہدی، جو ہمیشہ کے لیئے چپک کر رہ گئی۔ مگر سید صاحب نے اپنی نظم میں ان کو "میرزا پھویا" کا خطاب دیکر ان کے حلیئے کو بدل دیا۔ ان صاحب کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ صرف اتنا اتا پتا کافی ہے کہ وہ ہمارے مشہور قومی کارکنان میں سے ہیں۔ ایک زمانے میں جیل کی ہوا کھا آئے ہیں۔ مزدوروں کے زبردست حامی ہیں اور ہندوستان کے مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ اگرچہ وہ بہت مال دار نہیں ہیں اور اس لیئے جاہ پرست ان کو لیڈر نہیں مانتے: لیکن ان کو لیڈر بننے کی حسرت بھی نہیں[1]"

اس "حسرت" کے بعد اور کیا اتا پتا بتایا جا سکتا ہے!

---

[1] ادیب - ستمبر ۱۹۴۳ء

اس مجموعہ کی دوسری نظم "شملہ کا لکا ریلوے اسٹیشن پر ایک نظارہ" یلدرم کی بہت مشہور نظم ہے اور واقعہ یہ ہے
جاپانی مصوری کی طرح چند آڑے ٹیڑھے خطوط میں ایک چوکڑیاں بھرتے بے چین و مضطر آہو کی زندہ تصویر کھینچ کر رکھ دی
ہے۔ پہلی دفعہ یہ نظم علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئی تو رشید احمد صدیقی نے اس تاثر کی شدت کو دیکھ کر کتنے اشتیاق سے لکھا

"علی گڑھ میگزین کی جدید ترین اشاعت میں "شملہ کالکا ریلوے اسٹیشن پر ایک نظارہ" دیکھ کر ......
معلوم ہوا کہ ہنوز سیّد صاحب "ریل" پر "آہو" دیکھ لیا کرتے ہیں، اس لئے عجب نہیں کہ موصوف صرف تھوڑی سی کوشش فرما کر "حضرت دل کی سوانح عمری" از سر نو جدید حالات و حوادثات کے ماتحت مرتب کر سکیں۔"[1]

کچھ اسی قسم کی نظم "دیکھا نظارہ ہم نے تمہارا" بھی ہے۔

ایک نظم کا عنوان ہے "نغمۂ مسرت"، اس کے تیسرے بند کے بارے میں جلیل احمد قدوائی کی ذاتی رائے یہ ہے کہ "اس "دیار مصور" بلدۂ شعر و موسیقی، لاہور کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔"[2]

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم کسی دوست کی شادی کی تقریب میں لکھی گئی ہے، لیکن الفاظ کی نشست، ترکیب کی بندش، خیال کی ندرت، جاپانی مصوری کی طرح چند خطوط میں منظر نگاری، اور سب سے بڑھ کر بے ساختگی اور ترنم نے اس نظم میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔

دوستوں کی خوشیوں اور مخصوص تقاریب کے سلسلہ میں سیّد صاحب نے جو نظمیں کہیں، ان کے ذیل میں "نذرِ خواجہ" اور ایک "بت پرست محمود" آ جاتی ہیں، اس آخری نظم کے متعلق علی گڑھ میگزین کے مدیر نے کتنی سچی بات کہی ہے:-

"مکرمی سجاد صاحب یلدرم اُردو انشاء پردازی کے علاوہ نظم میں بھی طرزِ بیان کے موجد ہیں۔
یہ نظم انھوں نے مکرمی خواجہ غلام السیدین صاحب کی شادی میں لکھی تھی، اس نظم سے وہی لوگ زیادہ محظوظ ہو سکتے ہیں جو سجاد صاحب کے بے تکلفانہ اندازِ بیان، ندرتِ تخیل، ازدواجی زندگی کے مسئلہ پر سیدین صاحب کی ذاتی رائے اور اس وقت کی مقامی فضا سے کافی آشنا ہوں۔"[3]

نواب صاحب چھتاری کے نام جو تہنیت نامہ لکھا گیا ہے، وہ کوئی پیشہ ورانہ قصیدہ نہیں، اقبال کی طرح امیروں کی مدح پیرائی یلدرم کا شعار نہیں، یلدرم نے نواب صاحب کو چند مخلصانہ نصیحتیں کی ہیں، بہ قول زاہدی صاحب:-

"سنا گیا ہے کہ نواب صاحب والاشان نے ان اشعار کو خوش خط لکھوا کر اپنے کمرے میں نصب کر رکھا ہے۔ حقیقت میں سید صاحب نے جو نصیحت کی ہے وہ سونے کے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے۔"

ایک اور نظم ہے "دعا" جو ایک ناکتخدا عزیزہ کے آٹو گراف البم میں لکھی گئی تھی، خیال کیجئے ایک ناکتخدا عزیزہ کو

---

[1] سہیل۔ ستمبر ۱۹۲۶ء۔ [2] نیرنگ خیال۔ سالنامہ ۱۹۲۶ء۔ [3] علی گڑھ میگزین۔ جلد ۸۔ شمارہ ۱، ۲ و ۳

بہتر اور کیا دُعا دی جاسکتی ہے، غالباً یہ عزیزہ وہی ثروت آراء مرحومہ ہیں جن کا دردناک مرثیہ اس مجموعہ میں شامل ہے۔اسی طرح سر محمد یعقوب کا مرثیہ بھی "ایک ہمدمِ دیرینہ کی یاد میں" سجاد کے دلی جذبات کا آئینہ اور ایک سوگوار دل کی صدائے نالہ ہے

"ہندوستان کی تقدیر نے سجاد حیدر ایک علیگ طالب علم کو ترکی پڑھوایا اور اس لگاؤ سے ترکی سلطنت میں برطانوی سفارت کے لئے کارآمد ٹھہرایا۔ اس نے زمانی قرب کے ساتھ اس کو مکانی قرب بھی بخشا، نتیجہ یہ ہوا کہ یلدرم بن کر آج ۳۵ برس پہلے ترکی مفتوحات کو ہندوستانی مفتوحات کی صورت میں بدلنا شروع کیا اور یہ پہلا موقع ہے جس میں ہماری زبان نے اس "ادبِ لطیف" کے نمونے دیکھے جن کی مسخ شدہ تصویریں آج ہر اُردو رسالے کے صفحوں پر نظر آتے ہیں"[۱]۔

ان ترکی مفتوحات میں متعدد اعلیٰ درجے کے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے علاوہ دو ترکی نظمیں "ترانہ شوق"۔ اور "بلبل" بھی ہیں۔ان کے سوا طارق کے کچھ منظوم حصص بھی ہیں۔افسوس ہے ان کا یہ ڈرامہ ان کے سانحۂ ارتحال کی وجہ سے نگارمیں چھپتے چھپتے ناتمام رہ گیا۔

ملازمت کے سلسلہ میں یلدرم کچھ عرصہ کے لئے جزائر انڈمن میں بھی رہے ہیں۔یہ مقام گورے آدمیوں کے لئے جنت اور ہندوستانی کالے کلوؤں کے لئے منحوس زندان ہے۔یہاں سے ایک نظم لکھی ہے "قیدِ خود اختیاری"۔اس کے بارے میں جلیل احمد قدوائی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ڈیر جلیل ——— یہ تو آپ سُن ہی چکے ہوں گے کہ میں نے ہندوستان پھر چھوڑ دیا، دو برس کے لئے جلاوطنی اختیار کرلی، یہاں فرصت بھی ہے اور تنہائی، اس لئے کبھی کبھی شعر بھی کہہ لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں پہنچ کر جو لکھا ہے۔اس میں سے کچھ پیش کرتا ہوں"[۲]۔

سجاد حیدر یلدرم کی ادبیت اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی ناقدری کا ماتم کرتے ہوئے یلدرم کے ایک اور نامور ہم درس نے شکوہ کیا ہے:۔

"سجاد حیدر کی موت اس دردناک حقیقت کو یاد دلاتی ہے کہ علی گڈھ میں علمی ذوق کی قدر کبھی نہیں ہوئی"[۳]۔

خود یلدرم نے بھی اپنے ایک خط میں اس بدمذاقی کی شکایت کی ہے:۔

"علی گڈھ میں اُردو کے ایم۔اے اور آنرز کی کلاس کھُلنا علی گڈھ کی روایات کے عین مطابق ہوگا، اور وہ دن بہت مبارک ہوگا جب ایسا ہو رہا ——— آپ احباب کی یہ کوشش کہ مجھے علی گڈھ دوبارہ بُلائیں، مجھے اس کی کامیابی میں شبہ

---

[۱] مولانا سید سلیمان ندوی، مقدمہ مکتوبات مہدی ص ۸ و ۹ ۔ [۲] سید سجاد حیدر یلدرم کے خطوط۔ہمایوں۔جولائی ۱۹۴۳ء

[۳] سر علی رضا، سجاد حیدر یلدرم مرحوم، جامعہ، جولائی ۱۹۴۳ء

ہے، خداوندانِ یونیورسٹی ع

ملاتے ہیں اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے[1]"

" علی گڑھ مسلم یونیورسٹی " والی نظم میں اسی بد مذاقی اور ہماری قومی بے حمیتی کا نقشہ کھینچا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایسا طرزِ عمل کچھ مسلم یونیورسٹی کا ہی حصّہ نہیں اور اس کے لئے صرف اسی کے خداوندانِ یونیورسٹی ہی مطعون نہیں ۔ بلا مبالغہ ہندوستان کی ہر جامعہ کے سر پر ٹھیک اُترتی ہے ۔

" یلدرم ایک زمانہ میں مذہب میں بہت ہیٹے تھے مگر شائستہ، نستعلیق اسوقت بھی رہے، بدزبانی، دلآزاری اسوقت بھی روا نہ رکھی اب تو ماشاء اللہ خاصے مذہبی ہو گئے تھے ۔ کئی سال ہوئے حج بھی کر آئے تھے اور خانہ کعبہ پر ایک نظم بھی لکھ لائے تھے[2]۔"

اس سفرِ حج پر گئے کس طرح اس کی تفصیل سنیئے :۔

" سجاد صاحب کی طبیعت اچھی نہ تھی، یعنی مرض ذات الجنب سے خدا خدا کر کے نجات پائی تھی، مگر ان کو حج بیت اللہ کا شوق ایسا دامنگیر ہوا کہ گھر والوں سے لڑ بیٹھے اور کسی کے روکے نہ رُکے، چنانچہ اس عزم کا اظہار اس رنگ میں کیا ہے :۔

کوئی اب شاہِل ا، بابِ وفا ہوتا ہے[3]" (عقدۂ لاینحل)

حج بیت اللہ کا شوق لئے جہازِ رحمانی میں سوار ہوئے ۔ اسی کے عرشہ سے اپنے دلی کیفیات کا اظہار "عزمِ حجاز" میں کیا ہے، اور مومن کے مشہور مصرعہ " مومن چلا ہے ایک بتِ پارسا کے ساتھ " پر نہایت دل کش انداز میں تضمین کی ہے ۔ میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

" مکرمی ——— ہندوستان چند ماہ کے لئے چھوڑ رہا ہوں ——— اور جا کہاں رہا ہوں؟ کعبے کو ——— اس بوالعجبی پر چند اشعار میں اظہارِ خیال ہے :۔

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میر

پھر ملیں گے اگر خدا لایا[4] ! "

کعبے کے سامنے پہنچے تو جذبات کا دریا اور بھی اُمڈا ۔ اپنے مالک سے شکوہ و شکایت اور حرف و حکایت ہونے لگی، دُنیائے اسلام کی حالت اور یورپی دول کی حرص و آز سے کس مسلمان کا دل رنجور نہیں ۔ کعبے کے سامنے کھڑے ہو کر کس درد سے فرماتے ہیں :۔

یہ سب تو ہے مگر مرے اللہ یہ نہ ہو

اغیار دخل پائیں ترے آستانے میں!

---

[1] ہمایوں، جولائی ۱۹۴۳ء [2] مولوی عبدالماجد دریا بادی ۔ صدق ۔ ۲۶ ۔ اپریل ۴۳ء [3] زاہدی ۔ ادیب ستمبر ۴۳ء [4] ہمایوں ۔ مئی ۱۹۳۴ء

آگے سُنیئے:۔ ؎

واقف ہے تو کہ درد بھرا ہے ہمارا حال
کیا تیرے آگے درد بھروں اس فسانے میں

غرض "سجاد حیدر یلدرم" ساری زبان میں ایک نئی صنف ادب کے بانی تھے، اور اس لئے ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ایک پایہ ہے"
یلدرم کا یہ پایہ اور یہ درجہ اُردو نثر میں بھی ہے اور اُردو نظم میں بھی۔

لے مولانا سید سلیمان ندوی۔ معارف مئی ۱۹۴۳ء

کمالِ یلدرم

نیاز فتح پوری
سید سلیمان ندوی مرحوم
عبد الماجد دریا بادی

مولانا محمد علی مرحوم
سر عبد القادر مرحوم
تاجور نجیب آبادی

رام بابو سکسینہ
عبد القادر سروری
سر سید رضا علی مرحوم

غلام پنجتن
سید بادشاہ حسین
سید اعجاز حسین

صغیر احمد جان
سید امجد الطاف
مدیر علی گڑھ میگزین

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
مجنوں گورکھ پوری

میرا ذوقِ ادب اور یلدرم ——— نیاز فتح پوری

ابتدائے عمر و عنفوانِ شباب میں مجھے ادبی رسایل کے مطالعے کا بڑا شوق تھا اور ان سب میں مجھے مخزن سے زیادہ دل چسپی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید سجاد حیدر یلدرم ترکی "انشاء عالیہ" کے تراجم پیش کر رہے تھے اور اس کا میرے ذوق پر بڑا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب ان کا "خارستان" "گلستان و شیرازہ" شائع ہوا تو میں نے متعدد ESSAYES اسی رنگ کے لکھے۔ "ایک شاعر کا انجام"۔ "پارسی دوشیزہ"۔ "رقاصہ اور عورت" اسی تاثر کا نتیجہ تھے۔

اتفاق سے اسی زمانے میں غالباً (۱۹۱۱ء) میرا اور سید سجاد حیدر کا اجتماع مسوری میں ہوگیا۔ وہ پولیٹیکل ملازمت کے سلسلہ میں افغانستان کے ایک امیر زادہ کی نگرانی پر مامور تھے اور میں اکسٹرا اسٹیٹ سے وابستہ تھا۔

مسوری کے دوران قیام میں، میں ہر اتوار ان کے پاس صرف کرتا تھا اور سارا وقت ادبی گفتگو میں کٹ جاتا تھا۔ چند دن کے لئے قاری سرفراز حسین دہلوی (سیاح چین و جاپان) بھی یہاں آگئے تھے اور وہ بھی اسی صحبت میں شریک رہتے تھے۔ اس وقت تک یلدرم کی شادی نہ ہوئی تھی۔

(واقعات و شخصیات جنہوں نے مجھے متاثر کیا)

موت کا ادبی پہلو ——— نیاز فتح پوری

سید سجاد حیدر یلدرم ہندوستان کے وسطی ادبی دور کے مشہور انشاء پرداز نے یہیں لکھنؤ میں انتقال کیا اور اس طرح کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ مرحوم یوں تو عرصے سے ذیابطیس کے مرض میں مبتلا تھے لیکن ان کی مرنج و مرنجاں فطرت نے انہیں عمر طبعی سے پہلے جانے نہ دیا۔ اور وہ گئے بھی تو قلب کی حرکت بند ہو جانے سے جو موت کا غالباً واحد ادبی پہلو ہے۔

(نگار۔ مئی ۱۹۴۳ء)

ادبِ لطیف کا پیش رو ——— سید سلیمان ندوی مرحوم

آج کل رنگ و بو کی دنیا "ادب لطیف" پر مرٹ رہی ہے۔ پیرس کی نازنین نے ایک عالم کو اپنی عشوہ گری سے مسحور کر رکھا ہے۔ مشرقی زبانوں میں فرانسیسی نزاکت کا بار جس نے پہلے اٹھایا وہ مشرق کا وہ سپاہی ہے جس کا سینہ

کم از کم تین سو برس سے یورپ کے مشق ناز کا نشانہ ہے۔ یعنی ترک۔ ترکوں نے جب بیداری کی نئی کروٹ لی تو پیرس ہی کی محبوبہ کو پہلو میں بٹھایا۔ اس لئے فرانسیسی ہی کی تعلیم ان میں پھیلی اور اس سے نئی ترکی زبان پر فرانسیسی ادب کا گہرا اثر پڑا۔ ہندوستان کی تقدیر نے سجاد حیدر۔ ایک علیگ طالب علم کو ترکی پڑھوایا اور اس لگاؤ سے ترکی سلطنت میں برطانوی سفارت کے لئے کار آمد ٹھہرایا۔ اس نے "زمانی قرب" کے ساتھ اس کو ترکوں کا "مکانی قرب" بھی بخشا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یلدرم بن کر آج سے ۳۵ برس پہلے ترکی مفتوحات کو ہندوستانی مفتوحات کی صورت میں بدلنا شروع کیا اور یہ پہلا موقع ہے جس میں ہماری زبان نے اس "ادب لطیف" کے نمونے دیکھے جن کی مسخ شدہ تصویریں آج ہر اردو رسالے کے صفحات پر نظر آتی ہیں۔

(مقدمۂ مکتوبات مہدی افادی)

اعتراف استفادہ ——————— عبدالماجد دریابادی

دلی تاسف کے ساتھ یہ خبر پڑھنے میں آئی کہ سید سجاد حیدر بی۔ اے کا لکھنؤ میں ۱۲ ار اپریل کو دفعتاً انتقال ہوگیا۔ ایک زمانے میں اردو کے مشہور لکھنے والے تھے۔ انگریزی میں بھی کبھی کبھی لکھتے رہے۔ قلمی نام "یلدرم" تھا۔ ترکوں کے عاشق تھے، ساتھ ہی اقبال کے بھی پرستار۔ اردو میں لکھتے اس وقت سے تھے جب ان سطور کے راقم کو (بہ محاورۂ عام) قلم پکڑنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ اس نے بھی ادب میں اچھا خاصہ استفادہ سید صاحب کی تحریروں سے کیا۔ ایک زمانے میں مذہب سے بہت ہٹے ہوئے تھے۔ لیکن مہذب، شائستہ، نستعلیق اس وقت بھی رہے۔ بدزبانی، دل آزاری اس وقت بھی روا نہ رکھی۔ اب تو ماشاء اللہ خاصے مذہبی ہو گئے تھے۔ کئی سال ہوئے حج بھی کر آئے تھے اور خانۂ کعبہ پر ایک نظم بھی لکھ لائے تھے۔ عموماً شعر نہ کہتے، بس ایسے ہی تاثر کے موقعہ پر لکھ لیتے۔ لے دے کے ایک تجدد کا اثر اب بھی باقی رہ گیا تھا۔ حق تعالٰی سے دعا ہے کہ اپنی رحمت کے سائے میں لے اور لغزشوں پر خط عفو پھیر دے۔
شادی خاندان سے باہر ایسی خاتون سے کی تھی جو اپنے زمانے میں مشہور نامہ نگار تھیں۔

(صدق - ۲۶ ر اپریل ۱۹۴۳ء)

رشک اور ادبیت ——————— مولانا محمد علی جوہر مرحوم

سید سجاد حیدر کی جگہ کا بھی حریص نہیں ہوں اور ہمدرد نے تو اس خبر وحشت اثر کو سنتے ہی اظہار افسوس بھی کر

دیا تھا جو ایک مرد واحد علی گڑھ میں ایک ادبی شہرت رکھتا ہے۔ اس تک کو وہاں رکھنا لوگوں کو گوارا نہیں۔ تاہم مجھے ان کی تنخواہ پر رشک نہیں ان کی ادبیت پر رشک ہے۔ لیکن وہ ادب کے لئے وضع کئے گئے تھے اور ہم بے ادبی کے لئے۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

میں نے ہمدرد جاری کرتے وقت انہیں اس کی ایڈیٹری کی دعوت دی تھی۔ مگر وہ قبول نہ ہوئی۔
(ہمدرد ۔ ۲۰ / اپریل ۱۹۲۸ء)

جدّت اور اچھوتا پن ——— سر عبدالقادر مرحوم

سید سجاد حیدر یلدرم کی طرز تحریر میں جو بات ہمیں سب سے زیادہ پسند ہے وہ اس کی جدت اور اچھوتا پن ہے جب کبھی وہ کچھ لکھتے ہیں، نظم ہو یا نثر، اس میں ایک انداز خاص ہوتا ہے جس کا لطف جاننے والے جانتے ہیں۔ مگر یہ محبت و الفت کا فسانہ (خارستان و گلستان) جس کی تخلیص کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں، ان کی روش کے اعتبار سے بھی نرالے ڈھنگ کا ہے۔ تخیل کا جو کمال اس میں دکھایا گیا ہے بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔
(مخزن ۔ جون ۱۹۰۶ء)

اُردو کا الف پو ——— تاجور نجیب آبادی

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان میں مختصر افسانہ انگریزی زبان سے آیا ہوگا۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کا خیال ہے کہ غالباً سب سے پہلے اودھ اخبار میں مختصر افسانوں کے تراجم شائع ہوئے اور بعد میں خود ان کے رسالے معارف میں جس کا ہم نام اب اعظم گڑھ سے شائع ہوتا ہے، سید سجاد حیدر یلدرم نے بھی کچھ افسانے لکھے۔ اس لحاظ سے شاید ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جس طرح دُنیائے مغرب میں پُو کو مختصر افسانہ نویسی کا "موجد" کہا گیا ہے۔ سید سجاد حیدر اُردو زبان میں طرزِ جدید کے مختصر افسانے لکھنے والے پہلے شخص ہیں۔
مقدمہ منتخب افسانے

نشتریت ——— رام بابو سکسینہ

سید سجاد حیدر نثرِ افسانہ نما خوب لکھتے ہیں۔ عبارت بہت دل فریب اور اس میں ایک خاص نشتریت ہوتی ہے

ترکی جانتے ہیں اور ایک ترکی ڈرامے موسوم بہ خوارزم شاہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے

(تاریخ ادب اردو)

فنّی کارنامہ ——————— عبدالقادر سروری

ہم نے لیلیٰ و مجنوں کے افسانے کو کئی بار پڑھا ہوگا مگر سجاد حیدر یلدرم جب اس قصے کے قدیم چوکھٹے میں نئی تہذیب کی تصویریں بناتے اور ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہماری نظریں عجیب حیرت و استعجاب سے اس پر گڑ جاتی ہیں اور اختتام تک وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ لیلیٰ کا ناقہ و محل سے اُکتا کر موٹر میں تفریح اُڑانا، مجنوں کا بائیسکل پر سوار ہو کر نجد کی گلیوں میں مارا مارا پھرنا، خارمغیلاں کی قدیم عداوت کا نئی شکل میں نمودار ہونا، یہ تمام ایسے واقعات ہیں جن کو پڑھ کر ہم بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ "یہ فنّی کارنامہ ہے"!

پریم چند اور سدرشن دونوں کے قصّوں میں مقامی رنگ کی بہترین جھلکیں موجود ہیں جس سے نیاز کے اگلے اور سجاد حیدر یلدرم کے اکثر قصّے خالی نظر آتے ہیں۔ اس طرح اوّل الذکر قصّہ نگاروں پر رومانیت اسی قدر زیادہ غالب ہے، لیکن ہر ایک کی دلچسپی اسی سے مخصوص ہے۔

جو اسلوب نیاز اور سجاد حیدر نے اپنے قصّوں کے لئے انتخاب کیا وہ اس قسم کے قصّے کے لئے نہایت موزوں ہے اگر کبھی کبھی صداقت افسانے سے زیادہ تعجب خیز ہوتی ہے تو افسانے صداقت سے زیادہ دلچسپ بھی۔ اور یہی قول نیاز اور سجاد حیدر کے قصّوں پر صادق آتا ہے۔ ان کی پیدا کردہ رومانی فضا میں ہم صداقت کی کمی محسوس کرنا بالکل بھول جاتے ہیں اور یہی سب سے زیادہ تعریف کسی ادبی کارنامے کی ہو سکتی ہے کہ جب وہ سامنے ہو تو کوئی دوسری شے سامنے نہ ہو...... نیاز اور سجاد حیدر کے قصّوں سے نہایت بلند تخیل کا ثبوت ملتا ہے۔ نیاز نے کیوپڈ اور سائکی ہی میں جہاں سائکی کی اس حالت کا نقشہ دکھایا ہے جس میں کسی چاہنے والے کے نہ ہونے کے غم میں وہ خود فراموش ہو جاتی ہے، ایک فنّی شہ پارہ ہے۔ اسی ایک واقعہ سے نیاز کے "تصویری بیانات" کا بھی ثبوت ملتا ہے —— سجاد حیدر یلدرم نے بھی خیالستان میں ایک بہترین تخیلی تصویر ایسی لڑکی کی کھینچی ہے جسکو محبّت کرنیوالے کی تلاش ہے۔ اس خاص نقطۂ نظر سے سجاد حیدر کے بیانات آگے نکل جاتے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کے اکثر قصّے اس امر کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں کہ مستعمل مضامین اور قصّے جب ایک کامل فن کے ہاتھ لگتے ہیں تو ادب کے لئے کیونکر مایۂ ناز بن جاتے ہیں ؎ مردہ بھی بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں!

مگر اس خصوصیت میں نیاز بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں کہ ان کے غیر زبانوں کے ترجمے بعض وقت اصل سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ .... سدرشن اور پریم چند قارئین کو مسرور ضرور کرتے ہیں لیکن پڑھنے والوں کو ادبی نزاکتوں سے مخمور بنا دینا نیاز اور سجاد حیدر کا کام ہے۔

(دُنیائے افسانہ)

موتی پرونے والا ــــــــــــ سر سید رضا علی مرحوم

حیدر حسن، سجاد حیدر اور محمد حیات (سر سکندر حیات خاں کے والد) تینوں بی۔ اے میں تھے۔ سجاد حیدر انگریزی اور اردو دونوں بڑی اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ انشاء پردازی کی سنہری لڑیوں میں موقع محل سے ہمیشہ لطافت اور بذلہ سنجی کے موتی پروتے تھے۔ مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

(اعمال نامہ)

اُردو علم و ادب کی جان ــــــــــــ غلام پنجتن

اس زمانے میں سید سجاد حیدر صاحب یلدرم نواب محسن الملک بہادر یا یوں کہو کہ سیکرٹری صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ صاحب موصوف کی ذہانت کی کالج میں شہرت تھی۔ بدن میں پھرتی اور چہرے پر شگفتگی تھی۔ سوٹ پہنتے، اور بلا تیلیوں کی ناک پکڑنے والی عینک لگاتے تھے۔ اور شوق تحریر مضامین میں گھلے جاتے تھے ...... لوگ کہتے ہیں کہ ان کے بعض ناول اُردو علم و ادب کی جان ہیں۔

(علیگیات)

مخصوص انداز بیان ــــــــــــ سید بادشاہ حسین

سیّد سجاد حیدر صاحب یلدرم اپنے ترکی ترجموں کی وجہ سے ملک میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ نامق کمال بک کے ترکی ڈرامے "جلال الدین خوارزم شاہ" کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ نامق کمال بک ترکی ادبیات جدید کے زندہ جاوید بانیوں میں سے ہے۔ ترکی زبان اور انداز یلدرم کا اپنا مخصوص ہے۔

(اُردو میں ڈراما نگاری)

برجستگی اور ندرت ــــــــــــ سید اعجاز حسین

جن لوگوں نے کامیابی کے ساتھ اُردو میں دوسری زبانوں کے افسانوں کو ترجمہ کرکے اس ادب کو گراں بہا بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی فہرست میں سجاد حیدر کا نام زرین الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس سلسلہ کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اُردو میں ترکی افسانوں کا ترجمہ کیا۔ جس میں اصل کی شان آگئی ہے۔ ترکی طرزِ معاشرت و حسن ادا کو اُردو کی دُنیا میں مانوس ہونے کے لئے آپ نے اکثر اُردو ترکیبوں میں اجتہاد سے کام لیا ہے۔ اور خوشی یہ ہے کہ بیشتر مقامات پر ان کو ایسی اثر پذیر کامیابی ہوتی ہے کہ اس خدمت کو اُردو ادب میں ایک اضافہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر کبھی کبھی اپنے لطیف جذبات کو بیان کرنے کے لئے ایسی ایسی ترکیبوں اور الفاظ کا

استعمال کر جاتے ہیں جو سُننے والوں کو غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں۔

ترکی ترجموں کی کثرت کا یہ نتیجہ ہُوا کہ سجاد حیدر صاحب کے طبع زاد افسانوں میں بھی ترکی افسانوں کی رومانیت جا بجا نظر آنے لگی۔ آپ کے ترجموں میں برجستگی اور ندرت ہوتی ہے کہ وہ بذات خود ایک تصنیف کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے یا کسی کے ذاتی تخیل کا نتیجہ۔ ایک تو الفاظ کا انتخاب عمدہ اور پھر ان کو ان کو نہایت موزوں جگہ سے ترتیب دینا یہ موصوف کا وہ کرشمہ ہے جو ان کی نثر میں شاعری کا مزہ پیدا کر دیتا ہے۔ جہاں جہاں یہ خوبی پیدا ہوگئی ہے" اس نے افسانوں کو جنت نگاہ اور عبارت کو فردوس گوش بنا دیا ہے سجاد حیدر صاحب کے طبع زاد افسانوں میں اکثر حیات انسانی کی نفسیاتی تحلیل ہوتی ہے اور ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو حسیات و جذبات انسانی کی نقاب کشائی میں خاص ملکہ ہے جس کو ان کی افسانہ نویسی کا ایک خاص جزو سمجھنا چاہیئے۔ وہ اپنے افسانوں میں نفسیات کی ان خشک بحثوں میں نہیں پڑتے جو ایک فلاسفر کو دنیا کا خشک ترین انسان بنا دیتا ہے۔ سجاد حیدر صاحب کے یہاں کبھی فطرت انسانی کا مطالعہ اس لطیف طرز پر ہوتا ہے کہ قلب میں ایک انبساطی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو کبھی کردار فسانے سے وہ اٹھکھیلیاں ہوتی ہیں کہ تبسم کی لہریں قہقہوں سے بدل جاتی ہیں۔

ان کے افسانوں کا مجموعہ خیالستان دنیائے اُردو میں کافی ہر دل عزیزی حاصل کر چکا ہے جس میں کچھ افسانے تو ترکی ادب سے آئے ہیں اور کچھ انگریزی سے۔ لیکن زیادہ تعداد طبع زاد افسانوں کی ہے۔ طبع زاد افسانوں کی خوبیوں کے انبار میں ایک خرابی بھی نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی افسانہ افسانہ ہی ہو کر رہ جاتا ہے یعنی اصلیت اور واقعہ دونوں مشکوک نظر آتے ہیں۔ بہرحال خیالستان کے محاسن اتنے ہیں کہ زمیندار اخبار کی رائے ہے کہ :۔

"اُردو زبان کی ادبیات لطیف میں خیالستان سے بہتر کتاب نہیں"۔

اس مجموعے کے علاوہ ان کی ایک ناول زہرہ ہے جو بہت مشہور و قابلِ قدر ہے۔ یہ ترکی قصّہ کا آزاد ترجمہ ہے۔ لیکن بہت عمدہ ہے۔ (مختصر تاریخ ادب اُردو)

بلندیٔ تخیل اور زورِ بیان ـــــــ صغیر احمد جان

آپ کے افسانوں کا مجموعہ خیالستان کے نام سے دُنیائے ادب میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس میں کچھ افسانے تو ترکی افسانوں کے ترجمے ہیں، کچھ انگریزی کے اور کچھ طبع زاد ہیں۔

حضرت نیاز کی طرح سجاد صاحب بھی خیالی پیکر بنانے میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ جذبات نگاری میں بھی آپکا مرتبہ کافی بلند ہے۔ وہ افسانے جو غیر زبانوں سے ترجمہ ہوئے ہیں وہ اپنی بلندیٔ تخیل اور زور بیان کے لحاظ سے اکثر اصل افسانوں سے بھی بڑھ گئے ہیں اور لطف یہ کہ ترجمہ اس سلیقے سے ہُوا ہے کہ کہیں ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا۔

(تنویر ادب)

طرزِ انشاء کے پاکیزہ نمونے ــــــــ مدیر علی گڈھ میگزین

اُردو زبان کے محسن اور ہماری یونیورسٹی کے مشہور ادیب سید سجاد حیدر بی۔اے ان زندہ دل بزرگوں میں سے ہیں جو اپنے چند در چند مشاغل اور کثرت کار کے باوجود ادب اُردو سے جیتے جی دستبردار نہیں ہو سکتے۔ ان کا ذوق ادب ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی نیا میدان عمل تلاش کر لیتا ہے۔ زمانہ جانتا ہے اُردو زبان میں ادب لطیف کا رنگ انہیں کا جمایا ہوا ہے۔ اس وقت ملک میں جتنے نمونے ادب لطیف کے موجود ہیں ممکن ہے ان کے متعلق اختلاف آراء ہو سکے لیکن سید صاحب کی تصانیف کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں، انکے طرزِ انشاء کے جتنے پاکیزہ نمونے اب تک ملک میں پیش کئے گئے ہیں سب میں انکے حسنِ خیال اور ندرت احساس کی جھلک ہے۔ ان کا ذوقِ صحیح انہیں کبھی عام راستے پر نہیں چلنے دیتا۔ وہ ہر مرتبہ ایک نرالی شان سے جلوہ آراء ہوتے ہیں۔ ترکی ترجموں میں انہیں جو مہارت ہے اس کی بناء پر مشہور ہے کہ خیالستان کے "خارستان و گلستان" ترکی زبان میں اس قدر شگفتہ و دل کش نہیں، جتنے دل چسپ انہوں نے ترجمہ کر کے ہمارے لئے بنائے ہیں۔

(علی گڈھ میگزین، مارچ، اپریل، مئی ۱۹۲۶ء)

عالمِ ہوش سے عالمِ بالائے ہوش تک پہنچنے کی کوشش ــــــــ سید امجد الطاف

جہاں تک اُردو مضامین میں حسن مجرد، ماورائیت اور روحانیت کے عنصر کا تعلق ہے، وہ ہماری متصوفانہ شاعری کی بدولت پہلے ہی سے موجود تھے لیکن ٹیگور کی گیتانجلی کے ترجمے نے اس کڑوے کریلے کو نیم چڑھا دیا۔ روحانیت سے مراد وہ کیفیات اور احساسات ہیں جسے صرف دل محسوس کر سکتا ہے۔ جس کا تعلق ظاہر سے زیادہ باطن سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ان واردات کے اظہار کے لئے انداز بیان کا موہوم ہونا ہی حسن میں داخل ہوگا، چنانچہ یہی معنویت ٹیگور کے کلام کی خصوصیت ہے ...... نیاز فتح پوری، ل۔ احمد، سلطان حیدر جوش وغیرہ نے اس کا بڑا گہرا اثر قبول کیا ہے اُردو نثر میں مجرد احساسات اور مبہم تصورات کا عنصر غالب ہوتا چلا گیا۔ حسین و جمیل الفاظ کے پیکر میں ان کے معنی تلاش کرنے کے بجائے ماورا تک یا کانٹ کی اصطلاح میں عالم ہوش سے عالم بالائے ہوش تک پہنچنے کی کوشش ہونے لگی ...... سجاد حیدر یلدرم بھی کچھ اسی قسم کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن دیکھئے ان کے جذبے میں شدت کے باوجود ہیجان نہیں، بلکہ ایک ایسا ہلکا تموّج ہے جو روح کو اضطراب کی بجائے بالیدگی بخشتا ہے۔ اظہار شاعرانہ ضرور ہے مگر بے ساختہ اور تکلف سے بری ...... یہ توازن فکر اور متوازن اظہار جذبات اس دور میں سجاد حیدر یلدرم کے علاوہ صرف قاضی عبدالغفار کے ہاں ملتا ہے۔

(ہمارے رومانی انشاء پرداز۔ قومی زبان ستمبر ۱۹۶۵ء)

قصرِ ادب کا ستون ——— ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی

ادبِ لطیف کی تاریخ میں شرر کو اس کا امام اور سجاد حیدر، نیاز فتح پوری اور خلیقی دہلوی کو اس قصرِ ادب کا ستون تصوّر کیا جاتا ہے۔ مگر ان چاروں حضرات کے کارنامے ادبِ لطیف (بہ حیثیت صنف) سے زیادہ اِنشے نگاری سے قریب ہیں۔ ان لوگوں نے عموماً انگریزی کے طرز پر ماہرین فن کی طرح اسیز لکھے ہیں .... سجاد حیدر یلدرم نے جس طرح ترکی ادب سے استفادہ کر کے اُردو ادب کو مالا مال کیا، اسی طرح انگریزی اِنشے نگاری کی صحیح اسپرٹ کو اُردو اسیز میں قائم کیا۔ ان کا مجموعۂ مضامین "خیالستان" ہے۔ اس میں حضرت دل کی سوانح عمری، بھولی بسری باتیں، چاند کی کیفیت، سیلِ زمانہ، تاریخ، چڑیا چڑے کی کہانی نہایت شگفتہ اسیز ہیں...... سجّاد گہرے فلسفیانہ خیالات کو اِسے کے ذریعے ہم تک پہنچا دیتے ہیں۔ اِنشے نگاری کی ایک اہم خصوصیت ان کے اسیز کی جان ہے۔ سجّاد اپنی کہتے کہتے اجتماعی مسائل کو بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ اس طرح اپنی شخصیت کے آئینے میں زمانے کے گرم و سرد کو بھی پیش کیا ہے۔ طرزِ ادا کی شگفتگی ان کے اسیز کی مشترک خصوصیت ہے۔

(اُردو اسیز)

ادبیاتِ اُردو میں مسلّم درجہ ——— مجنوں گورکھپوری

اُردو افسانے پر غیر زبانوں کا کس قدر اثر ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ان افسانوں سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی جو غیر زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ ایسے افسانوں کی تعداد خاصی نکلے گی جو عموماً ترجمہ کئے گئے ہیں۔ ترجمہ کرنے والوں میں سجاد حیدر یلدرم کا نام سرِفہرست رہے گا۔ ان کے افسانے عام طور سے ترکی سے ماخوذ یا ترجمہ ہوتے ہیں۔ وہ ترکی زبان کی تمام خصوصیات کو بھی قائم رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لئے اکثر ان کو اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے جو بعض اوقات بے اعتدالی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ ان کی زبان لطیف اور دلکش ہوتے ہوئے ہمارے لئے ناقابلِ تقلید اور بحیثیت مجموعی غیر مانوس ہوتی ہے پھر بھی ان کا مرتبہ ادبیاتِ اُردو میں مسلّم ہے۔

(افسانہ)

مضامینِ یلدرم

۱ - ناول نویسی

۲ - مسئلہ ازدواج پر تعلیم یافتہ نوجوان کے خیالات

۳ - مولانا حالی کی شاعری پر مولوی محبوب الرحمٰن کی تنقید

۴ - اولڈ بوائے ٹائپ ہیں

۵ - ہندوستانی اکیڈیمی کے اجلاس ۱۹۳۵ء کا خطبۂ صدارت ۔ معہ تتمہ

۶ - قوت

۷ - احمد (علی گڑھ کا ایک قصّہ)

۸ - آشیانِ مستقبل (ناتمام)

۹ - تقریظ بر زود پشیماں

۱۰ - "ظالم محبّت" کا مقدمہ

۱۱ - فتح اندلس (ترکی ڈرامہ نگار عبدالحق کے ایک ڈرامے کا ترجمہ - ناتمام)

ناول نویسی

قصہ سے انسان کو طبعی مناسبت کیوں ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب فلسفیانہ طور پر ابھی دیا جانا باقی ہے۔ لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ قصہ سُننے کا شوق انسان کی جہالت پر دلالت کرتا ہے۔ بچّے کس شوق سے محض فرضی قصّوں کو سُنتے اور یقین کرتے ہیں۔ اور یہی حال ان قوموں اور ان سوسائٹیوں کا ہے جو گویا ابھی تک عالم طفولیت میں ہیں۔ وحشی اور نیم وحشی قومیں فسانوں کی دلدادہ ہی نہیں بلکہ ان کا مذہب قصوں پر مبنی ہے اس لئے جو لوگ قصہ گوئی اور قصہ خوانی کو جہالت کا نتیجہ بتاتے ہیں، ان کے اصول کے مطابق تہذیب اور تمدن کی ترقی فسانوں کے حق میں سم قاتل ہونی چاہئے۔ مگر واقعات اس کے بالکل برعکس شہادت دیتے ہیں۔ آج یورپ کو اپنی تہذیب اور حیرت انگیز ترقی تمدن پر ناز ہے (اور یہ ناز حق بجانب بھی ہے)۔ اس کا کیا حال ہے؟ کم سے کم وہاں تو ہمیں امید کرنی چاہئے کہ قصہ کا شوق معدوم ہو گیا ہو گا اور سائنس نے اپنا سکہ جما لیا ہو گا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں سائنس اور علم ترقی کرتا جاتا ہے، اسی تیزی سے بلکہ اس سے دو چند اور سہ چند تیزی سے قصہ لکھنے اور پڑھنے کا شوق بڑھتا جاتا ہے۔ برمنگھم انگلستان کا مشہور تجارتی شہر ہے اور وہاں کے لوگ زیادہ تر تجارت اور حرفت پیشہ ہیں۔ اس شہر کے عام کتب خانوں کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۸۹۱ء قابل غور ہے۔ ان کتب خانوں میں ذیل کی بارہ قسموں کی کتابیں ہیں

(۱) مذہب اور فلسفۂ اخلاق (۲) سوانح عمری۔ سفر نامے (۳) قانون، پالٹیکس، تجارت (۴) صنعت و حرفت، سائنس، علم حیوانات (۵) نظم (۶) اخبارات اور رسالجات اسی مضمون میں شامل ہیں جس سے کہ وہ متعلق ہیں (۷) قصے اور افسانے نثر میں (۸) مختلف کتابیں جن میں کتب لغات وغیرہ شامل ہیں (۹) کتب متعلق پیٹنٹ (۱۰) بچّوں کے لئے کتابیں (۱۱) اُبھرے حرفوں میں کتابیں اندھوں کے لئے (۱۲) علم موسیقی۔ سال بھر میں ان کتب خانوں سے ۸۵۵۰۹۶ کتابیں لوگوں نے لیں جن میں سے ۵۱۹۵۹۵ ناول اور میگزین تھے باقی ۳۳۵۵۰۱ کتابیں دس اقسام پر منقسم تھیں۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہو گا کہ ۸۵۵۰۹۶ کتابیں جو لی گئی تھیں اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سب ایک دوسرے سے مختلف تھیں بلکہ اکثر کتابیں کئی کئی مرتبہ دی گئیں اور بطور علیحدہ کتابوں کے شمار کی گئیں۔

شاید یہ خیال کیا جائے گا کہ برمنگھم کے کتب خانوں میں بمقابلہ اور کتابوں کے ناول شمار میں بہت زیادہ ہوں گے اور اسی وجہ سے وہ زیادہ پڑھے گئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ ۱۵۹۲۳۰ کتابیں سب کتب خانوں میں ہیں اور ان میں سے صرف ۲۱۹۹۶ قصے کی کتابیں ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باوجودیکہ بمقابلہ ہر ناول اور میگزین کے پانچ کتابیں اور مضامین پر مہیا ہیں۔ لیکن پڑھنے کے لئے ہر آٹھ کتابوں میں جو قصے کی نہیں ہیں، یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ عموماً ان کا بہت تھوڑا حصہ پڑھا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ناول بغیر ختم کئے واپس نہیں کئے جاتے۔ یہ حال برمنگھم کا ہے جو ایک تجارتی شہر ہے اور اس لئے یہ خیال کرنا بے جا نہیں ہے کہ وہاں کتب صنعت و حرفت کی کچھ نہ کچھ مانگ ضرور ہو گی۔ مگر دوسرے اضلاع میں جو خاص طور پر تجارت کے مرکز نہیں ہیں، ناول

کے سوا بہت کم کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء میں بیسٹر سیافری لائبریری سے ۱۷۸۲۹۱ کتابیں لی گئیں۔ جن میں سے ۶۵۱،۴۸ محض ناول تھے یعنی بمقابلہ ہر دوسری قسم کی کتاب کے چار ناول لئے گئے[1]

یہ اس ملک کا حال ہے جس نے تمدن میں، علوم میں، فلسفہ و سائنس وغیرہ میں وہ وہ تحقیقیں کی ہیں جو کل دنیا کو حیرت میں ڈالتی ہیں۔ ہندوستان جسے ابھی ترقی کے صدہا مراحل طے کرنے ہیں اور جو ابھی یورپ کی صرف ریزہ چینی کر رہا ہے، بھلا کس شمار میں ہے۔ یہاں کی کتابوں کا سرمایہ ہی فسانوں پر محدود ہے۔ بہر حال واقعات اس خیال کی تائید نہیں کرتے۔ کہ تحقیقات علمی اور افسانے ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے اور علوم کی ترقی اور قصوں کا تنزل ہم معنی الفاظ ہیں۔ شاید یہ بات شاعری کے لئے ٹھیک ہو، مگر قصوں کے لئے تو ٹھیک نہیں۔

پھر کیا باعث ہے کہ افسانہ نگاری روز افزوں ترقی پر ہے؟ اس کی ایک بہت بہت معقول وجہ بتائی گئی ہے یعنی یہ کہ انسان کسی نہ کسی حد تک یونان کے فلاسفر اسپرسن پیٹس یا اپی کیورس کا پیرو ہے جن کا یہ قول ہے کہ اصلی مقصد زندگی کا خوشی ہے اور شوقینہ قصہ ناولوں کے پڑھنے والے بھی عموماً اس زمرے میں شامل ہیں۔ وہ جب کسی کتاب کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو اکثر کی غرض یہ ہوتی ہے کہ انہیں لطف حاصل ہو۔ نفوس قدسیہ شاید لاکھوں میں چار بھی نہیں ہوتے جو علم کو محض علم کے لئے حاصل کرتے ہوں اور جو ایسے ہیں وہ بھی خوشی کے بندے ہیں۔ اگر ایک سائنس کا دلدادہ رات دن تحقیقاتوں میں منہمک ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اسکو نہ مانیئے کہ وہ شہرت کا طالب ہے، اسکو بھی نہ مانیئے کہ وہ دولت و عزت کا طالب ہے۔ پھر بھی آپکو یہ ماننا پڑیگا کہ اسے اس خاص مضمون سے محبت ہے، یا دوسرے الفاظ میں کہو کہ اس مضمون میں اس کو لطف آتا ہے اور چونکہ علوم میں لطف حاصل کرنے کے لئے محنت اور کاوش کی ضرورت ہے، اس سے بچنے کے لئے وہ لوگ جو کتابوں سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں، قصوں کی طرف جھک پڑتے ہیں۔ یہ قدرتی حالت ہماری خواہش لطف کی ہے۔ ہر شخص کی فطرت میں یہ ودیعت کی گئی ہے اور اس سے کسی طرح مفر نہیں۔ ایک قدم آگے بڑھ کے ہم کو یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ یہ خواہش لوگوں میں منجملہ اور ذریعوں کے عموماً قصوں کے ذریعہ سے بھی پوری ہوتی ہے اور اس لئے یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اس کا استعمال اچھا ہو۔ دنیا کے بڑے بڑے ریفارمروں، پیغمبروں اور عالی دماغوں نے اس سے بڑے حصول کو پیش نظر رکھا ہے اور اس سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچایا ہے۔ حکایات لقمان، قصۂ کلیلہ و دمنہ نمونے ہیں اس کوشش کے، مذہبی کتابوں میں اس سے کام لیا گیا ہے۔ انجیل میں اکثر قصوں کے پیرائے میں نہایت اعلےٰ درجہ کے اخلاقی سبق دیئے گئے ہیں۔

باوجود ان باتوں کے، ناول نویسی کے برابر شاید لٹریچر کی کوئی شاخ ذلیل نہیں خیال کی گئی۔ اگر اردو کی فسانہ نگاری کے متعلق عام طور پر اچھی رائے نہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس لئے کہ حقیقتاً اردو کے اکثر ناول کسی تعریف کے مستحق نہیں ہیں، لیکن تعجب تو یہ ہے کہ انگلستان میں بھی جہاں عمدہ بلکہ عمدہ ترین قصوں کی اگر افراط نہیں تو کمی بھی نہیں ہے۔ وہاں بھی ایک کثیر گروہ ایسے لوگوں کا موجود ہے جو ناول نویسوں کو نہایت کم رتبتی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس امر کی شکایت خود ایک ناول نویس[2] نے ذیل کے الفاظ میں نہایت خوبی

---

[1] رسالہ انیسویں صدی، بابت جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۰۴۷ و ۱۰۴۸ [2] مس آسٹن۔ یہ انگلستان کی ایک مشہور ناول نویس گزری ہے جس کے لئے کارلائل نے یہ لکھا تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس کا بُت ہر گھر میں رکھواتا۔

سے کی ہے :-

"ہم کو چاہیئے کہ ہم ریویو کرنے والوں کو اپنی کاوش اور فکر کے نتیجوں (یعنی ناول) کو دل کھولکر بُرا کہنے دیں اور ہر نئے ناول کی اشاعت پر اس بات کی شکایت کرنے دیں کہ آج کل بیہودہ کتابیں اسقدر شائع ہوتی ہیں کہ جس کے بوجھ کا پریس متحمل نہیں ہوسکتا - ہم کو چاہیئے کہ ہم ایسے بُرے وقت میں ایک دوسرے کو چھوڑ نہ دیں کیونکہ ہم ایک مظلوم اور نقصان رسیدہ گروہ ہیں - اگرچہ ہماری تصنیفات نے لوگوں کو بمقابلہ کسی اور لٹریری گروہ کی تصنیفات کے بدرجہا زیادہ خوشی اور اصلی مسرت بخشی ہے، تاہم کوئی مضمون اتنا بُرا نہیں کہا گیا جتنا کہ ہمارا غرور کی وجہ سے یا جہالت کی وجہ سے یا محض اس وجہ سے کہ ناول کو بُرا کہنا فیشن میں داخل ہے - ہمارے دشمن بھی قریب قریب اتنے ہی ہیں جتنے ہمارے پڑھنے والے ہیں اور جب کہ ہزاروں قلم اس شخص کی تعریف میں گھسے جاتے ہیں - جس کا بڑا کام یہ ہے کہ اس نے تاریخ انگلستان کا اختصار شائع کیا ہے - گو کہ سیکڑوں اختصار پہلے بھی شائع ہو چکے ہوں یا جس کی بڑی لیاقت یہ ہے کہ اس نے مختلف شعرا کے کلام کو انتخاب کرکے چھاپ دیا ہو - یہ عام خواہش معلوم ہوتی ہے کہ ناول نویس کی لیاقت اور محنت کو کم کرکے دکھایا جائے اور اس کے اس کام کی جس میں سوائے ذہانت اور طباعی کے کچھ نہیں - ہتک کی جائے"

اس حالت میں بہت کچھ تبدیلی واقع ہوگئی ہے - کیونکہ مس آسٹن کی شکایت کو تقریباً ایک صدی گزری، اس عرصے میں اس قدر تبدیلی ہوگئی ہے کہ ہر کس و ناکس انگلستان میں ناول لکھنا اپنا فرض عین سمجھتا ہے - خاص کر وہاں کی لیڈیوں میں یہ خیال نہایت ہی داتق ہے - چنانچہ ایک مضمون نگار لکھتا ہے کہ "کہ اس امر کا بار ثبوت ہر تعلیم یا نیم تعلیم یافتہ عورت پر ہے کہ اس نے ناول نہیں لکھا"[۱] - تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ناول نویسی کی وہ عزت کی جاتی ہے جس کی مس آسٹن متمنی ہے - اس پر بھی ناول کا پبلک پر وہ اثر ہوا ہے کہ بعد نظم کے اور کسی چیز کا نہیں ہوا - انگلستان کے مشہور شاعر بائرن کی نظموں نے یونان کے آزاد کرانے میں بہت مدد دی ہے - اس کی پُرجوش نظموں کو پڑھ کر انگریزوں کے دلوں میں یونان کی حالت سے ہمدردی پیدا ہوئی اور ہزاروں انگریز یونان کی طرف سے ترکوں کے مقابلہ میں لڑے - قصوں نے بھی اس سے کچھ کم کام نہیں کیا - سر والٹر اسکاٹ نے جن مقامات کا اپنے قصوں میں سین کھینچا ہے، اُن کے دیکھنے کے لئے لوگ ایسے ہی شوق سے جاتے ہیں گویا کہ وہاں کے تاریخی واقعات گزرے ہیں - اور باوجودیکہ یہ مقامات عام راستے سے بہت علیحدہ ہیں اور نہ وہاں تجارت ہوتی ہے، لیکن چونکہ شایقین کے جوق جوق ناول پڑھ پڑھ کے ان مقامات کو دیکھنے جاتے ہیں، اس لئے ریلوے کمپنیوں نے آمدنی کی غرض سے وہاں ریلیں نکالی ہیں[۲] - ڈکنس کے ناول کا اثر اتنا ہوا کہ وہ جن باتوں کی اصلاح چاہتا تھا اُن کی خود اس کے زمانے میں اصلاح ہوگئی - غرض کہ اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ایک پُرزور ناول نویس نے اپنے ملک کی پبلک پر بہت کچھ

---

[۱] رسالہ انیسویں صدی نمبر ۲۴۳ مئی ۱۸۹۷ء صفحہ ۷۲۹ [۲] انیسویں صدی ۱۹۶ جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۵۸

اثر ڈالا ہے۔

مگر اس اثر ڈالنے کے لئے ہر ناول نویس کو قدم قدم پر ایک بہت بڑی بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے یعنی یہ کہ کوئی مافوق العادت واقعہ قصّہ میں نہ بیان کیا جائے۔ ایک زمانہ میں قصہ کی یہ خوبی سمجھی جاتی تھی کہ چُن چُن کے ایسی باتیں لکھی جائیں جو ناممکن الوقوع ہوں اور پڑھنے والے ان کو آسانی سے قبول کر لیتے تھے، اُن کے نزدیک محال اور معمولی واقعات دونوں یکساں تھے۔ اور وہ بہت سادگی سے دونوں پر یقین کر لیتے تھے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس کی زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں، کیونکہ کم از کم ہندوستان میں تو ایسے لوگ اب تک موجود ہیں جو داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا، فسانۂ عجائب اور گل بکاولی کے افسانوں کو سچے واقعات سمجھتے ہیں اور جن کے عقیدے میں ان کا ایک ایک لفظ صحیح ہے۔ ایسے لوگوں کو خوش کرنا مشکل نہیں ہے لیکن موجودہ زمانے کا قصہ پڑھنے والا ایک عجیب الخلقت شخص ہے۔ وہ جب قصہ پڑھنے بیٹھتا ہے تو اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ کل قصہ محض فرضی ہے، لیکن اس فرضی فسانے کو اس شغف اور شوق سے پڑھتا ہے گویا اس کے خاندان کی تاریخ ہے اور اگر کہیں بدنصیب ناول نویس اس قصے میں بھولے سے ایسی بات لکھ گیا جس کا ہونا اصلی زندگی میں پڑھنے والے کے نزدیک محال ہے تو فوراً نہایت غصہ سے کتاب پھینک دے گا اور یہ کہے گا کہ مصنف نے ہمارا وقت ضائع کیا جس کے گویا یہ معنی ہیں کہ اگر مصنف اتفاق سے وہ خاص ناپسندیدہ واقعہ نہ لکھتا تو وقت کا نہایت عمدہ استعمال ہوتا۔ یہ خاص ڈھنگ قصہ نگاری کا ہندوستان کے حدود میں داخل ہو گیا ہے، اور جیسا اور ملکوں میں بہت جلد قبول ہوا ہے، یہاں بھی آناً فاناً پھیل گیا۔ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اس طرز کا پہلا قصہ اُردو میں کب لکھا گیا۔ مگر پھر بھی یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ اس کو بیس تیس برس سے بہت زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا۔ اس قلیل مدت میں بھی ناول نویسی نے وہ سکہ جمایا جس کا خیال کرنے سے حیرت ہوتی ہے۔ ہر اخبار، ہر رسالہ، ہر چھاپہ خانہ اور اگر مبالغہ نہ ہو تو ہر دماغ ناولوں سے بھر گیا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے تسلط کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ مرحوم تہذیب الاخلاق کے پرچے کو بھی اس باجبروت حاکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔[1] یہ فخر شاید ہندوستان کو حاصل ہے کہ یہاں ایسے رسالے نکلے جن میں سوائے ناول کے ایک اور لفظ کسی مضمون کا نہیں تھا[2] اور غالباً یہ فخر بھی ہندوستان ہی کو حاصل ہے کہ باوجود یہ کہ کل ملک اس طرف ڈھل پڑا[3] پھر بھی اعلیٰ درجے کے ناول نویس نہ پیدا ہوئے۔ اعلیٰ درجہ کے تو کیا معمولی اور ادنیٰ درجہ کے بھی بہت پیدا نہیں ہوئے۔ اسوقت اُردو میں ناول لکھنے والے اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اُن میں سے چوٹی کے شمار کئے جاتے ہیں۔ جو افسوس ہے

---

[1] تہذیب الاخلاق میں ایک مرتبہ لٹن کے ناول "لیلیٰ" کا ترجمہ چھپنا شروع ہوا تھا۔ [2] اس قسم کا ایک پرچہ ناولسٹ کے نام سے سیالکوٹ سے شائع ہوتا تھا جس کا بقول اُس کے اُردو پر بڑا احسان یہ ہے کہ "دیار لندن کے اسرار" کا ترجمہ شائع کیا۔ اس قسم کا دوسرا پرچہ بمبئی سے مرقع عالم کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اگرچہ تھوڑے دنوں سے اس میں ایک مضمون کا بھی حصہ شامل کیا جاتا ہے مگر شروع شروع میں اس لحاظ سے محض ناول ہوتا تھا۔ [3] اسکی وجہ کہ کیوں غیر معمولی طور پر قصے فسانوں پر توجہ ہوئی۔ ایک تو وہی ہے جو آغاز مضمون میں بیان کیگئی ہے یعنی قصے انسان کی ایک ضرورت یعنی تلاش لطف کو پورا کرتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان ہمیشہ سے تخلیقات کا گہوارہ رہا ہے۔

کہ نصف درجن سے بھی کم ہیں - اس میں شاید اختلاف ہو کہ بلحاظ عمدگی کے اوّل پایہ کس کا ہے - مگر بلحاظ قبول عام اور شہرت کے میں بھی تین نام زیادہ سنتا ہوں یعنی شمس العلما مولوی نذیر احمد، مولوی عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ (مصنف فسانۂ آزاد) ان تینوں صاحبوں کی خصوصیات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ہر ایک ایک خاص طرز کا موجد سمجھا جاتا ہے - اور اگر یہ ٹھیک ہے کہ "تاریخ کی سب سے سچی اور حقیقی شکل تقلید ہے" تو مولوی عبدالحلیم شرر ہی وہ خوش قسمت شخص معلوم ہوتے ہیں - جن کی سب سے بڑھ کر تعریف اگر قصہ خواں نہیں تو قصہ نویس ضرور کرتے ہیں - ان کے پیرو بہت زیادہ ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اردو کے ناول نویس سوائے ان کے اور کسی کی تقلید کرتے ہی نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بعض بعض رشید شاگردوں نے پیروی اور تقلید کا حق ادا کر دیا ہے - یہ بحث کہ ان تینوں صاحبوں کے ناول کس حیثیت اور کس درجہ کے ہیں - نہایت نازک بحث ہے اور اس کا تصفیہ ایک شخص کی رائے پر منحصر نہیں ہو سکتا - ہاں ناول کے مختلف معیار اور اقسام گنائے جا سکتے ہیں اور پھر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ آیا وہ ان معیاروں پر ٹھیک اُترتے ہیں یا نہیں -

قصے کی سب سے اعلیٰ قسم وہ مانی گئی ہے جس میں مصنف انسانی فطرت پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالتا ہے اور پھر انسانی جذبات اور انسانی افعال کا ایسا بے نظیر نقشہ کھینچتا ہے جو اس کے اختیار سے باہر معلوم ہوتا ہے اور جسے لوگ حیرت زدہ ہو کر الہام کا خطاب دینے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے - انسانی فطرت کا ایسا مطالعہ کرنے والا صدیوں میں ایک آدھ ہی پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی کسی خاص ملک میں - شکسپیئر کے ناٹکوں کو اسی باعث سے انجیل کے بعد دوسرے درجہ پر رکھا گیا ہے اور نثر کے فسانہ نگاروں میں ایک ناولسٹ[لہ] کو بعض لوگ شکسپیئر کا ہم پلّہ مانتے ہیں - دوسری قسم کے قصے وہ ہوتے ہیں جن کے ذریعہ سے کوئی خاص اخلاقی سبق یا تعلیم دینی مقصود ہوتی ہے - اس قسم میں کم و بیش کُل ناول آ سکتے ہیں - اس لئے کہ ہر قصے میں مصنف کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور دکھانا چاہتا ہے - اگرچہ جب وہ قصہ لکھنے بیٹھتا ہے تو کوئی خاص اخلاقی تعلیم اس کے پیش نظر نہ ہو - تاہم اس میں زیادہ تر وہ ناول شامل کرنے چاہئیں جو بالقصد کسی خاص غرض کے لئے لکھے ہوں -

تیسری قسم تاریخی قصوں کی ہے - یہ ایک بہت صاف قسم ہے - اس میں مصنف کسی خاص تاریخی واقعہ کو لیکر کچھ کمی و بیشی کے ساتھ فسانے کے پیرائے میں بیان کرتا ہے -

پھر سراغ رسانی اور اسرار کے قصے ہیں - ان کی تعداد ہر جگہ بہت زیادہ ہوتی ہے اور نوجوانوں اور عام لوگوں کو یہ بہت پسند آتے ہیں ——— یہ آخری قسم بہت وسیع ہے اور اپنے دائرے میں ہر قصے کو لے لیتی ہے - جسے باقی اقسام نے لینے سے انکار کیا ہو -

ان قواعد کے مطابق ہر زبان میں قصوں کی عمارت مثل ایک عمارت کے جس کے کئی درجے ہیں اور ہر درجہ اپنے نیچے کے درجے سے چھوٹا ہوتا ہے - یہاں تک کہ آخری اور سب سے اعلیٰ درجہ چھوٹا ہوتے ہوتے بالکل ایک اقلیدسی خطرہ جاتا ہے - مگر اردو

لہ جارج الیٹ کی طرف اشارہ ہے - یہ بھی ایک مشہور لیڈی ناولسٹ تھی - "جارج الیٹ" مردوں کا نام ہوتا ہے - مگر وہ اپنی کتابوں پر یہی نام لکھا کرتی تھی - اس لئے اس نام سے مشہور ہے -

لٹریچر میں اس مینار کے اوپر کے بہت سے درجے بننے باقی ہیں۔

ہمارے ناول نویس عموماً (میں جانتا ہوں کہ بعض نہایت معزز اور قابل فخر مستثنیات بھی ہیں) بہت کم اس درجے سے اوپر گئے ہیں جہاں ہر چیز سوائے اس کے جو قانون کے شکنجوں میں نہ پہنچا دے۔ اخلاقاً جائز خیال کی جاتی ہے۔ بلحاظ نفس مضمون کے طرزِ عبارت عمداً ایسی اختیار کی جاتی ہے جس سے ایک قدم آگے بڑھنا گویا اپنے تئیں قانون کے ہاتھوں میں دینا ہے۔ یہ تو ان معدودے چند ناولوں کا حال ہے جو اُردو میں تصنیف کئے گئے ہیں۔ ترجموں کی تعداد اُن سے بہت زیادہ ہے۔ ان ترجموں کے متعلق عام شکایت یہ ہے کہ ایسے ایسے قصوں کا ترجمہ کیا جاتا ہے جو اُردو کے ناولوں سے بدتر ہیں۔ یہ شکایت بہت کچھ صحیح ہے اور اس کا الزام مترجموں پر عاید ہوتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں وہ بھی معذور ہیں۔ اوّل درجے کے ناول انگریزی میں ایسے نہیں جن کا ترجمہ اُردو میں ہونا محال ہے۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کے ناول نویس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اصلیت کی ہوبہو تصویر اُتارے اور اس لئے وہ جس شخص کی زبانی گفتگو کرتا ہے، اس کی سی زبان بولتا ہے۔ مثلاً ایک جاہل اور گنوار شخص کی زبان میں وہ اُن سب باتوں کا خیال رکھے گا جو ان کے روزمرہ میں داخل ہے۔ جس طرح وہ الفاظ کو غلط بولتے ہیں اُسی طرح وہ بھی غلط بولے گا۔ جس طرح وہ غلط لکھتے ہیں (اگر وہ کچھ پڑھے لکھے ہوں) تو اسی طرح وہ بھی غلط لکھے گا۔ جس خاص مقام یا جگہ کی وہ زبان لکھے گا، اُس کے لب و لہجہ کی حتی الامکان نقل اُتارے گا۔ چنانچہ انگریزی کی مشہور لیڈی ناولسٹ جارج الیٹ نے اپنے ناولوں میں ایک خاص ضلع کے گنواروں کی زبان لکھی ہے۔ جو اس قدر غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہوتی ہے ....

.... کہ خود انگریز جو اس ضلع کے رہنے والے ہیں۔ اسے آسانی سے سمجھ نہیں سکتے۔ میں نہیں خیال کر سکتا کہ ایسے ناول کا اُردو میں ترجمہ کیونکر ہو سکتا ہے، اور اگر اس زبان کا معمولی اُردو میں ترجمہ کر دیا جائے تو ناول کی اصلی خوبی ساقط ہو جائے گی۔ ادنیٰ درجہ کے ناولوں میں علاوہ مضامین کی خرابی کے ایک کمی جو مصنف کی کم لیاقتی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ ہوتی ہے کہ اس میں مختلف مدارج کی زبان کا خیال نہیں ہوتا۔ ان ناولوں میں ایک معمولی جاہل بھی اسی شستہ زبان میں باتیں کرتا ہے جس میں کہ ایک تعلیم یافتہ اور خاندانی امیر لوگوں کے دل لبھاتا ہے۔ یہ ایک بڑی وجہ ہے جو اچھے قصوں کے ترجمے ہونے کی مانع ہے۔ لیکن اس سے یہ الزام نہیں آتا کہ کوئی عمدہ ناول ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

ایسے بھی ناول ہیں، جن میں خوش حال اور تعلیم یافتہ متوسط لوگوں کی زندگی کا نقشہ اُتارا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی زبان صاف ہوتی ہے، خیالات سلجھے ہوئے ہوتے ہیں، اور میرے نزدیک یہی ناول ہیں جن کا ترجمہ ہونا ضروری ہے، کیونکہ اُنکے ذریعہ سے انگلستان کے متوسط درجہ کے لوگوں کی زندگی کا پتہ چلتا ہے، اور متوسط درجہ ہی ہر ملک میں وہاں کے علم و اخلاق کا معتدل نمونہ ہوتا ہے۔ ——— اُردو میں جن ناولوں کے اب تک ترجمے ہوئے ہیں، شاید اُن کا حامی یہ کہے کہ اُن ناولوں میں بھی متوسط درجے کے لوگوں کا حال بیان کیا جاتا ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ وہاں کی زندگی ہی گندہ ہے، جس کا مجبوراً مصنف کو ذکر کرنا پڑیگا۔ مگر میں یہ عرض کرونگا کہ اس بات کا بھی ثبوت آپکے ذمہ ہے کہ وہاں کی زندگی اس قدر گندہ ہے۔ کسی کتاب کے مضامین ہی پر اگر اس امر کے تصفیہ کا دارومدار ہو تو مجھے خوف ہے کہ ہر ایک قوم کو اور خود مسلمانوں کو سر بہ گریباں ہونا پڑیگا۔ مثنوی غیمت اور زہر عشق اور بہار عشق وہ کتابیں ہیں جو ہماری سوسائٹی کی کچھ بہت دل خوش کُن تصویر نہیں کھینچتیں۔ اور اگر کوئی غیر قوم کا شخص محض اس قسم

کی کتابوں سے ہمارے اخلاق پر رائے قائم کرے۔ تو ہمارے حق میں کس قدر ناانصافی ہوگی

تصویر کا صرف تاریک رُخ یا محض روشن رُخ دیکھنا، دونوں اس شخص سے بعید نہیں جس کا مقصد بیان حقیقت ہو سوسائٹی کی سچی تصویر کھینچنے والا، دونوں حالتوں کو دکھاتا ہے، لیکن بداخلاقی کی حالت کو ایسی عریانی میں نہیں دکھاتا جس پر نظر ڈالتے ہی سے خود حیا کی پیشانی عرق آلود ہو جائے۔ اوّل قانون، پھر قانون کے بعد اخلاق مانع ہے کہ ان سے وہ پردہ اُٹھایا جائے جو اب تک پڑا ہُوا ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ صرف ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ زخم کو چیر پھاڑ کر اس کے متعفن مواد کو نظروں کے سامنے بہنے دیا جائے؟

اس لئے ایسی کتابوں اور قصّوں کا ترجمہ کرنا جن میں بے حیائی سے بداخلاقی کو عریاں حالت میں دکھایا گیا ہے۔ اپنے قوم کے اخلاق کو بگاڑنا اور اس قوم کی بدخواہی کرنے اور الزام لگانے میں شریک ہونا ہے، جس کے متعلق وہ قصّہ ہو۔ "اگر بُرائی سے بچنے کا بہترین طریقہ بُرائی سے آگاہ کر دینا ہے"۔ تو بھی تہذیب کا رشتہ ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ ایک دوسری خرابی جو ان قصّوں میں پائی جاتی ہے، جن کا ترجمہ اُردو میں ہُوا ہے، یہ ہے کہ قصّہ کے ہیرو کے عیب اس پہلو اور ڈھنگ سے دکھائے جاتے ہیں جو پڑھنے والے کی نظر میں عیب نہ معلوم ہوں۔ اور یہ سخت ترین اور ذلیل ترین دھوکا ہے جس کے ذریعہ سے پڑھنے والے کو شہد کا نام لے لے کے زہر ہلاہل پلایا جاتا ہے۔ اس خاص طرز پر ہمارے اُردو کے ناول نویسوں نے بہت توجہ کی ہے اور نہایت محنت سے اسے سیکھا ہے۔ فسانہ آزاد میں مسٹر آزاد اس کی اچھی مثال ہیں۔ آزاد لائق بھی ہیں، بہادر بھی ہیں لیکن بے طرح عاشق مزاج ہیں۔ اس لئے کہ ہیرو پر کسی قسم کا الزام نہ آئے، یہ ترکیب نکالی جاتی ہے کہ ہر ایک حسین لیڈی خواہ وہ مسلمان ہو، ہندو ہو یا عیسائی ہو، اُن پر نظر ڈالتے ہی عاشق ہو جاتی ہے اور یہ حتی الامکان کسی کا دل نہیں دُکھاتے۔ (مَیں نہیں کہہ سکتا کہ کس مشکل سے مَیں نے گذشتہ فقرہ لکھا ہے کیونکہ ہر ایک لفظ پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ مَیں تہذیب کے حدود سے باہر نکلا جاتا ہُوں اور شاید مَیں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا ہوں) ہمارے ناولوں میں ہیرو ہر قسم کے عیش پرستی کے مرتکب دکھلائے جاتے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ ان کے عیب عیب نہ معلوم ہوں۔

تاریخی ناولوں میں بھی ایسی رکیک غلطیاں کی جاتی ہیں، جن سے نہایت تعجب ہوتا ہے۔ مَیں خیال کرتا ہُوں کہ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی تاریخی فسانہ لکھنے کے وقت اس بات کا خیال رکھے گا کہ کوئی ایسا واقعہ نہ لکھا جائے جو اس زمانے میں نہیں ہُوا تھا مثلاً اگر کوئی شخص یہ لکھے کہ سکندرِ اعظم مقدونیہ سے ایران تک بذریعہ ریل کے آیا اور وہاں دارا کو شکست دی۔ تو سوائے اس کے کوئی وجہ خیال میں نہیں آئے گی کہ یا تو یہ شخص مذاق کر رہا ہے یا اس کا دماغ صحیح نہیں ہے۔ مگر بعینہٖ ایسی مثال میں نے ایسے قصّہ نویس کے ناول میں دیکھی ہے جس کی ناول نویسی کا شہرہ آج کل دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ ناول میں قدیم روما کے زمانے کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں ہیرو طب، علمِ طبیعات وغیرہ پر بحث کرتا ہے اور ان کل تحقیقاتوں اور ایجادوں کا معمولی طور پر ذکر کرتا ہے جو انیسویں صدی میں معلوم ہوئی ہیں۔

ہمارے ناولوں میں پلاٹ کی بہت بڑی کمی ہوتی ہے۔ ناول کے لئے عشق اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لئے جان۔ عشق کے بعد جنگ کا نمبر ہے۔ مَیں نے انگریزی میں ایسا کوئی ناول نہیں دیکھا جس میں عشق کا عنصر موجود نہ ہو اور نہ اس قسم کے

ناول کا کوئی ذکر سُنا۔ یہ بات انگریزی ناول نویسی کے علوم متعارفہ میں سے ہے کہ بغیر عشق کی چاشنی کے کوئی ناول ناول کے نام سے نہیں پکارا جا سکتا۔ انگریزی ہی پر کیا موقوف ہے، خود اُردو کے قصوں میں عشق داخل کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک بہت بڑا فرق انگریزی اور اُردو کے قصوں میں یہ ہے کہ ان میں جب عشق کا سلسلہ چلتا ہے تو بالکل نیچرل معلوم ہوتا ہے اور اُردو میں از سرتا پا بے جوڑ۔ پُرانے قصوں میں تو کوئی شہزادہ چھت پر سوتا ہوتا تھا اور عاشق ہونے کے لئے کوئی پری اُڑ کر آتی تھی یا خود شہزادے کو خواب میں کسی شہزادی کی صورت نظر آجاتی، یا جاگنے کی حالت میں اس کی تصویر دیکھ لیتا تھا۔ یا اُس کے حُسن کی تعریف سُن لیتا تھا اور سو جان سے فدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اب یہ مجبوری ضرورت زمانہ نے سوائے تصویر کے یہ سب باتیں بند کر دی ہیں۔ اب قصوں میں یا تو تصویر کے ذریعہ سے یا اُٹھتے بیٹھتے کوئی جھلک نظر پڑ جانے سے عشق پیدا ہو جاتا ہے اور یہ دونوں میرے نزدیک زیادہ نیچرل نہیں ہیں۔ ہاں ایک اور طریقہ ہے اور وہی طریقہ ہماری سوسائٹی میں ممکن ہے یعنی بچپن میں ایک ساتھ رہنا اور محبت کا پیدا ہو جانا۔ میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب کا سب سے بڑا کمال اسی میں سمجھتا ہوں کہ وہ اُردو کے پہلے قصّہ نویس ہیں، جن کی غائر نظر اس نکتہ پر پہنچ گئی کہ ہندوستانی سوسائٹی یا (زیادہ صحیح طور پر) ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں شادی سے پہلے جائز عشق معدوم ہے۔ اور اس لئے انہوں نے عشق کا حصّہ ہی اپنے قصّوں میں نہیں رکھا اور یہ حق ہے کہ اس کمی سے قصّہ میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوئی، بلکہ میرے نزدیک اُن کے ناول سوسائٹی کے حال کے بالکل مطابق ہو گئے۔ ہمارے اور ناول نویس اس تہ کو نہیں پہنچے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اپنا پلاٹ ہندوستان کے باہر رکھنا پڑتا ہے یا عشق کو اس ترکیب سے داخل کرنا پڑتا ہے جو معمولی شریف آدمی کے ہاں ہرگز نہیں ہوتا۔ لیکن انگریزوں کو، جن کے ہاں پردہ نہیں ہے، یہ دقّت بالکل محسوس نہیں ہوتی، اس لئے ہر ناول میں محبت بالکل نئے طرز اور نرالے ڈھنگ سے پیدا ہوتی اور پھلتی پھولتی ہے۔

ایک اور بات ہے جس کی طرف ہمارے ناول نویسوں نے توجہ نہیں کی، یعنی یہ کہ ناول کے ہیرو کے لئے تعلیم یافتہ یا امیر ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔ غریب اور غیر تعلیم یافتہ بھی اتنا ہی اچھا ہیرو ہو سکتا ہے جتنا کہ تعلیم یافتہ۔ نیکی اور دوسری صفات کچھ علم اور امارت کے ساتھ ہی وابستہ ہیں بلکہ اکثر حقیقی نیکی غریبوں ہی میں پائی جاتی ہے مگر ہمارے ناول نویسوں نے خیال کر لیا ہے کہ ہیرو کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک نہایت ہی اعلیٰ خاندان کا ہو، نواب زادہ ہو یا شہزادہ ہو، یا کم سے کم معقول آمدنی رکھتا ہو۔ علم بھی معمولی نہ ہو۔ غرض کہ ہر طرح اعلیٰ سوسائٹی میں ہو اور جب تک کہ ان قیود کی پابندی نہ کی جائے۔ ناول کا ہیرو اُن کے خیال ہی میں نہیں آسکتا۔ ابھی تک اُردو میں غربت کی زندگی کا نقشہ کھینچا جانا باقی ہے اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ محض غریب لوگوں کی زندگی کے متعلق ناول لکھے جائیں۔ یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے جس پر اب تک کسی نے قلم نہیں اُٹھایا۔ لیکن جس کو کامیابی کے ساتھ پُورا کرنے کے لئے بڑی معلومات اور وسیع تجربے اور عمیق مشاہدے کی ضرورت ہے۔ شاید یہ تعجب کی نظر سے دیکھا جائے گا کہ انگلستان کے اول درجے کے ناول نویسوں میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے غریب لوگوں کے حالات کی تصویر کھینچنے ہی میں کمال دکھایا ہے۔

ناول نویسی کے بڑے بڑے اصول تو ضمناً زیر بحث آچکے ہیں لیکن جزئیات کے متعلق بھی چند باتیں ہیں جن کا

یہاں تحریر کرنا بے موقع نہ ہوگا۔ ان نصیحتوں کا پیش کرنے والا میں نہیں ہوں (اور شاید اس اظہار سے لوگ ان نصیحتوں کو قبول کرنے پر زیادہ مائل ہوں) بلکہ آجکل کا ایک مشہور انگریزی ناولسٹ ہے جس نے انکو شائقین کی خاص درخواست پر لکھا ہے[1]۔

(۱) کبھی ناول نویسوں کے زمرے میں شامل ہونے کی کوشش نہ کرو جبتک کہ تمہیں یہ یقین نہ ہو کہ خدا نے اس کی خاص قابلیت عطا کی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو سیکڑوں اور مفید کام ہیں جن میں تم مشغول ہو سکتے ہو اور اپنے ہم جنسوں کو فائدہ پہنچا سکتے ہو۔

(۲) ناول کو بغیر پلاٹ سوچے ہوئے شروع نہ کردو۔ اور پلاٹ کسی ایسے واقعہ کا ہونا چاہئے جو تمہارے یا تمہارے دوست کے مشاہدے میں گذرا ہو۔ جس نے تم پر بہت اثر کیا ہو۔ اس واقعہ میں تم حسب مرضی کمی و بیشی کر سکتے ہو۔

(۳) ناول کو شروع کرنے سے پہلے یہ اچھی طرح سوچ لو کہ اس کو ختم کس طرح کروگے۔

(۴) جب تک تمہاری شہرت قائم نہ ہو جائے۔ ٹریجڈی[2] نہ لکھو۔ اس لئے کہ ٹریجڈی کو بہ مقابلہ کامیڈی کے پسند کرنے والے کم ہیں۔ اور اکثر نو عمر قصہ نویسوں کو ٹریجڈی لکھنے کا شوق ہوتا ہے۔

(۵) جب تک تم تاریخ سے نہایت اچھی طرح واقف نہ ہو، تاریخی قصہ لکھنے پر قلم نہ اٹھاؤ۔ عموماً لوگ اپنے ہی زمانے کے اور اپنے ہی لوگوں کے حالات زیادہ سننا چاہتے ہیں۔

(۶) اپنے ہیرو اور ہیروئین کے بچپن کے حالات کو طوالت سے مت بیان کرو۔

(۷) جس مقام کے حالات اور سینری بیان کرنا چاہو، اس مقام سے عمدہ طور پر واقف ہو۔ لیکن وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی ضرورت[3] نہیں کیونکہ اکثر زیادہ واقفیت کی وجہ سے مصنف بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ذکر کرنے لگتا ہے جو پڑھنے والوں پر گراں گذرتی ہے۔

(۸) شروع شروع میں اپنے خیالات، سوسائٹی کے اخلاق و رسوم کی نسبت اپنے ناول کے کیرکٹر کی زبانی ظاہر کرو۔ تو بہتر ہے۔ اگرچہ اس کی پابندی بہت ضروری نہیں ہے۔

(۹) کتاب کا نام نہایت غور و فکر سے رکھو۔ نام ایسا ہو جس سے خواہ مخواہ اس کے دیکھنے کی خواہش پیدا ہو۔ کتاب کے ایسے نام جو ہیرو اور ہیروئین کے نام کو ملا کر بنائے جاتے ہیں۔ محض بے معنی نام ہوتے ہیں۔ ان سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس کے اندر کیا ہوگا۔ اس لئے فسانہ نگار کو اس قسم کے ناموں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ ہاں جب اس کی شہرت قائم ہو جائے تو وہ اس وقت جس طرح کے نام چاہے رکھے[4]۔

---

[1] از مضمون "کمپلیٹ ناولسٹ" مرتومہ جیمس پیس۔ اسٹرینڈ میگزین ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۲۶

[2] ٹریجڈی وہ قصہ ہے جس کا انجام ناکامی اور رنج ہو۔ کامیڈی وہ قصہ ہے جو خوشی اور کامیابی پر ختم ہو۔

[3] یہ نصیحت ہمارے ناول نویسوں کو کچھ بے سود ہے جو ہر باب کا ہر تین چوتھائی حصہ ایسے مقام کی سینری بیان کرنے میں رنگتے ہیں جسے انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔

[4] مثلاً حامد اور حسن آرا، سعید اور زہرہ بیگم، مرزا خورشید قمر زمانی وغیرہ وغیرہ۔

متذکرہ بالا قواعد صرف اس شخص کو مدد دے سکتے ہیں جس کی طبیعت فطرتاً نقشہ تراشنے اور تصنیف کرنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ ہر شخص کو امید نہ کرنی چاہیئے کہ وہ ان قواعد کو سامنے رکھ کر کوئی عمدہ ناول تصنیف کر سکے گا۔

اس وقت اُردو میں ناول نویسی کی کیا حالت ہے؟ اور آیندہ کے متعلق کیا توقعات ہیں؟ میں ان لوگوں میں ہوں جو موجودہ حالت کو غیر اطمینان بخش خیال کرتے ہیں لیکن اُن میں نہیں ہوں جو اُن کی آیندہ ترقی سے مایوس ہوں۔ بے شک اب تک بہت کم قابل لوگوں نے اس طرف توجہ کی ہے۔ جو ناول لکھے گئے ہیں اور جو ترجمے کئے گئے ہیں وہ ہر لحاظ سے قابلِ افسوس ہیں لیکن یہی بات کہ اس وقت تک بہت کم ناول قابل دماغوں سے نکلے ہیں، اس بات کی امید دلاتی ہے کہ اگر انہوں نے توجہ کی (اور اُن کا فرض ہے کہ وہ توجہ کریں) تو بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔ یہ بات نہیں مانی جا سکتی کہ پبلک عمدہ تصنیفات کی قدر نہیں کرتی۔ کیونکہ اب تک جو عمدہ ناول شائع ہوئے ہیں ان کو پبلک نے نہایت شوق سے لیا اور مصنف کی کاوش اور محنت کی داد دی۔ عمدہ ترجمے بھی اگر شائع ہوں گے تو مجھے یقین ہے[1] کہ وہ بھی گمنام نہ رہیں گے۔ بلکہ ضرور مقبول ہوں گے اور میں خوشی سے دیکھ رہا ہوں کہ اس طرف وہ لوگ متوجہ ہونے لگے ہیں جو ان کاموں کے قابل ہیں۔

معارف

جلد ۱ - شمارہ ۴ - یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء

---

[1] اس مقام پر مجھ کو ان انگریزی ناول نویسوں کے نام گنانے چاہئیں جن کی تصانیف کے ترجموں کا میں متمنی ہوں۔ سب میں اوّل لارڈ لٹن کے وہ ناول ہیں جو تاریخانہ حیثیت سے بے نظیر سمجھے جاتے ہیں اور جن سے اُردو دانوں کو بھی وہی دلچسپی ہونی چاہئیے جو انگریزوں اور کسی اور قوم کے لوگوں کو ہے کیونکہ ان میں سلطنت روما کے اس زمانے کا حال بیان کیا گیا ہے جبکہ وہ اپنے معراج کمال پر تھی، پھر جین آسٹن کی کل تصانیف، سروالٹر اسکاٹ اور شارٹ امینگ وغیرہ کے بعض بعض ناول میں چاہتا ہوں کہ ترکی ناول بھی اُردو میں لائے جائیں، مگر وہ ناول جن کے مصنف ترک نہیں۔ ان ناولوں کا ترجمہ کرنا بے فائدہ ہے جو خود ترکی ہی میں فرنچ سے آئے ہیں کیونکہ فرنچ ناول نویسی میں بہت بدنام ہیں۔ مصر اور شام کے عربی ناولوں سے بھی اُردو خوان پبلک کو آشنا کرنا چاہیئے۔

سجاد حیدر یلدرم

مسئلۂ ازدواج پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات

اس امر کو بیان کرنا ایک بدیہی بات کو بیان کرنا ہے کہ انگریزی تعلیم نے ہمارے طرزِ خیال کو بالکل بدل دیا ہے اور
نئی آرزوئیں، نئی تمنائیں اور نئے خیالی مناظر (Ideals) ہمارے سامنے پیدا کر دیئے ہیں ہم جس پہلو سے زندگی ا
تعلقات زندگی پر نظر ڈالتے ہیں، وہ، وہ پہلو نہیں ہے، جس سے کہ ہمارے بزرگ نظر ڈالتے تھے۔ اس نئے طرزِ خیال کا ا
ہر چیز میں نظر آئیگا۔ پالٹکس، سوسائیٹی، لٹریچر اور بعض کے نزدیک تو مذہب میں بھی یہ اثر ایک نہ ایک حد تک سرایت کر گ
ہے۔ پالٹکس میں ہم قانون کی حکومت چاہتے ہیں۔ ہمارے بزرگ ظل اللہ کے زبان فیض ترجمان کو قانون جانتے تھے۔ اسی
طرح ہماری سوشیل زندگی ہمارے بزرگوں کی سوشیل زندگی سے مختلف ہے۔ یا زیادہ طور پر صحیح یہ ہوگا کہ ہم اُسے مختلف
کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سوشیل زندگی میں زیادہ آزادی یا اپنے مخالفین کی زبان میں زیادہ بد تہذیبی کے خواہش مند ہیں۔ یہ بحث
کرنا میرا کام نہیں ہے کہ آیا ہم جو کچھ چاہتے ہیں۔ وہ کہاں تک ٹھیک ہے۔ آیا وہ طرزِ خیال اور وہ طرزِ معاشرت جس کے
ہم دلدادہ ہیں۔ معائب سے پُر ہے، یا محاسن سے اُس میں خوبیاں زیادہ ہیں یا بُرائیاں۔ اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ کچھ
تو اس لئے کہ یہ کام میری لیاقت سے باہر ہے اور کچھ اس لئے کہ خوبیوں اور بُرائیوں کا قطعی ہونا محال ہے۔

پالٹکس اور لٹریچر وغیرہ میں جو تبدیلیاں آہستہ آہستہ ہو رہی ہیں وہ بجائے خود بہت کچھ مہتم بالشان ہیں، اور ایک دُو
بین نظر کے لئے ان میں بھی بہت کچھ دیکھنے اور غور کرنے کے لائق سامان موجود ہے۔ مگر میں مسلمانوں کے سوشل زندگی
کے ایک خاص شعبہ کے یعنی شادی کے متعلق نئی تعلیم سے متاثر لوگوں کے خیالات اور آرزوئیں ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔
اس لئے کہ اس بارے میں مجھے اُن خیالات سے کامل واقفیت ہے۔ اور شاید تھوڑی بہت ہمدردی بھی ہے۔ میں اُن
خیالات کا ظاہر کرنا اس وجہ سے اور بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی طرف سے چشم پوشی یا بے اعتنائی کرنا ایک سوشیل خطرہ ہے
ہمیں اپنے بزرگانِ قوم سے امید رکھنی چاہیئے کہ اگر یہ خیالات مستحسن ہیں تو وہ ہمیں مدد دیں گے۔ ورنہ اُن کا تدارک کریں گے
یہ خیالات ایسے نہیں ہیں کہ ابھی تک اُن کی کسی کو خبر نہ ہوئی ہو۔ لیکن ان کی طرف سے جو بے پروائی ظاہر کی جارہی ہے
اس نے مجھے اس بات پر مائل کیا کہ ان کا اعادہ کر کے اُن پر توجہ دلاؤں۔

یہ عام شکایت ہے اور غالباً ایک حد تک صحیح بھی ہے کہ آج کل کے نوجوان رسمِ ازدواج و شادی سے عام طور پر
بددلی ظاہر کرتے ہیں۔ ایسی بددلی جو قابلِ ملامت ہے۔ اس نے مسلمانوں کے بہت سے شریف خاندانوں میں کشیدگی
پیدا کر دی ہے جہاں کہ والدین اپنے نئے تعلیم یافتہ لڑکے کی شادی کرنے کے خواہشمند ہیں اور لڑکا بجائے اس کے کہ

دل خوش کن تجویز کو بطیب خاطر منظور کرے۔ ہر طریقہ سے یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ بجا رہے لیکن جس قدر یہ بد دلی عام ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ اس کے نتائج اس قدر عام نہیں ہیں۔ باوجود ان تمام مخالفتوں کے جو نئے تعلیم یافتہ اس معاملہ میں اپنے والدین سے کرتے ہیں۔ ان کی شادیاں کر دی جاتی ہیں۔ اور میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی متاہل زندگی اس طرح گزار دیتے ہیں جس طرح ایک معزز اور شریف آدمی کو گزارنی چاہیئے۔ وہ اپنے معاشری فرائض کے ادا کرنے میں حتی الوسع کوتاہی نہیں کرتے اور اپنی بیویوں سے بدسلوکیوں کے ملزم قرار نہیں دیئے جاتے۔ ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ بد دلی اس قدر عام ہے تو والدین کا کہنا کیوں مانا جاتا ہے؟ اور پھر متاہل حالت میں کیوں تنفر کے برعکس کیفیت ظاہر کی جاتی ہے؟ کیوں اپنی بیویوں کی صورت سے یہ نئے تعلیم یافتہ شوہر بیزار نہیں ہو جاتے؟ یہ سوالات نہایت معقول ہیں اور شاید اسی قسم کے سوالات نے والدین کے یہ ذہن نشین کر دیا ہے کہ عام طور پر شادی سے انکار محض شرم کی وجہ سے کیا جاتا ہے ورنہ عورتوں کا محاورہ استعمال کرنے کی اجازت ہو تو یہ کیفیت ہے کہ "من بھائے اور مُنڈیا ہلائے" ان باتوں کی وجہ سے والدین اس بد دلی کی پرواہ نہیں کرتے۔ لیکن اس کو ظاہری بد دلی خیال کرنا سخت غلطی ہے اور اس کی طرف توجہ نہ کرنا آخر کار ہماری سوسائٹی میں ضرور کچھ عرصہ کے بعد بُرے نتائج پیدا کرے گا۔ اگر اس زمانے کے نوجوان باوجود اس تمام اظہار بد دلی کے والدین کی اطاعت کرتے ہیں اور شادی ہو جانے کے بعد اپنی بیویوں سے نفرت نہیں کرتے۔ تو اس کا باعث یہ نہیں قرار دینا چاہیئے کہ وہ اصل میں بد دل نہیں ہیں اور جو اس ظاہری بد دلی کی محرک ہے۔ میں ان کے خیالات سے اچھی طرح واقف ہوں اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ آج کل کے کل تعلیم یافتہ نوجوان موجودہ طریقہ شادی کو سخت قابلِ اصلاح تصور کرتے ہیں۔

وہ جہاں اُن کے والدین کہتے ہیں شادی کر لیتے ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ وہ اپنے والدین کی خوشی کو اپنی خوشی کو مقدم رکھتے ہیں اور شادی کے بعد بیوی سے بدسلوکی نہیں کرتے۔ محض اس لئے کہ جو شخص عمر بھر کے لئے اُنکے سپرد کر دیا گیا ہے اسے تکلیف اور رنج پہنچانا خلافِ شرافت اور بعید از انسانیت خیال کرتے ہیں۔ مگر کسی چیز سے نفرت نہ ظاہر کرنے اور رغبت کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ کیا کوئی سچے دل سے کہہ سکتا ہے کہ یہ نئے نوجوان ایسی بیویوں سے اس درجہ محبت کرتے ہیں جسے عشق کے نام سے پکار سکیں؟ کیونکہ اگر متاہل زندگی میں عشق نہیں تو کچھ بھی نہیں؟

مگر اب تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ آخر شادی کے متعلق ان نوجوانوں کی تمنائیں اور آرزوئیں کیا ہیں؟ اور آج کل کا نوجوان (جس نے اپنے بزرگوں کو اس قدر حیران کر رکھا ہے) چاہتا کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانے کا ہر ایک تعلیم یافتہ نوجوان شادی سے پہلے یہ پُر لطف خواب دیکھتا ہے کہ اس کی شریکِ رنج و راحت اُس کے برابر یا اس سے کچھ ہی کم تعلیم یافتہ ہے۔ وہ گھر کی ملکہ ہے جس کی سلطنت میں قدم رکھتے ہی اُسے اپنی تکالیف کو بھول جانا چاہیئے یا یہ اُمید رکھنی چاہیئے کہ وہ بھلا دی جائیں گی یہ ملکہ سلف رسپکٹ (Self-respect) کے معنی اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ یہ جانتی ہے کہ خاوند اس کی عزت کرے گا اور وہ خاوند کی (۳۱) کی سوسائٹی اس قدر پُر لطف ہے کہ اپنے خاوند کو باوجود تمام سوسائٹیوں میں شریک ہونے

کے اپنی ہی طرف کھینچتی ہے۔

یہ تو ہر ایک نوجوان کا خواب ہے، جو وہ شادی ہونے سے پہلے دیکھتا ہے، مگر شادی ہونے کے بعد واقعات سامنے آ
اور وہ بدنصیب یہ دیکھتا ہے کہ تعلیم یافتہ ہونا تو درکنار جہالت کے لحاظ سے گھر کی ملکہ اور خادمہ میں سوائے لباس او
صورت کے کوئی فرق نہیں۔ دونوں کے خیالات ایک ہی درجہ پر ہیں اور اسی لئے وہ خادمہ کے شوہر پر رشک کرتا ہے۔ ک
وہاں تو کم سے کم خیالات میں اس قدر عظیم فرق نہیں۔ اگر وہ خود مصیبت کا مارا باہر سے تکالیف کا بوجھ لیکر آتا ہے۔ تو
اسے یہ امید نہ رکھنی چاہیئے کہ یہ بوجھ ہلکا کیا جائے گا۔ بلکہ اس کو اپنی بیوی سے واقعی اور خیالی تکالیف کا طومار سُننے کے
لئے تیار رہنا چاہیئے۔ بیوی کو شریک رنج و راحت کہا جاتا ہے اور اس امر کی تصدیق اس کو اس طرح ہوتی ہے کہ اس ک
رنج دوگنا کردیا جاتا ہے اور راحت آدھی، کیونکہ اس سے بھی عدم شرکت لازم نہیں آتی۔

نہایت ٹھیک کہا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنی گھر کی اور بیوی کی سوسائیٹی کا لطف اُٹھانا مقصود ہے تو اپنے خیالات،
اپنی لیاقت، اور اپنی تعلیم کو ڈیوڑھی پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر میں نے یہ اعتراض سُنا ہے کہ ہمارے بزرگ بھی تو آخر انہیں
خیالات اور اسی قسم کی عورتوں سے بیاہے جاتے تھے۔ وہ شادی سے کیوں اس قدر متنفر نہ تھے؟ وہ کیوں اپنی بیویوں
سے محبت اور حد درجہ کی محبت کرتے تھے؟ ان کی بیویاں بھی ان کے برابر تعلیم یافتہ ہرگز نہ ہوتی تھیں۔ اس پر بھی وہ لوگ
ازدواج سے اجتناب نہیں کرتے تھے۔ نئی روشنی کا نوجوان اس کے جواب میں یہ کہتا ہے (اور میرے خیال میں ٹھیک کہتا
ہے) کہ آج کل کی اور گذشتہ زمانہ کی عورتوں کی حالت تو بالکل یکساں ہے مگر مردوں کی حالت میں بڑا فرق ہوگیا ہے۔
اُن کے خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی پیدا ہوگئی ہے اور اسی تغیر خیالات سے یہ سارا فساد پیدا ہوگیا ہے۔ گذشتہ
زمانہ کے مرد خود تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ لیکن اپنی بیویوں سے تعلیم یافتہ ہونے کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ آج کل کا نوجوان
اپنی بیوی کو اسی دماغی اور علمی سطح پر دیکھنا چاہتا ہے جس پر کہ وہ خود ہے۔ پُرانے زمانہ کا نوجوان عمدہ متاہل زندگی کے یہ
معنی نہیں سمجھتا تھا کہ اپنی بیوی سے ہر دقیق معاملہ میں مشورہ اور اس کی رائے کو غور سے سُننے۔ آج کل کا نوجوان آرزومند
ہے کہ اسے ایسی صائب الرائے بیوی ملے جو اس کی مشیر ہو۔ پہلے عورتوں کے فرائض بچے پالنے اور کھانا پکانے سے زیادہ
نہ سمجھے جاتے تھے۔ اب ان سے بہتر اور اعلیٰ تر فرائض کی امید کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں پہلے اگر شوہر کو اپنی بیوی سے
زیادہ خوشی حاصل نہیں ہوتی تھی تو شوہر کے لئے عقدِ ثانی کا دروازہ کھلا ہوتا تھا۔ آج کل کا نوجوان اگر گناہ نہیں۔ تو
سب سے بڑھ کر ظلم اسے سمجھتا ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دُوسری عورت سے تعلقات زن و شو قائم کئے جائیں۔ اس
زمانہ کے نوجوانوں پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ یورپ کے طرز کی کورٹ شپ کو اپنی سوسائیٹی میں داخل کرنا چاہتے
ہیں۔ شاید یہ الزام صحیح ہو۔ لیکن میرے خیال میں وہ جانتے ہیں کہ کورٹ شپ اور انتخاب کا طریقہ یورپ کی شادیوں اور
نکاحوں کو اتنا عمدہ نہیں کرتا جتنا مرد اور عورت کا ہم خیال ہونا۔ حُسن سے بہیمی عشق پیدا ہوسکتا ہے لیکن وہ محبت جو عمر
بھر قائم رہتی ہے اور جو امتداد زمانہ سے بجائے تنزلِ کے ترقی کرتی جاتی ہے۔ صرف اتحاد خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔
انگلستان کے مشہور ناول نویس ڈکنز نے اپنے مشہور ناول ''ڈیوڈ کاپرفیلڈ'' میں اس امر کو نہایت خوبی سے دکھایا ہے۔

ناظرین یہ خیال کریں گے کہ یہ کل مضمون شادیوں سے اتنا متعلق نہیں ہے جتنا تعلیم نسواں سے۔ مگر میں یہ عرض کروں گا کہ یہ ایک اتفاق ہے کہ تعلیم یافتہ نسواں سے وہ اصلاح ہو سکتی ہے، جسے آج کل کے نوجوان چاہتے ہیں۔ ورنہ اس مضمون کو تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نئے تعلیم یافتہ اپنی بیویوں کو اپنا ہم خیال کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی دو ترکیبیں ہیں۔ ایک تو یہی کہ عورتوں کو انہیں کی طرح تعلیم دی جائے اور وہ اس درجہ پر پہنچا دی جائیں جس پر کہ آج کل کے مرد ہیں۔ یا دوسری ترکیب یہ ہے کہ مردوں سے تعلیم چھین لی جائے اور وہ اس درجہ پر لا ڈالے جائیں جس پر کہ اس وقت عورتیں ہیں۔ کیونکہ اتحاد خیالات انہیں دو ترکیبوں سے ممکن ہے۔

چند اور باتیں ہیں جن کی وجہ سے بعض نوجوان شادی کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ جب تک مرد اس قابل نہ ہو کہ وہ بیوی اور بچوں کا خرچ اس طرح اُٹھا سکے کہ انہیں معقول آرام ملے اور بچوں کو اعلے درجہ کی تعلیم ہو سکے۔ اس وقت تک اسے شادی کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

بعض اس وقت تک شادی کرنا گناہ سمجھتے ہیں، جب تک کہ انہیں کسی سے عشق نہ ہو، اور وہ عشق دوسری جانب سے قبول بھی کیا جائے۔ اُن کے لئے بے پردگی کی ضرورت ہے جو ایک علیحدہ بحث ہے۔

لیکن اصلی اور سب سے عام اور میرے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ ہمدردی خیال جو نوجوانوں کو ازدواج کی طرف بخوشی مائل ہونے سے روکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کی سوسائیٹیوں میں تباین خیالات نہایت عظیم ہے۔

آخر میں پھر اس بات پر خیال رجوع کرانا چاہتا ہوں کہ موجودہ حالت کی طرف سے بے پروائی نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر اب تک نوجوان والدین کا کہنا مان لیتے ہیں تو یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ ہمیشہ وہ ایسا کرتے رہیں گے۔ سوشیل خطرہ کی طرف سے آنکھ بند کر لینے سے ضرور بُرے نتائج پیدا ہوں گے۔ سوسائٹی کو اچانک ایسا صدمہ پہنچے گا کہ اس سے سنبھلنا مشکل ہو گا۔ اگر یہی حالت قائم رہی تو نوجوانوں کی سوشیل بغاوت یقینی ہے۔ ادنیٰ درجہ کی مسلمان لڑکیاں بمقابلہ شرفاء کے زیادہ تعلیم پا رہی ہیں اور کس کو معلوم کہ شریف اور نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دماغ میں کیا سما جائے۔ اس کے علاج کے دو طریقے بیان کر چکا ہوں۔ لڑکیوں کو تعلیم نہ دینا، یا لڑکوں کو تعلیم دینا۔ یہ ہمارے بزرگوں کے ہاتھ میں ہے کہ جس طریقہ کو چاہیں اختیار کریں۔

معارف۔ جلد ۱۔ نمبر (۱۱)

یکم مئی سنہ ۱۸۹۹ء

مولانا حالی کی شاعری پر
مولوی محبوب الرحمٰن صاحب کی تنقید

میری نظر سے یہ تنقید ابھی گذری اور مجھے بہت حیرت ہوئی۔ اس لئے نہیں کہ تنقید کو میں برا سمجھتا ہوں یا یہ کہ مولانا حالی کی شاعری اعتراض کی پہنچ سے بالا تر ہے۔ مجھے محبوب الرحمٰن صاحب کلیمؔ کے نقطۂ نظر پر تعجب ہوا۔ وہ حالی کے ہر شعر کو عامیانہ معنوں میں لینا چاہتے ہیں اور اکثر شعروں میں پہلوئے ذم نکلتا دیکھتے ہیں۔

نہ یہ موقع ہے، نہ مجھ میں اس کی قابلیت ہے کہ حالی کے کلام پر ایک غائر نظر ڈالوں۔ میں صرف اتنی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن اشعار میں سے کلیمؔ صاحب کے خیال میں پہلوئے ذم پیدا ہوتا ہے انہیں میں نے بھی پڑھا تھا۔ لیکن اس وقت چونکہ کلیم صاحب کی شرح میرے پاس نہ تھی۔ میں یہ خلاف تہذیب معنی ان سے نہ نکال سکا، جو کلیم صاحب نے ایسی وضاحت سے بیان کئے ہیں۔ اُردو اور اُردو، کیا، ہر زبان میں گری ہوئی سوسائیٹی میں سینکڑوں ہزاروں لفظ ضلع جگت کے طور پر اور معمولی معنوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان معنوں کا خیال کیا جائے تو یہ الفاظ معقول لوگوں میں اور عورتوں میں متروک ہی ہو جائیں۔ یعنی زبان کے آدھے اور نہایت ضروری الفاظ چھوڑ دئے جائیں ۔ آپ صراحت چاہتے ہیں ؟ میں افسوس کہ تحریراً تصریح نہیں کر سکتا .... مصادر میں کون سا مصدر ہے جو پہلوئے ذم نہیں رکھتا ؟

کلیم صاحب بات بات کے لئے اساتذہ کے کلام سے سند مانگتے ہیں۔ وہ مانگا کریں اور حالی نہ دے سکیں، لیکن حالی کی نظم کو پڑھنے والے نہ سند ملنے پر ان لفظوں کو اپنی جگہ سے نہ اُٹھانے دیں گے کیونکہ ان میں وہ جامعیت ہوتی ہے کہ ایک ایک لفظ سے خیالات کی ایک ایک دنیا دماغ سے گذر جاتی ہے ؎

تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ
شوہر ہوں اس میں یا پدر یا ہوں برادر یا پسر

اس شعر پر کلیمؔ صاحب معترض ہیں کہ "جن معنی میں لفظ خریدار اُردو نظم و نثر میں استعمال کیا جاتا ہے اس کے مطابق شوہر تو عورت کا خریدار کہا جا سکتا ہے، لیکن پسر، پدر اور برادر کو عورت کا خریدار کہنا بالکل غلط (!) ہے" کیوں، اس لئے کہ "سلف سے آج تک کسی نے یہ لفظ اس معنی میں استعمال نہیں کیا!"

سلف سے آج تک اس بحث پر نہ کچھ لکھنے والے، نہ غور کرنے والے، نہ ان مضامین کو سمجھنے والے شعراء، بے شک ان معنوں میں اس لفظ کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ تو شوہر کے لئے بھی خریدار نہیں کہتے۔ وہاں تو صرف غیر مشروع عاشق خریدار ہو سکتا تھا۔ غور کیجئے اور دیکھئے کہ شوہر، پدر، برادر اور پسر سے بڑھ کر کون ان کا خریدار، عاشق ہو سکتا ہے؟

مولانا حالی سے ان کے مداح کوئی سند کسی لفظ کے لئے نہیں مانگتے، وہ ان سے خیالات مانگتے ہیں، وہ فلسفیانہ خیالات اور ساتھ ہی وہ انتہا سے زیادہ پُراثر خیالات جو دل کو گرماتے ہیں، فرماتے ہیں، اور یہی شاعری کا مقصود ہے۔ اور ملکوں میں شاعر نئے لفظ، نئے فقرے گھڑتا ہے تو ان کی تعریف ہوتی ہے، یہاں مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔

کلیم صاحب نے چونکہ ایمیجنیشن کا لفظ استعمال کیا ہے، اس لئے مجھے امید ہے کہ مجھے اس کے مقابلے میں ایک انگریزی لفظ کے استعمال کی اجازت دی جائے گی۔

حالی کے کلام میں جہاں تک میں اسے سمجھ سکا ہوں، ایمیجنیشن بہت ہے، ہاں امیجری نہیں اور امیجری کا درجہ ایمیجنیشن سے بہت گھٹا ہوا ہے۔ میں صرف ان اشعار سے جن پر کلیم صاحب کے اعتراض وارد ہوئے ہیں، دو ایک انتخاب کرتا ہوں اور دکھانا چاہتا ہوں کہ خاص وہ شعر جو ان میں اس قدر کھٹکتے ہیں، میرے نزدیک شاعری سے بھرے ہوئے ہیں ؎

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دُنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں، قوموں کی عزت تم سے ہے

کلیم صاحب اس شعر سے اس لئے ناراض ہیں کہ "اے ماؤ، بہنو، بیٹیو" کی جگہ "اے عورتو یا اے خاتونو" کیوں نہیں کہا گیا، اور اگر "ماؤ، بہنو، بیٹیو" ہی کہا تھا تو بیویوں کو کیوں چھوڑ دیا؟ اور "ملکوں کی بستی ہونے کا شرف عورتوں ہی کو کیوں بخشا گیا، جب کہ مرد اور عورت اس میں یکساں شریک ہیں"۔ بس سے معلوم ہو گیا کہ ان کا اور ہمارا خیال دو علیحدہ علیحدہ راہوں پر جا رہا ہے۔

"اے عورتو، اے خاتونو" سے زیادہ بے ہنگم، ناشاعرانہ اصلاح نہیں ہو سکتی۔ "اے ماؤ، بہنو، بیٹیو" سے ان پُرشفقت تعلقات کا ظاہر کرنا مقصود تھا جن میں عورت اس دُنیا میں جلوہ گر ہوئی۔ بے شک بیوی کا لفظ اس میں اور شامل کر لیا جاتا تو تعلقات کی فہرست مکمل ہوتی اور زیادہ شیریں۔ لیکن اس کے نہ آسکنے پر "اے عورتو" کہہ کے مخاطب کرنا تخیل کے گلے پر چھری پھیرنا ہے۔

ماں، بہن، بیٹی سے بڑھ کر اور کون سے علوی لباس میں عورت ظاہر ہوئی ہے؟ بیوی پن، عورت کو بہت شیریں، بہت دلکش بنا دیتا ہے، لیکن جب آپ اسے اس نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اس میں وہ رقت، وہ روحانیت نہیں ہوتی جو اس کے ماں پن، بہن پن اور بیٹی پن میں ہوتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ حالی نے جب عورتوں کو

مخاطب کیا تو بیوی کے کلمے کو چھوڑ دیا۔ وہ آگے چل کے عورت کی اس صفت، اس اہم اور دل کش صفت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے، لیکن ابتدا میں وہ ماں، بہن، بیٹی کہلانے والی تین آسمانی دیویوں کے ہی نام سے ہی اپنا بھجن شروع کرتا ہے۔ "ملکوں کی بستی ہو تمہیں" پر بھی کلیم صاحب کو غور کر کے اعتراض کرنا چاہیئے تھا۔ مرد و عورت اس میں یکساں نہیں ہیں، جیسا کہ وہ غلطی سے خیال کرتے ہیں۔

ملکوں کی بستی سے کثرت نفوس مراد نہیں۔ اس میں بے شک مرد اور عورت برابر شریک ہیں، اس سے شاعر کی مراد دُنیا کی رونق ہے، بستی بمقابلہ ویرانہ ہے، جہاں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

ایک مغربی شاعر نے کہا ہے "دُنیا میں کانٹے اور پتھر ہی تھے، کہ عورت مسکرائی اور یہ خارستان گلستاں ہو گیا، کانٹے پھول بن گئے"۔ یہ خیال اس فقرے میں چھُپا ہوُا ہے۔

نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو

ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے

اس شعر کے متعلق جو معترض صاحب نے ارشاد فرمایا ہے، وہ مختصراً یہ ہے کہ "اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر بیویوں کی وجہ سے پاکباز رہتے ہیں تو اس کا اظہار خلاف تہذیب ہے، اور کوئی عورتوں سے یہ نہیں کہتا کہ مرد تمہاری وجہ سے بدکاری سے بچتے ہیں"۔

جواب یہ ہے کہ اس شعر کا یہ مطلب ہی نہیں جو کلیم صاحب سمجھے ہیں۔ "دین کی پاسبان" وہ اس طرح ہیں کہ عورتیں زیادہ راسخ الاعتقاد، زیادہ پاکباز ہوتی ہیں۔ ہر جگہ اور ہر ملک میں وہ اپنے مذہب پر سختی سے قائم رہتی ہیں اور اس طرح دین کی نگہبانی کرتی ہیں۔ وہ زیادہ شفیق، زیادہ رحیم اور زیادہ مخیر ہوتی ہیں۔

مَیں کوئی مباحثہ کرنے نہیں بیٹھا، نہ اس کا جواب الجواب چاہتا ہوُں۔ ان سطور سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ مَیں اشعار سے یہ معنی سمجھا اور ان معنوں میں وہ سراسر خوبیوں سے پُر معلوم ہوتے ہیں۔

اُردوئے معلیٰ

تاریخ ؟

اولڈبوائے ٹائپ میں

ایک وطن سے دُور دراز مقام میں یعنی قسطنطنیہ میں جہاں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وطن یاد نہیں آتا، مگر جہاں میں رات دن وطن
ں یاد میں اشکباری نہیں کرتا اور مَیں کیا کوئی بھی نہ کرے گا۔ کل مارچ کا اولڈبوائے ملا۔ سیر و سیاحت چھوڑ چھاڑ کے اوّل اسے
زا ابتدا تا انتہا ختم کیا۔ یہاں ایک یونیورسٹی قائم ہوئی ہے، اس کا نام "دار الفنون" ہے مَیں اسے ویسے بھی دیکھنے جاتا مگر اس میں
یرے بغداد کے ایک دوست "فہمی بک" پروفیسر ہیں، ان کی وجہ سے اکثر جانا ہوتا ہے۔ کل جو گیا تو اولڈ بوائے کو بھی لیتا گیا۔
ور وہاں پروفیسروں کو دکھایا، اپنے کالج کی تعریفیں کیں اور سرورق کی تصویر کے متعلق کہا کہ یہ کالج کے ایک نہایت چھوٹے
لکڑے کا نقشہ ہے۔ قدرتی طور پر ان سب نے نہایت شوق سے دیکھا اور اظہارِ مسرت کیا۔

مگر ذرا پوچھیے تو کہ اعتراض کس بارے میں کیا؟ دو اعتراض تھے اور دونوں میری رائے میں صحیح۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ
الج کو شاندار بنانے کے لئے کم از کم دو منزلہ ہونا چاہیئے۔ وسعت ہی کافی نہیں رفعت کی بھی ضرورت ہے۔ دوسرا اعتراض
پ کے "اولڈبوائے" پر تھا اور یہ اعتراض بالعموم مطبوعات اُردو پر عائد ہوتا ہے۔ مجھ سے کہا کہ آپ ابھی پتھر کے چھاپے
سے آگے نہیں بڑھے! اور یہ بڑا چبھتا ہوا ریمارک تھا۔ فتامل۔ اگر ہمارا یہ دعوےٰ ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔ تو ہمیں
یتھوگراف کو خیرباد کہنا چاہیئے ورنہ آپکی کتابیں دیکھ کر اہلِ اسلام تبسّم زیرلب سے آپکی طرف دیکھیں گے۔

قسطنطنیہ میں حروف نسخ کا ٹائپ ایسا مکمل اور ایسا خوش خط ڈھالا جاتا ہے کہ اس کو دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور
حاصل ہوتا ہے۔ آنکھوں میں نور تو شاید شاعری سمجھی جائے اور ہے بھی، لیکن "جب دل کو سرور حاصل ہوتا ہے" کہتا ہوں تو مَیں
پنے دل کی کیفیت بیان کرتا ہوں۔

یہ وہ ٹائپ نہیں ہے جس میں علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ چھپتا ہے۔ مگر مَیں علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو ٹائپ میں چھپنے کی وجہ سے
قابل ستائش سمجھتا ہوں۔ کاش ہمارے مطابع اس طرف متوجہ ہوں۔ مَیں رائے پیش کرتا ہوں کہ "اولڈبوائے" ٹائپ میں چھپے،
لیکن وہ استنبولی ٹائپ ہو۔

خاکسار

سید سجاد حیدر، از قسطنطنیہ

اولڈبوائے، علی گڈھ

جولائی ۱۹۱۱ء

خطبۂ صدارت

(اجلاس ششم ۔ شعبۂ اُردو ۔ ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ جات متحدہ الہ آباد معہ تتمہ ۔ مارچ ۱۹۳۸ء)

معزز حاضرین!

ہندوستانی اکیڈیمی نے مجھے اس جلسے کا صدر قرار دیکر اپنی توہین کی اور مجھے عزت بخشی۔ اس توہین کے آپ سزاوار ہیں،
عزت کا میں مستحق نہیں!

مجھ کو جب یہ حکم ملا کہ میں آپکے سامنے خطبۂ صدارت کی شکل میں اپنے خیالات ظاہر کروں، تو میں نے سوچا کہ میں کو
خطبہ تو ارشاد نہیں فرما سکتا، جو آپ کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکے۔ یہ تو میرے بس کی بات نہیں! لہذا میں نے دل
کہا۔ یہی مناسب ہے کہ زبان اور ترقی زبان کے متعلق تُو جو کچھ سوچتا رہا ہے اور گذشتہ ایک چوتھائی صدی کے عرصہ دراز میں
کی ادبی و لسانی تحریکات نے تجھ پر جو اثر ڈالا ہے، اُسے اپنی عامیانہ زبان میں بیان کر دے!

ہندوستانی اکیڈیمی اس صوبے کی دو زبانوں کی رقابتوں اور کشمکشوں کو دُور کرنے کے لئے عالم وجود میں آئی تھی، مگر
اس رقابت اور کشمکش میں کوئی کمی آئی؟ میں سمجھتا ہوں کہ نہیں! دو سال قبل ہی کی بات ہے کہ دو زبردست ہستیوں نے اس
میں دو متضاد خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔

مولانا عبدالحق نے فرمایا تھا:۔ "میں اس وقت اس کے (یعنی ہندوستانی اکیڈیمی کے) کاموں پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں
لیکن اکیڈیمی کے کارفرماؤں کی خدمت میں اس قدر عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جب اکیڈیمی نے ہندوستانی کا لقب اختیار
ہے اور ہندوستانی کے رواج کا بیڑہ اُٹھایا ہے تو کیوں اب تک کچھ کتابیں ایسی تالیف نہیں کرائی گئیں اور کوئی رسالہ ایسا
شائع کیا گیا جو ہندوستانی زبان میں ہو اور بجنسہ بغیر کسی تغیرو تبدل کے دونوں رسم الخط میں لکھا جا سکے ...... اس سے بھی
مفید کام جو اکیڈیمی کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایسی زبان میں ریڈریں تیار کرائے جو دونوں رسم الخط میں لکھی جائیں اور مدارس
رائج کی جائیں۔ اس سے وہ دو رنگی جو اس وقت اس صوبے کے مدارس میں پائی جاتی ہے، خود بخود اُٹھ جائے گی...... ہند
کے رواج کا سب سے بڑا ذریعہ یہ مدارس ہو سکتے ہیں۔ جب زبان ایک ہو جائے گی تو رسم خط کی نزاع آپ سے آپ اُٹھ جا
ابھی زبان ہی ایک نہیں، رسم خط کی بحث کیسی"!

اُسی دن اور اُسی مقام پر ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا نے بہ حیثیت صدر شعبۂ ہندی یہ کہ فرمایا:
"جب تک ہم علمی حالت میں ہیں اختلاف ماننا ہی پڑے گا اور اسی کے مطابق کام بھی لانا ہوگا ...... سرکاری احکام

تی ان صوبوں میں ہندی اور اُردو کو متحد کرنا ٹکسٹ بک کمیٹی کا سب سے بڑا فرض تھا، اُس وقت سے متحد کرنے کی کوشش د اور رعایتی طور سے دیکھتا اور بھگتتا رہا۔ اس تجربے سے یہ اصول میرے دل میں جاگزیں ہو گیا کہ معمولی بول چال میں "مَیں کھاتا ہوں، مَیں جاتا ہوں" وغیرہ کے استعمال تو ایک قسم کے ہیں اور ایک قسم کے ہوتے رہیں گے لیکن مضمون نگاری اور تصنیف کے عمل میں نیت قطعاً ناممکن ہے، غیر ممکن ہی نہیں بلکہ بربادکن ہے اور ان زبانوں کا اتحاد اُسی وقت ممکن ہو گا جب پانی کے کل دھارے مطلق کے بحرِ بے پایاں میں محو ہو جائیں گے۔ جس آدمی کے دل میں یہ اُصول جاگزیں ہو گیا تھا، اُسے دونوں زبانوں کے متحد کرنے کے ادارے کو دیکھ کر تعجب ہونے لگا، اپنے اصول پر شُبہ ہونے لگا ...... لیکن کچھ ہی دنوں مہینے سے کچھ کم ہیں یہ کھلا ہندی اور اُردو کے دونوں دھاروں کا پریاگ پر سنگم نہیں ہو رہا ہے اور دونوں دھارے ساتھ ساتھ مگر الگ الگ چل رہے اور چلائے جا رہے ہیں۔ دونوں زبانوں میں علیحدہ علیحدہ کتابیں تیار ہو رہی ہیں اور آخر میں اس ادارے کے آرگن تماہی لے بھی الگ الگ نکل رہے ہیں۔"

آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں :- "آج ہندوستانی اکیڈیمی کے اندر اُردو اور ہندی کے الگ الگ اجلاسوں کو دیکھ کر اور اس اپنے اصولوں کی تائید پا کر مَیں کتنا مسرور ہوں، مَیں کہہ نہیں سکتا! جیسا ہوا ہے ویسا ہی ہونا بھی چاہئے تھا! یہی مناسب اور یہی مناسب ہے"!

آپ نے دیکھا اور آپ نے غور فرمایا! ان دونوں بزرگ ہستیوں کے ارشادات میں کیا فرق ہے؟ میرے نزدیک فرق ظاہر ہے۔ ایک آرزو بیان کر رہا ہے، دوسرا حقیقت جسے وہ اپنی آرزو کے ہم عنان پاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو اور ہندی کی شاہرہیں ں علیحدہ علیحدہ ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا فرماتے ہیں، یہی مناسب تھا اور یہی مناسب ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق شاہراہوں کے علیحدہ دہ ہونے سے انکاری ہے نہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ دونوں زبانوں کو ایک راستے پر ڈال دینا چاہیئے۔

ان دو شاہراہوں کو دیکھ کر ہمارے قابلِ تعظیم اور اتحاد پسند صدر ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے یاس انگیز خیال ظاہر کیا کہ اگر یہی و نہار ہیں تو وہ دن دُور نہیں کہ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے کے لئے ہندو مسلمانوں کو ایک ایک ترجمان ساتھ رکھنا پڑے گا۔ اتحاد کے امکان کو ان الفاظ میں بیان کیا جائے کہ ان زبانوں کا اتحاد اُسی وقت ممکن ہو گا جب پانی کے کل دھارے وجودِ مطلق بحرِ بے پایاں میں محو ہو جائیں گے تو کوئی تعجب نہیں کہ اُردو کے انتہا پسند بھی یہ کہیں کہ اُردو کو آسان کرنے کی کوشش بے سود بے د ہی نہیں مُضر ہے۔ اُسے اگر محض بازار کی زبان سے اُوپر کرنا ہے تو اُسے فارسی و عربی کے اُن الفاظ سے جو بلند خیالات کو ظاہر یں مالامال کرنا ہو گا۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ یہ قطعاً ناممکن ہے۔ کیا آپ اُردو کو ہندی سے یا ہندی کو اُردو سے بالکل بے نیاز کر دیں د تک کہ آپ ایک ملک میں رہتے ہیں، ایک دوسرے کے ہمسائے اور پڑوسی ہیں؛ یہ ممکن نہیں کہ ایک دوسرے کی معاشرت، ایک دوسرے زبان یا بالفاظ دیگر ایک دوسرے کی رفتار و گفتار سے متاثر نہ ہوں۔ جب یہاں پہنچ کر مسلمانوں کا لباس و خوراک، طرز بود و ماند یہاں تک ں مراسم میں مقامی رنگ آ گیا، مقامی اثرات کی جھلک دکھائی دینے لگی، تو زبان تو بہت جلد اثر پذیر ہوتی ہے اور ہندوؤں نے بھی، تک بلکہ اس سے بھی زیادہ مسلمانوں کا اثر قبول کیا اور یہ اثر ایک دوسرے پر پڑتا رہے گا جب تک کہ آپ دونوں قوموں کے درمیان دیوارِ آہن کھڑی نہ کر دیں۔

اب تو دونوں ایک جگہ رہتے سہتے ہیں۔ جب مسلمان ہندوستان میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے اُس زمانے میں بھی ایک دوسرے کی زبان اور لٹریچر سے ایسے بیگانہ نہ تھے جیساکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

ایک پُر از معلومات و پُر از تحقیقات مقالے میں جو پنڈت برج موہن دتاتریہ نے علی گڈھ میں پڑھا تھا، یہ ثابت کیا تھا کہ فارسی کا پڑھنا ہندوؤں میں مسلمانوں کے یہاں آنے سے پہلے جاری تھا، گو عام نہ ہو۔ اور ہندوستان کے ہندو راجہ قبل اس کے کہ مسلمان حملہ آور ہوئے، کابل اور وسط ایشیا کی اسلامی سلطنتوں سے، فارسی زبان میں خط و کتابت کرتے تھے اور ہندو دربار کے ہندو منشی اُن مراسلات کو فارسی میں لکھتے تھے۔ ہندو عرب کے تعلقات میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے بتایا ہے کہ جنوبی ہند میں عرب تاجروں اور عرب جہاز رانوں کی بدولت مسلمانوں اور وہاں کے ہندوؤں میں معاشرتی اور تجارتی تعلقات مسلمانوں کے ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہونے سے قبل قائم ہو چکے تھے۔ اسی طرح فارسی زبان کا "بُت" اصل میں "بدھ" ہے یعنی حضرت گوتم بدھ کا مجسمہ اور یہ تو آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ نیپال جو کبھی مسلمانوں کے زیرِ نگیں نہیں رہا۔ وہاں بھی شمشیر جنگ رانا، ببر جنگ رانا، تیغ بہادر رانا جیسے نام بتا رہے ہیں کہ مسلمانوں کی زبان کا اثر، اُن کے سیاسی اثر کے حدود سے باہر پہنچ گیا تھا۔

ایسی حالت میں مَیں نہیں مان سکتا کہ اردو جو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں اگرچہ اُس میں فارسی اثر زیادہ ہے، وہ محض مسلمانوں تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ یا ہندی کو مسلمان نہ سمجھ سکیں گے، آخر اب بھی تو ہندی ٹھمریوں اور گانوں کو مسلمان سنتے ہیں اور اُن سے لُطف اُٹھاتے ہیں۔ اُردو کا اثر مسلمانوں اور ہندوؤں پر کم و بیش ہوگا۔ ہندوؤں پر کم، مسلمانوں پر زیادہ۔ اسی طرح ہندی کا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں پر ہوتا رہے گا۔ مسلمانوں پر کم، ہندوؤں پر زیادہ!

مگر جب عمداً یہ کوشش کی جائے کہ دونوں زبانیں اس قدر علیحدہ اور ایک دوسرے سے دُور ہو جائیں کہ اُن میں مشارکت کا امکان ہی باقی نہ رہے، رسم الخط تو علیحدہ ہے ہی، الفاظ بھی ۹۹ فی صدی علیحدہ ہوں تو پھر اگر آئندہ کی طرف سے ناامید ہو جائے تو کوئی جائے تعجب نہیں۔

اُردو سے اُن فارسی الفاظ کے نکالنے کی کوشش جو اُس کے جسم اور جان میں پیوست ہو گئے ہیں، ناخن کو گوشت سے جُدا کرنا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو لکھنؤ کی ہندوستانی کانفرنس میں گزشتہ سال ارشاد فرمایا تھا، کہا تھا کہ اُردو نے جن فارسی الفاظ کو اپنا لیا ہے۔ اُن کو اُنہیں معنوں میں اور ویسے تلفظ اور املا کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے، جو معنوں اور جیسے تلفظ اور املا کے ساتھ اُردو میں وہ رائج ہو گئے ہیں۔ مولانا نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً مراد، امیدوار، شہوت، مشکور، مصالحہ، مثال، اسی طرح سنسکرت کے الفاظ جس طرح اُردو میں یا ہندوستانی میں رائج ہیں، اُن کو چھوڑ کر، اصل سنسکرت کے تلفظ کے ساتھ اُن کو بولنے کی کوشش کو بھی بالکل بجا طور پر ادبی پاپ قرار دیا ہے۔

اُن فارسی الفاظ سے جنہیں ہم فارسی سمجھ کر فارسی میں استعمال کرتے ہیں اہلِ ایران اُن پر چونکتے ہیں اور ہماری ہنسی اُڑاتے ہیں یعنی وہ الفاظ فارسی نہیں رہے، ہم نے اُردو میں اُن کو دوسرے معنی دیدیے ہیں اور اب وہ لفظ بالکل ہمارے ہو گئے ہیں۔ آپ اُن کو اپنی زبان سے نکال دیجیے۔ آپ کے ہاں سے نکل کر وہ بالکل نکھرے ہو جائیں گے۔ کیونکہ فارسی یا عربی ان معنوں میں اُنہیں قبول نہ کرے گی۔

مثلاً اُن دو لفظوں کو لیجئے جن کو فارسی میں استعمال کرنے میں جب کہ وہ ایران میں سفر کرتے ہیں اہلِ ہند ٹھوکر کھاتے ہیں:-

	اصلی معنی	اُردو میں
تکلیف	فرض، ذمہ داری	زحمت
خفا	گلا گھونٹنا	ناراض ہونا

یہ نہ خیال کیجئے کہ ہم نے الفاظ کے معنی بدل دیئے - ایرانیوں نے بھی ایسا کیا ہے - مثلاً "ناخوشی" ہم اصلی معنی "ناراضی" میں استعمال کرتے ہیں - ایرانیوں نے ناخوشی کو بیماری کے معنی دیدیئے ہیں -

اس سلسلے میں ایک لطیفہ عرض کروں - بغداد میں ایک نوجوان ایرانی جو ہندوستان میں رہ چکے تھے مجھ سے تعریضاً کہنے لگے کہ ہندوستانیوں کے کیرکٹر کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ تکلیف یعنی فرض اور ذمہ داری کو زحمت سمجھتے ہیں اور اُس سے گریز کرتے ہیں! میں نے کہا کہ "ڈیوٹی" کم ایسا ہوتا ہے کہ آرام کی چیز ہو لیکن اگر کوئی ڈیوٹی کو آرام کی چیز نہ کہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ وہ اُس سے گریز کرتا ہے - برخلاف اس کے ایرانیوں کے خصائص ملّی اور اُن کی ہمت و بہادری کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ "تیغ" "تلوار" کے مفہوم سے گھٹ کے اور اُتر کے "اُسترے" کے معنی میں رہ گیا ہے! ایرانی "اُسترے" کو شمشیر کے برابر خطرناک ہتھیار سمجھتے ہیں -

ایک ہی لفظ اُردو میں ایک معنی دیتا ہے اور دوسری زبان میں بالکل دوسرے معنی! اس کی ایک پُرلطف مثال آپکی خدمت میں پیش کرتا ہوں - "ظریف و متین" دو لفظ ہیں - "ظریف" ہم اُس شخص کے لیئے استعمال کرتے ہیں جس کی طبیعت میں مذاق و خوش طبعی ہو، "متین" ہم سنجیدہ آدمی کو کہتے ہیں - لیکن ایک ترکی اخبار میں ایک جوتا بیچنے والے کے اشتہارات میں نے دیکھے جو کہتا ہے کہ اُس کے جوتے نہایت "ظریف و متین" ہیں! کیا سمجھے آپ؟ بیک وقت یہ جوتے آپ سے مذاق بھی کریں گے اور نہایت متانت سے بھی پیش آئیں گے، لیکن اشتہار دینے والے کا یہ مطلب نہیں، وہ تو یہ اعلان کر رہا ہے کہ اُس کے جوتے "ظریف" یعنی خوبصورت بھی ہیں اور "متین" یعنی مضبوط بھی! ایک اور لفظ کا قصہ عرض کروں، جس میں کوئی مذاق کا پہلو نہیں - مگر جس نے ایک موقع پر ایک عجوزی کی کیفیت مجھ پر طاری کردی - "عرصے" کا لفظ ہماری زبان میں "مدتِ وقت" کے لئے مستعمل ہے: "آپ سے بہت عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی" - استنبول میں ایک قطعۂ زمین پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا ہوا تھا "یہ عرصہ برائے فروخت ہے" - یہ پڑھتے ہی مجھے داغ کا شعر یاد آگیا اور میں نے مزے لے لے کر اُسی مقام پر اُسے پڑھا:-

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو
اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

یہ جو عام شکایت کی جاتی ہے کہ آج کل اُردو لکھنے والے جان جان کر غیر مانوس اور سخت عربی، فارسی کے الفاظ اپنی تحریروں میں ٹھونستے ہیں اور روزمرہ کے سادہ الفاظ کے استعمال کو اپنے خلافِ شان سمجھتے ہیں، یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر میرا خیال ہے کہ ایک زندہ اور ترقی کرنے والی زبان ہمیشہ نئے نئے لفظ اپنے میں جذب کرتی رہتی ہے، اس کو قطعاً روکنے کی کوشش کرنا مضر ہوگا - اب یہ مذاقِ سلیم اور ہندوستانی اکیڈیمی کے احکامات پر موقوف ہے کہ لکھنے والا کون سا لفظ اختیار

کرے اور اُن کو رواج دینے کی کوشش کرے۔ نان کوآپریشن کے زمانے میں اخبارات اور تقریروں میں "عدم تعاون" اور "مقاومتِ مجہول"، پڑھنے اور سُننے میں آتے تھے۔ مقاومتِ مجہول لاحول ولا قوۃ! سوائے اس کے کہ Passive Resistance کا ایک بھونڈا سا ترجمہ کر دیا۔ مکھی کی جگہ مکھی مار دی۔ مگر سُننے والا خاک نہیں سمجھا کہ یہ مقاومتِ مجہول کیا بلا ہے! میں اب بھی کہتا ہوں کہ اگر ذہن میں (Passive Resistance) کے الفاظ پیشتر سے نہ ہوں تو کوئی عربی دان بھی اس کے وہ معنی نہیں بتا سکتا جس کے لئے مقاومتِ مجہول گھڑا گیا۔ بہرحال مقاومتِ مجہول اپنی موت مرگیا، مگر عدم تعاون زندہ و قائم ہے۔ اسی طرح مندوب، مبعوث، نمائندہ تین لفظ نکلے۔ یہ اُردو میں (delegate یا Representative) کے معنوں میں نئے لفظ تھے۔ مندوب و مبعوث کا استعمال اس قدر کم ہے کہ بمنزلہ نہ ہونے کے ہے۔ مگر نمائندہ چل پڑا ہے۔ ایکٹنگ کی جگہ "اداکاری" نے لی ہے اور یہ اچھا لفظ ہے۔

نیز کہ اچھے خاصے لفظ چھوڑ کر، نئے لفظ محض اس لئے کہ وہ شاندار ہیں، اختیار کئے جارہے ہیں۔ "ناظرین" قریب قریب معلوم ہے۔ اُس کی جگہ "قارئینِ کرام" نے لی ہے۔ ہیرو کو چھوڑ کر "بطل" کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی مگر شکر ہے کہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی!

میں نے ایک اصول قائم کیا ہے، یا یوں کہئے کہ یہ میرا ایک نظریہ ہے۔ عربی کے جو الفاظ فارسی کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں اُردو اُنھیں ہضم کرلیتی ہے مگر جو الفاظ براہِ راست عربی سے لئے جاتے ہیں، اُردو کا معدہ اُنھیں قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ فارسی بھی سعدی و حافظ کی نرم و شیریں فارسی، نہ کہ آج کل کی کرخت ایرانی۔ اب تو فارسی کے لئے عربی کے لفظ کا استعمال بھی ممنوع ہے۔ چنانچہ "بطل"، "فکاہات"، "شذرات" ہضم نہ ہوسکے۔ اس بات پر غور کرنا بھی دلچسپ ہے کہ نیپال میں شمشیر جنگ، تیغ بہادر، ببر جنگ تو چلا، سیف الملک و ضیغم الدولہ نہ چلا۔

یہ الزام بھی غلط ہے کہ ہندی کے لفظ جان جان کر نکالے جارہے ہیں۔ سماج (بمعنی سوسائٹی)، پرچار، چُناؤ، شانتی، جو پہلے استعمال نہ ہوتے تھے، اب مسلمانوں کی تحریروں میں مِلتے ہیں، بلکہ میں تو کہہ سکتا ہوں کہ ہندو لکھنے والے فارسی کے مروجہ اور زبان زدِ خاص و عام الفاظ کے ساتھ زیادہ عدم تعاون برتتے ہیں۔

اور یہ بات کہ مسلمانوں کی اُردو میں فارسی الفاظ نسبتاً زیادہ ملتے ہیں اور ہندوؤں کی زبان میں سنسکرت کے، قدرتی بات ہے۔ جس لٹریچر اور زبان سے جو شخص زیادہ متاثر ہُوا ہے اُس کی تحریر و تقریر میں اُسکی جھلک پائی جائے گی۔

پارسیوں کی گجراتی، ہندوؤں کی گجراتی سے ایک حد تک مختلف ہوتی ہے۔ پارسیوں کی گجراتی میں فارسی اور اردو کے الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔ "جامِ جمشید" جو پارسیوں کا مشہور اخبار ہے اور گجراتی میں شائع ہوتا ہے، اگر آپکے سامنے پڑھا جائے تو آپ اس میں بہت سے الفاظ ایسے پائیں گے جنھیں ہم بولتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ اخبار کا نام ہی فارسی ہے۔ "سانجھ ورتمان" جو ہندوؤں کا کثیر الاشاعت گجراتی زبان کا اخبار ہے اُس میں فارسی اور اُردو کے الفاظ کم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ باوجودیکہ پارسیوں نے گجراتی زبان اختیار کرلی ہے لیکن اُن میں ایک کافی تعداد اب بھی فارسی پڑھتی ہے اور اُس کی تحریر و تقریر میں اُس کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ اسی طرح قاضی "نذرالاسلام"، جو بنگال کے نوجوان شاعروں میں بے حد شہرت و مقبولیت حاصل کر رہا ہے، کہا جاتا ہے کہ اُسکی شاعری میں گل و بلبل،

زلف و کاکل، ساغر و شراب اور اسی قسم کے اور فارسی الفاظ کثرت سے آتے ہیں۔ صرف دیکھنا یہ چاہئے کہ جان بوجھ کر اور تعصب سے تو الفاظ کا استعمال نہیں کیا جا رہا۔ اگر بے ساختہ زبان پر آتا ہے تو ٹھیک ہے۔

یہ کوشش کہ ہندی سے فارسی کے الفاظ یعنی بدیسی الفاظ خارج کر دیئے جائیں تو نیشنلسٹ شراب کے نشے کا نتیجہ ہے۔ ایران اور ترکی کے قوم پرور بھی اسی نشے سے بدمست ہیں۔ فارسی سے عربی الفاظ کو دیس نکالا مل رہا ہے۔ ترکی میں اس کا زور ہے کہ فارسی اور عربی دونوں کو نکال دو! میرا خیال ہے کہ ترکوں اور ایرانیوں کی یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ شروع شروع میں تو میں نے دیکھا کہ ایسی ترکی لکھی جاتی تھی جس کا سمجھنا از بس دشوار تھا مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ پھر وہی معمولی ترکی ہے جس میں فارسی کے لفظ بھی ہیں اور عربی کے بھی۔ ہندی کے اس نیشنلسٹ تحریکِ جدید کا کیا حشر ہوگا۔ اس کے متعلق اس وقت کوئی اندازہ نہیں دگایا جاسکتا مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ شدت، یہ تعصب قائم نہیں رہے گا۔

اس موقع پر خالدہ خانم ادیب کی رائے کا نقل کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ خالدہ خانم اپنے ملک میں بھی سخت قسم کی نیشنلسٹ ہیں اور ہندوستان کی سیاحت کے بعد جو کتاب (Inside India) انھوں نے لکھی ہے اور جو ابھی شائع ہوئی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنکی ہمدردی تمام تر ہندوستان کی نیشنلسٹ تحریک کے ساتھ ہے اور اکثر انھوں نے مسلمانوں کو موردِ الزام قرار دیا ہے۔ اُن کے خیالات یہ ہیں :۔

اول انھوں نے اپنے کسی مسلمان دوست کے خط کا اقتباس دیا ہے جس میں اُس نے لکھا تھا کہ :۔

"آپکے جانے کے بعد نیشنلزم نے زبان کے معاملے میں مسلمانوں کو سخت ضرب لگائی ہے۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ شمالی ہندوستان کی تمام وہ زبانیں جو بولی جاتی ہیں اپنی ترقی و ارتقاء کے لئے مسلمانوں کی حمایت کی مرہونِ احسان ہیں لیکن نیشنلزم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمام بدیسی الفاظ قومی زبان سے خارج کر دیئے جائیں اور اسی قومی زبان کا نام "ہندوستانی" قرار دیا جائے ـــ اور نیشنلزم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ نہ صرف ٹکنیکل اصطلاحات کے لئے بلکہ روزمرہ کے الفاظ کے لئے سنسکرت کو منبع و مرجع قرار دیا جائے، وہ سنسکرت جو کبھی ملک میں بولی نہیں گئی!"

اس اقتباس کے بعد خالدہ خانم اپنی رائے دیتی ہیں :۔

"میں اُس ملک کی متبع ہوں جو خالص زبان کا حامی ہے اور اِس بناء پر مجھے ہندوؤں کا طرفدار ہونا چاہیئے تھا، مگر میں اُن کی طرف نہیں ہوں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ خالص زبان میں اُسے سمجھتی ہوں جس میں تحریر کی زبان جہاں تک ہوسکے اُس زبان سے جو بولی جاتی ہے، قریب لائی جائے۔ ٹکنیکل اصطلاحات کے بارے میں میں انٹرنیشنل یعنی بین الممالک اتحاد کی قائل ہوں۔"

آگے چل کر وہ فرماتی ہیں :۔

"ہندو جن الفاظ کو (عربی و فارسی کے الفاظ کو) غیر ملکی قرار دیتے ہیں، وہ غیر ملکی نہیں رہے۔ جن لفظوں کا استعمال ایک ہزار برس سے ہو رہا ہے، اُن کی جڑ کہیں کی ہو، اہلِ ہند اُن سے بمقابلہ غیر مانوس سنسکرت الفاظ کے زیادہ آشنا ہیں۔"

میں اُن کے اصل الفاظ آپ کی اجازت سے پڑھ کر سنا دینا چاہتا ہوں۔

(اس موقعہ پر آپ نے کتاب سے انگریزی عبارت پڑھی جس کا ترجمہ ابھی گزر چکا ہے)

مشترک زبان کا حل میرے نزدیک یہ نہیں کہ ایک ایسی زبان بنائی جائے جو نہ آج کی سخت اُردو ہو اور نہ آج کل کی سخت ہندی، کیونکہ جب ایسی ریڈریں تیار کی جاتی ہیں تو دونوں طرف سے اُن پر اعتراض شروع ہوتے ہیں۔ اُردو والے کہتے ہیں کہ مشترکہ زبان کے پردے میں ہندی کو رواج دیا جا رہا ہے۔ ہندی والے کہتے ہیں کہ یہ تو وہی اُردو رہی۔ میرے نزدیک اس مشکل کا حل یہ ہے کہ ہر طالب علم کو اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے سیکھنے پر مجبور کیا جائے۔ پھر آہستہ آہستہ خود بخود ایک گھلی ملی زبان پیدا ہو جائے گی۔ علی گڈھ یونیورسٹی نے اُردو کے ایم۔اے کے نصاب میں اسی اصول کو مدِّنظر رکھ کر ہندی کا ایک لازمی پرچہ بھی رکھا ہے۔ مجھ سے ایک صاحب نے کہا (میں نہیں جانتا کہ یہ کہاں تک صحیح ہے، کیونکہ وہاں کا نصاب میری نظر سے نہیں گزرا) اور اسی کو نظیر قرار دیکر لکھنؤ کے ہندی کا ایم۔اے کے نصاب میں اُردو کا پرچہ شامل کئے جانے کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا، مگر وہ مسترد کر دیا گیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس غلطی کی تلافی ہونی چاہیئے۔

شاید یہ کہا جائے کہ طالب علم پر کتنی زبانیں سیکھنے کا بار ڈالا جائے گا، اس کا میرے پاس یہ جواب ہے کہ اُردو اور ہندی دو مختلف الاصل زبانیں نہیں ہیں۔ جب جنوبی افریقہ میں ڈچ اور انگریزی اور کینیڈا میں فرنچ اور انگریزی پہلو بہ پہلو چل سکتی ہیں۔ حالانکہ انگریزی اور ڈچ اور فرنچ اور انگریزی دو یا ایک جدا جدا زبانیں ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اُردو و ہندی، جو حقیقت میں ایک ہی زبان ہیں کیوں ساتھ ساتھ نہ چل سکیں گی۔

ہندو مصنفین سے میری درخواست ہے کہ وہ ایسی اُردو لکھیں جیسی میرے دیرینہ محب مکرّم منشی دیا نرائن صاحب نگم، پنڈت کیفی، پنڈت زتشی لکھتے ہیں۔ مسلمان ایسی لکھیں جیسے سید سلیمان صاحب ندوی، مولوی عبدالحق، حسن نظامی، ڈاکٹر ذاکر حسین لکھتے ہیں۔ کاش منشی پریم چند جیسے مصنفین ہم میں پیدا ہوں، جنکی قادرالکلامی اُردو اور ہندی زبانوں میں یکساں تھی اور جنھیں اُردو اور ہندی اپنا سب سے بڑا ادیب شمار کرنے میں مسابقت کر رہی ہیں۔

ایک حد تک یہ مسئلہ فرسودہ ہو گیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جب سے ہندوستانی اکیڈیمی قائم ہوئی ہے اُس کے ہر سالانہ جلسے میں، ہر خطبۂ صدارت میں اس کے متعلق اظہار کیا گیا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو، مسٹر سچیدانند، مولوی عبدالحق صاحب، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا اکیڈیمی میں اور اکیڈیمی کے باہر بطورِ قولِ فیصل کے پنڈت جواہر لال نہرو نہایت قابلیت مگر نہایت ٹھنڈے دل سے اس مسئلے کے ہر پہلو پر نظر ڈال چکے ہیں لیکن مسئلہ اتنا اہم ہے کہ ہمارے مفکرین کی توجہ تمام تر اُسی کی طرف ہے۔ پھر بھی کوئی معقول حل، ایسا حل جسے عام رائے خوشی سے قبول کرے نظر نہیں آتا تو پھر اس گتھی کو سلجھانے کا کیا دعوےٰ کر سکتا ہوں، لیکن اپنی بساط بھر کوشش میں نے بھی کی۔

حضرات! ہندوستانی اکیڈیمی کی علمی اور ادبی خدمات قابلِ تحسین ہیں، اس قلیل عرصے میں اُس نے بہت کچھ کیا ہے لیکن کام کی ابتدا ہی ہے اور اس وقت ہی اگر اپنا پروگرام پورے غور و خوض سے متعین کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

ہماری زبان کے لئے یہ دَورِ دَورِ ترجمہ ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی ہو کہ انجمن ترقی اُردو، ہندوستانی اکیڈیمی ہو کہ کوئی اور جماعت، دوسری زبانوں کے بلند پایہ مصنفین کی کتابوں کے ترجمے سے وہ بے نیاز نہیں۔ یہی نہیں کہ بے نیاز نہیں بلکہ اُن کی کوششوں کے بیشتر حصے کا انحصار عمدہ کتابوں کے ترجمے کرانے یا ایسی تالیفات پر ہو جن کا ماخذ کوئی مستند

کتاب یا مستند مصنف ہے اور یہ طریقۂ عمل صحیح بھی ہے۔ تخلیقی دَور ترجمے کے دَور کے بعد آتا ہے۔ پہلے اپنی زبان کے خزانے اُن جواہرات سے بھر لیجئے جو آپ کو آسانی سے مِل سکتے ہیں۔ پھر نئی کانوں کی تلاش میں نکلئے گا۔ لیکن مَیں دیکھتا ہوں کہ اس پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ سائینس اور فلسفے کی کتابوں کا ہی ترجمہ کیا جائے۔ بیشک اُن کا ترجمہ لابدی اور ضروری ہے مگر دوسری زبانوں کے لٹریچر سے ہمیں بے خبر نہیں رہنا چاہیئے۔ انسانی رُوح کی تڑپ اور اُس تڑپ سے جو سوز و گداز قوموں میں پیدا ہوا ہے وہ ہمیں لٹریچر میں ہی ملتا ہے

سید حسین بلگرامی مرحوم نے علی گڑھ میں ایک لکچر کے دوران میں کس قدر صحیح فرمایا تھا کہ عربوں نے یونانیوں کے علوم و فنون، حکمت و فلسفہ، منطق وطب کو اپنی زبان میں منتقل کرکے اُن کے دماغ، اُن کے گوشت و پوست کو لے لیا۔ مگر اُن کے لٹریچر سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ سے یونان کی رُوح، یونان کے دل تک اُن کی رسائی نہیں ہوئی۔ یونان کی خشکی اور یبوست تو اُن میں آگئی، مگر یونان کی لطافت، حسن و جمالیات کی فریفتگی کی اقلیم سے وہ دامن کشاں نکلے چلے گئے اس لئے وہ ایک بہت بڑی نعمت سے محروم رہے۔

یورپ جب قرونِ وسطیٰ کے خواب سے بیدار ہُوا تو انسانیت پرستی کی لہر اس لٹریچر کے مطالعے سے اُس میں دوڑ گئی۔ اس لٹریچر کو اُس نے Humanities (۱) کے نہایت موزوں نام سے یاد کیا۔ اسلئے میری عرض ہے کہ آپ لٹریچر کے ترجمے کی اہمیت کو معمولی نظر سے نہ دیکھیں اور یونان اور قدیم روما کا لٹریچر ہماری زبان میں منتقل ہونا چاہیئے۔

جس لٹریچر نے بائرن کو یونان کا ایسا عاشق بنادیا کہ اُس نے اُس کے لئے اپنی جان دیدی۔ وہ کچھ جادو اپنے اندر رکھتا ہوگا۔ بائرن ہی کیا، انگلستان نے اور یورپ کے کُل شاعروں کُل ادیبوں کو اسی لٹریچر سے الہام ہُوا ہے۔ ملٹن، کیٹس، شیلی کی شاعری میں یونان و روما کے لٹریچر سے متاثر حصّے کو نکال ڈالئے تو پھر کیا رہ جاتا ہے؟ غرض کہ ہومر، ورجل، ہیرو ڈوٹس، سافو کلس اور دیگر خدایانِ سخن کی تصانیف ہماری زبان میں براہ راست آنی چاہئیں۔

مَیں نے براہِ راست عمداً کہا۔ مجھے ہنسی آتی ہے جب مَیں پڑھتا ہوں کہ روسی و فرانسیسی ادبیات کے شاہکاروں کے ترجمے اُردو میں ہو رہے ہیں۔ جب دیکھئے تو مراد یہ ہے کہ میکسم گورکی، ٹالسٹائی، چیخوف، اناطول فرانس کے جو ترجمے انگریزی میں ہوئے ہیں، اُن میں سے کچھ کتابیں یا کچھ فسانے اُردو میں ترجمہ کئے گئے ہیں۔ یعنی ترجمہ در ترجمہ!

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہترین ترجمہ اصل کی خوبیوں کا دھندلا سا نقشہ ہوتا ہے، یہ نقشہ اور بھی دھندلا ہو جاتا ہے جبکہ وہ کسی ترجمے کا ترجمہ ہو۔ اکیڈمی کو اس قاعدے کی سختی سے پابندی کرنی چاہیئے کہ وہ کسی ترجمے کو قبول نہ کرے جبتک کہ وہ اصل زبان سے اُردو میں نہ کیا گیا ہو۔ افسوس ہے کہ اُردو میں خود ہندوستان کی دوسری زبانوں کے لٹریچر کے ترجمے انگریزی سے کئے جاتے ہیں۔

ٹیگور نے اپنی تصانیف کے انگریزی ترجمے خود کئے ہیں لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ترجمے نہیں ہیں، اُسکی تصنیفیں ہیں، اس لئے ٹیگور کی انگریزی تصانیف سے ترجمہ کرنا جائز ہے لیکن بنکم چند اور دیگر بنگالی مصنفین کی جو کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ اُن کے انگریزی ترجموں سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ غضب خدا کا! مَیں نے اَلف لیلیٰ کا ایک ترجمہ دیکھا جو انگریزی سے کیا گیا تھا! میری التجا ہے سنسکرت لٹریچر کے ترجمے بھی اردو اور سنسکرت کے عالم اُردو میں کرکے ہم کو عنایت کریں۔

اُردو کے قدیم اُستادوں کے کلام کو اور بعض جو اُستاد تھے بھی نہیں، اُن کو اُستاد بنا کر پیش کرنا اور اُن کے متعلق تنقیدی مضامین لکھنا اور اُن کی یکساں اور گوشۂ عزلت کی زندگی، ایسی زندگی جو ہنگامہ اور تلاطم سے دُور رہی ہو، جن کے کلام نے ذمعاصرین کی زندگی یا آئندہ نسلوں پر کوئی اثر ڈالا ہو تو گو یہ بھی بہت مشتبہ ہے مگر جن کی زندگی نے مطلق کوئی اثر نہیں ڈالا - ایسی زندگیوں کے حالات کدوکاوش سے ڈھونڈنا ایک دلچسپ مشغلہ ہے اور آپکے اصرار سے میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ اُردو ادب کی خدمت ہے، مگر ہندوستانی اکیڈیمی کا کیا یہی مطمح نظر ہونا چاہیئے؟ اُس کے رسالے "ہندوستانی" کو مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کے "اُردوئے معلیٰ" کا نقش ثانی نہیں ہونا چاہئے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کے مضامین زیادہ چھپیں، جیسے مولوی نعیم الرحمٰن صاحب یا ڈاکٹر صدیقی صاحب نے لکھے ہیں-

حضرات! ہندوستانی اکیڈیمی نے ایک کمیٹی اس غرض سے قائم کی تھی کہ وہ اس مسئلے پر غور کرے کہ ایک مشترک زبان کس طرح عالم وجود میں لائی جا سکتی ہے؟ اس کمیٹی نے ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو اپنا اجلاس منعقد کیا اور اپنی رپورٹ تیار کی۔ اکیڈیمی کی کونسل میں ۷ مارچ ۱۹۳۳ء کو یہ رپورٹ پیش ہوئی اور کونسل نے رپورٹ سے اتفاق رائے کرتے ہوئے یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ اکیڈیمی ایک ایسی ڈکشنری شائع کرے جس میں اُردو اور ہندی کے تمام وہ الفاظ ہوں جو روزمرہ کی بول چال میں استعمال کئے جاتے ہیں - ۱۶ جنوری ۱۹۳۲ء کو مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ تجویز پیش کی کہ ایسے آسان ہندی لفظوں کا ایک لغت فارسی خط میں لکھا جائے اور اُن کے ہم معنی ہندوستانی لفظ لکھے جائیں، تاکہ وہ آسانی سے ہندوستانی میں شامل ہو سکیں۔ میری درخواست اس سے زیادہ ہے - ایک مکمل ہندی ڈکشنری فارسی خط میں چھاپی جانی چاہیئے۔ ہندی الفاظ کو خطوطِ وحدانی میں ناگری حروف میں بھی لکھ دیا جائے مگر معنی اور تشریح سب فارسی خط اور ہندوستانی میں ہو۔

حضرات! جب تک آپ لیتھو کے شکنجے سے اپنے اخبارات، اپنی کتابوں کو آزاد نہ کریں گے، میری رائے میں اُردو پُوری ترقی نہیں کر سکتی - آپ لیتھو کے ذریعے سے کسی کتاب یا کسی اخبار کو لاکھوں کی تعداد میں چھاپ ہی نہیں سکتے۔ چند ہزار کاپیوں کے بعد حرف اُڑنے لگتے ہیں۔ علاوہ ازیں کتابت اس سرعت سے نہیں ہو سکتی جس سرعت سے کہ ٹائپ کمپوز کیا جاتا ہے - پھر ہر وقت آپ کو یہ آسانی ہے کہ چھپتے چھپتے آپ کسی عبارت کو نکال سکتے ہیں، بڑھا سکتے ہیں، گھٹا سکتے ہیں، اخبار کی تیاری اور اشاعت میں اس آسانی کو بہت بڑا دخل ہے - اخبار چھپ رہا ہے، آپ کے پاس ایک خبر آئی - آپ پریس کو روک کر، اخبار کے کسی پیراگراف کو نکال کر، ورنہ جیسے کہ عام قاعدہ ہے (Stop Press) کی جگہ میں جو پہلے ہی سے اسی غرض سے خالی رکھی جاتی ہے اس خبر کو چھاپ سکتے ہیں - کاپیوں کی کتابت کی غلطیوں کے درست کرنے میں جو دیر لگتی ہے یہی اُسے مردود و مطرود قرار دینے کے لئے کافی ہے۔

ان تمام آسانیوں اور خوبیوں کی وجہ سے سوائے ہندوستان کے، اور ہندوستان میں بھی سوائے اُردو کے، کہیں اخبار اور کتابیں لیتھو میں نہیں چھاپی جاتیں - ایران، مصر، ٹرکی، عربستان، اور تو اور افغانستان، حجاز ان تمام ممالک نے لیتھو کی چھپائی یک قلم موقوف کر دی - ان ملکوں کی تمام کتابیں ٹائپ میں چھپتی ہیں -

لیکن ہمارا ہندوستان، میں نے غلط کہا، ہماری اُردو ابھی تک پتھر ہی کے زمانے میں ہے، اُس سے آگے نہیں بڑھی! ہندوستان کی تمام زبانیں، بنگالی، مرہٹی، گجراتی، تلگو، ملایالم، کناری اپنے اخبارات اور اپنی کتابیں ٹائپ

میں چھاپتی ہیں۔ الا ماشاءاللہ ہماری اُردو! سندھی تک جو اُسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے جس میں اُردو، اُسکے تمام اخبارات اور کتابیں ٹائپ میں چھپتی ہیں۔

سب سے بڑی رکاوٹ جو ٹائپ کے چھاپے کی راہ میں سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اُردو کے پڑھنے والے ٹائپ کے چھاپے کے پڑھنے کے عادی نہیں۔ نہ معلوم یہ دلیل کن صاحب نے ایجاد کی ہے! میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا کہ ٹائپ کے پڑھنے میں اُسے کوئی غیر معمولی دقت محسوس ہو۔ جب مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" ٹائپ میں شائع کرنا شروع کیا، تو کیا ٹائپ کی وجہ سے اُس کی اشاعت، اُسکی مقبولیت، اُس کی مانگ میں کسی قسم کی کمی آئی؟ وہ ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ بکا اور اب بھی آنکھیں اُسے ڈھونڈتی ہیں؟ اور مثل گفتہ سعدی "مشک کاغذ زر می برند"!

انجمن ترقی اُردو کا رسالہ "اُردو"، یا رسالہ "سائنس" یا ہمارا "ہندوستانی" اس وجہ سے کم فروخت نہیں ہوتا کہ وہ ٹائپ میں چھپتا ہے۔ ان رسالوں کی اشاعت محض اس وجہ سے محدود ہے کہ پبلک ابھی علمی رسالوں کی قدر ہی نہیں کرتی۔ مولانا محمد علی مرحوم نے "ہمدرد" ٹائپ میں نکالا، وہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ لوگ ایڈیٹر کی شخصیت اور مضامین کی دلکشی و دلچسپی کو دیکھتے ہیں، ٹائپ دلیتھو کو نہیں دیکھتے۔ جب اس وجہ سے مجبور ہو کر کہ کافی ٹائپ اُن کے پاس موجود نہ تھا، مرحوم مولانا نے "ہمدرد" لیتھو میں چھاپنا شروع کیا تو خریداروں کی تعداد میں کوئی معتدبہ اضافہ نہیں ہوا۔

گورنمنٹ گزٹ، سرکاری رپورٹیں اور اعلانات ٹائپ میں شائع ہوتے ہیں، یہاں تک کہ سمن اور سفینے، گاؤں والوں اور کم پڑھے لکھے آدمیوں تک کے پاس ٹائپ کے چھپے ہوئے ہی جاتے ہیں۔ لوگ انھیں پڑھتے ہیں اور پڑھنے کے عادی کردیئے گئے ہیں۔

لیتھو کے طرفدار اور اُس کے شیدائی اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ اُردو نستعلیق میں لکھی جاتی ہے اور نستعلیق لیتھو ہی میں چھپ سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اچھا نستعلیق ٹائپ ابھی نہیں بن سکا اور میرا خیال ہے کہ بن سکتا نہیں۔ اُس کے دائرے، اُسکی نوک پلک اتنے جوڑ توڑ مانگتے ہیں کہ اُن کو ٹائپ میں ڈھالنا اور اُن ٹکڑوں کو محدود تعداد میں رکھنا تکلیف مالا یطاق ہے۔ حامیانِ لیتھو کہتے ہیں کہ جب نستعلیق کا اچھا ٹائپ نہیں بن سکتا تو لامحالہ اُردو، نسخ میں چھاپی جائے گی اور خوبصورت اور دیدہ زیب نستعلیق، جس میں ہندوستانی نے اتنی ترقی کی ہے یک قلم معدوم ہو جائے گا۔

یہ اعتراض صحیح ہے مگر فنِ خطاطی و خوشنویسی جو بجائے خود ایک فنِ لطیف (فائن آرٹ) کی حیثیت ہندوستان و ایران میں حاصل کرچکا تھا وہ کب کا رخصت ہو چکا! لیتھو نے اُس کے گلے پر چھُری پھیر دی۔ یہ خیال غلط ہے کہ لیتھو سے خطاطی اور خوشنویسی قائم ہے۔ نستعلیق کی ایک بگڑی ہوئی شکل اب بھی موجود ہے۔ بس اتنا ہے کہ خوشنویس یہ چاہتا ہے کہ اُس کا خط صاف پڑھا جا سکے۔ روزانہ اخباروں کی اشاعت، کاتب سے جلد جلد لکھنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ایسی حالت میں مطبع کا خوشنویس اُن مشہور خوشنویسوں کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے جو ایک ایک وصلی، ایک ایک قطعہ لکھنے میں مہینوں لگا دیتے تھے اور جو اپنی انگلیاں نرم کرنے کے لئے ہفتوں ہاتھوں پر حلوہ باندھتے تھے۔ اب تو "دو کاتا اور لے دوڑی" پر عمل ہے! علاوہ ازیں نستعلیق اپنی جگہ خوشنما ہے مگر نسخ اچھا نسخ کچھ کم دلربا نہیں۔ نسخ قدرتاً ٹائپ میں اچھا ڈھل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن ممالک نے بھی جو نستعلیق استعمال کرتے تھے،

نسخ کو اختیار کر لیا۔ ایران میں تو نستعلیق پیدا ہی ہوا، وہاں کے خطاط نستعلیق کے لکھنے میں جو کمال دکھا چکے ہیں وہ ہندوستان کے بہت کم خوشنویسوں کو نصیب ہوا۔ اور اب بھی اس فن کے ماہر وہاں ملتے ہیں۔ باایں ہمہ ایران نے نستعلیق کو چھوڑ کر اپنی کتابیں اپنے اخبارات تمام تر ٹائپ میں چھاپنے شروع کر دیئے ہیں۔ ایران کے بعد افغانستان کو دیکھئے۔ یہ قدامت پسند ملک بھی طباعت میں جدت طراز و جدت آشنا ہیں۔ وہاں بھی کتابیں اور رسالے نسخ ٹائپ ہی میں شائع ہوتے ہیں۔ مَیں نے دیکھا ہے۔ وہاں کا مشہور رسالہ مجلہ "کابل" عمدہ ٹائپ میں چھپتا ہے۔

ٹرکی نے ٹائپ سب سے پہلے قبول کیا تھا اور وہاں کا نسخ ٹائپ میری رائے میں تمام دوسرے ممالک کے ٹائپوں سے خوبصورت وخوشنما اور فن کے لحاظ سے مکمل تھا۔ ترکوں کا مذاق لطیف تر ہے حسن و زیبائی کا احساس (Aesthetic Sense) ہم سے زیادہ بڑھا ہوا ہے اسی لئے اُن کا ٹائپ بھی خوبصورت تھا۔ ہائے "استنبول" کے حسین ٹائپ کے وہ حسین حروف نہ معلوم اب کیا ہو گئے ہونگے؟ غالباً اُن کا سیسہ گلا کے رومن حروف ڈھال لئے ہونگے! کاش وہ خرید کر یہاں منگا لیا جاتا! مجھے حیرت ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے سے صحیح المذاق آدمی نے "الہلال" اُسی ٹائپ میں چھاپا جو عام طور پر ہندوستان میں رائج ہے۔ وہ استنبول یا مصر کا ٹائپ منگا سکتے تھے

ہمارا ٹائپ سب سے بدتر اور گرا ہوا ہے۔ اگر یہاں کے لوگ اس ٹائپ کو دیکھ کر ٹائپ کے چھاپے کو ناپسند کریں اور لیتھو کو ترجیح دیں تو کوئی تعجب نہیں۔ رسالوں میں اب تصویروں کا رواج ہو چلا ہے مگر ہوتا کیا ہے کہ علیحدہ اوراق پر تصاویر بلاک سے چھاپی جاتی ہیں اور اُن کے نیچے عبارت ٹائپ میں ہوتی ہے اور وہ رسالے کے اندر مختلف اوراق کے درمیان لگا دی جاتی ہیں، کسی صفحے پر جس پر لیتھو کی چھپی عبارت ہو، عمدہ بلاک کی تصویر نہیں ہو سکتی۔

یہ کوشش بے سود ہے کہ عمدہ نستعلیق ٹائپ ایجاد ہو۔ سالہا سال سے "حیدر آباد" وغیرہ میں اس پر روپیہ اور وقت ضائع کیا جا رہا ہے۔ وہ محنت اگر نسخ کے ٹائپ کے رواج پر کی جاتی تو بارآور ہوتی۔

مولانا سلیمان ندوی صاحب سے مجھے شکایت ہے کہ "معارف" اور دارالمصنفین کی کتابیں وہ ٹائپ میں کیوں نہیں چھاپتے۔ اس تحریک کا سردار اُنکو ہونا چاہئیے۔ "جامعہ ملیہ" دہلی کے مطبع میں جو ٹائپ ہے میری رائے میں وہ اُس ٹائپ سے جس میں کہ "اکیڈیمی" کی مطبوعات اس وقت چھپ رہی ہیں، بہت بہتر ہے۔ میرے خیال میں اکیڈیمی کا رسالہ اور تمام کتابیں اس ٹائپ میں چھپنی چاہئیں۔

حضرات! ایک چیز جو بظاہر حقیقت ہے، آپکی توجہ کی مستحق ہے۔ ہماری مطبوعہ کتابوں میں اعراب زبر، زیر پیش کا استعمال زیادہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے رسم الخط پر یہ الزام ہے کہ اُس پر جو عبارت لکھی جاتی ہے اُس کے صحیح پڑھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پڑھنے والا عبارت کے الفاظ کے صحیح تلفظ سے پہلے سے واقف ہو ورنہ مُلک کو وہ مَلَک، مِلک اور مُلک پڑھ سکتا ہے۔ اعتراض بالکل صحیح ہے اور اسی کے رفع کرنے کے لئے اعراب ایجاد کیا گیا۔ مگر ہم نے اس ضروری چیز کا استعمال بالکل چھوڑ رکھا ہے اور اسکی وجہ سے اچھے پڑھے لکھے آدمی عبارت کے پڑھنے میں غلطیاں کرتے ہیں۔ مَیں یہ نہیں چاہتا کہ لفظ کے ہر حرف پر قرآنِ کریم کی آیتوں کی طرح اعراب لگائے جائیں نہ اسکی ضرورت، نہ اس کی مہلت ہے۔ مگر اُن حرفوں پر لگا دینے سے جنھیں تلفظ کی کنجی کہنا چاہیئے، عبارت کے صحیح پڑھنے میں بہت مدد ملے گی۔ مثلاً یہ فقرہ لیجیے۔ "مولانا عبدالحق نے فرمایا"۔ اس میں "مولانا" پر کسی اعراب کی ضرورت نہیں۔ "عبدالحق"، "ع" پر زبر اور "ڈ" پر پیش اور "ح" پر زبر کافی ہے یعنی تیرہ حروف کے فقرے میں صرف تین جگہ اعراب لگانے کی ضرورت ہے۔ یا مثلاً "ہندوستانی" کی کتابوں کے

اشتہارات میں چھپتا ہے سول ایجنٹ کتابستان، یہ sole اور civil بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اب اگر "واو" پر ساکن کی علامت لگا دی جائے تو سوْل رسول نہیں پڑھا جائے گا۔

حضرات! ایک اور خیال میں نے بارہا آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ جب اکیڈیمی قائم ہوئی اُس کی ابتدا ہی میں یعنی ۹ دسمبر ۱۹۲۸ء کو میں نے ایک ریزولیوشن رومن حروف کے رواج دینے کے متعلق پیش کیا تھا۔ پھر گذشتہ سال لکھنؤ میں ہندوستانی اکیڈیمی کے اُردو سکشن میں اس کے متعلق ایک مقالہ پڑھا۔ اب پھر آپ کو بہکانے اور آپکے دردِ سر کا باعث ہونیکے لیئے میں اُسی راگ کو الاپتا ہوں۔

لیکن اس مرتبہ میری ہمت بڑھی ہوئی ہے۔ ہندوستان کی اُس عظیم الشان جماعت کے صدر نے (جس کے ہاتھ میں اس مُلک کے سات صوبوں کی حکومت کی باگ ہے) "ہری پورہ کانگریس" کے پلیٹ فارم سے اس مسئلے پر اظہارِ خیال فرماکر اس کی اہمیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ "مسٹر سوبھاش بوس رومن حروف کے رواج کے حامی ہیں"۔ یہ آواز تمام ملک میں گونج رہی ہے۔ اس مسئلے پر جو اور آوازیں کمزور آوازیں کمزور آدمیوں کی طرف سے اُٹھتی تھیں اُن کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی تھی، لیکن جب ایک بڑے گرجا کے بڑے آرگن کی پُر عظمت آواز سے وہی لَے نکل رہی ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ عقیدت اور احترام سے سُنی جائے گی۔

میں نے جو پارسال کہا تھا وہی اب بھی کہہ سکتا ہوں۔ صرف الفاظ بدل سکتا ہوں۔ اس لیئے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ جو مقالہ میں نے پارسال پڑھا تھا اُس کو بطور ضمیمے یا تتمّے کے اس خطبے کے ساتھ شامل کردوں

لیکن نہایت مختصر طور سے یہ عرض کردوں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ "ٹرکی" کی طرح قانوناً "ہندوستانی" کا فارسی حروف یا ناگری حروف میں لکھنا بند کردیا جائے اور ہر شخص مجبور کیا جائے کہ وہ "رومن" میں لکھے پڑھے۔ نہیں! میری عرض یہ ہے کہ موجودہ فارسی خط اور ناگری خط جاری رہے مگر ساتھ ہی اس کے "رومن" کو بھی رواج دینے کی کوشش کی جائے اور اُردو ہندی کی کتابیں اور اخبارات ان حروف میں بھی چھاپے جائیں تاکہ مُلک کے اُس طبقے تک جو ہندوستانی زبان بولتا اور سمجھتا ہے مگر بہ سبب اِس کے کہ فارسی رسم الخط اور ناگری رسم الخط سے نابلد ہے، اُسے پڑھ نہیں سکتا، ہمارے لٹریچر کی رسائی ہوسکے۔

خاتمہ کلام پر میں اُردو اور ہندی کے ہمہ گیر اثر کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ وہ زبان جسے اُردو کہیئے یا ہندی یا صُلح جویانہ طریقہ سے ہندوستانی اس ملک کے ایک بڑے حصے پر چھائی ہوئی ہے اور چھائی جاتی ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں زبان کا بھی فیڈریشن (Federation) ہوگا۔ لیکن یہ دو فیڈریشن ہوں گے۔ پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اُردو کے فیڈریشن میں شامل ہوں گے۔ یہاں اُردو حاکمِ اعلیٰ ہوگی۔ مقامی حکومت خود اختیاری پنجاب میں پنجابی کو، سندھ میں سندھی کو، صوبہ سرحد میں پشتو کو دی جائے گی۔ بلوچستان کے متعلق میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا کہ آیا وہ اس فیڈریشن میں شامل ہوگا یا نہیں۔

دوسرا ہندی کا فیڈریشن ہوگا۔ اس میں ممالک متوسط، مہاراشٹر، بمبئی شامل ہوں گے۔ ہمارا صُوبہ اور بہار ہندی کے فیڈریشن میں ہوگا۔ مگر اُردو کا فیڈریشن یہاں حملہ رہیگا اور بہت ممکن ہے کہ یہاں لسانی طوائف الملوکی "Linguistic Anarchy" رہے۔ جس طرح بلوچستان کے متعلق میں کوئی رائے نہیں دے سکتا، بنگال کے متعلق بھی میں نے کوئی رائے قائم نہیں کی۔ بلوچستان کا اُردو کے فیڈریشن میں شامل ہونا اس لیے مشتبہ ہے کہ وہاں زبان و لسان کے بارے میں کوئی احساس، کوئی بیداری نہیں۔ بنگال کی حالت اُس کے بالکل خلاف ہے۔ وہاں خود داری کا احساس اس قدر تیز ہے کہ بنگال ہندی کے فیڈریشن میں شامل

ہونا اپنی کسرِ شان سمجھے گا۔

جنوبی ہند ان دونوں فیڈریشنوں سے کُلیتاً آزاد رہیگا۔ مسٹر گوپال آچاریہ جنوبی ہند میں ہندی کی ترویج کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر "اینٹی ہندی کانفرنس" کے قیام نے اُنھیں ثابت کر دیا ہوگا کہ وہ جنوبی ہندی، ہندی کو رواج نہیں دے سکتے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ گو ہندو مذہب کی وجہ سے ہندو معاشرت کا اثر وہاں حاوی ہے اور سنسکرت لٹریچر وہاں عقیدت اور شوق سے پڑھا جاتا ہے لیکن چونکہ وہاں کی زبانیں "دراویڈین" ہیں وہ اپنے کو ہندی سے بالکل علیحدہ اور دُور پاتی ہیں، رسم الخط، الفاظ، گرامر ہر چیز علیحدہ ہے۔

صُوبۂ سرحد کے اُس بدنام "اینٹی ہندی سرکلر" ہی کو لیجئے، جس کی وجہ سے اخبارات کے سینکڑوں کالم سیاہ ہوئے اور سینکڑوں پروٹسٹ ریزولیوشن پاس ہوئے۔ نتیجہ کیا ہُوا؛ سرحد میں نہ ہندی رہی نہ اُردو، وہاں کی اسمبلی کے ایک نیشنلسٹ ممبر نے یہ ریزولیوشن اسمبلی میں پیش کر دیا ہے کہ وہاں کی مادری زبان پشتو ہے۔ لہٰذا وہاں ذریعۂ تعلیم پشتو ہی ہو۔

مَیں نے جو یہ کہا کہ صوبۂ سرحد، پنجاب اور سندھ میں غالباً اُردو کامیاب ہوگی، یہ اس بنا پر کہا کہ وہاں کے باشندے (میں اکثریت کا ذکر کر رہا ہوں) جس رسم الخط میں اپنی اپنی زبان پڑھتے لکھتے ہیں وہ وہی رسم الخط ہے جس میں اُردو لکھی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اُن کی زبانوں میں فارسی و عربی الفاظ اُسی نسبت سے شامل ہیں جس نسبت سے کہ اُردو میں، اس لئے وہ اُردو کو بمقابلہ ہندی کے اپنی زبان کے قریب تر پائیں گے۔ اسی بنا پر صوبہ متوسط برار، بمبئی، مہاراشٹر کے لوگ ہندی کو اپنی زبان کے قریب تر پائیں گے۔

غرض کہ ہر جگہ جہاں ہندی کامیاب ہوگی وہاں سمجھنا چاہیئے کہ اُردو بھی کامیاب ہوگی۔ اسی طرح جہاں اُردو نے گھر کر لیا وہاں ہندی بھی داخل ہوگی۔ مدراس کا رہنے والا جو تیلیگو یا کناری یا ملایالم بولتا ہے، جب ہندی بولنے اور پڑھنے لگے گا تو کیا وہ اُردو نہیں سمجھے گا؟

مَیں نے آپ کا بہت وقت لیا، لیکن مَیں نے سوچا کہ جب آپ نے موقع دیا ہے تو کیوں اُس موقع سے فائدہ نہ اُٹھاؤں پھر ایسا موقعہ ہاتھ آئے نہ آئے، دل کی بھڑاس تو نکال لُوں!

"اُنیسؔ جمع ہیں احباب، دردِ دل کہدے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے، نہ رہے"

ضمیمہ

اُردو ہندی کے لیئے رومن حرُوف کا استعمال

یہ مسئلہ ہندوستانی اکیڈمی کے سامنے پہلی مرتبہ پیش نہیں کیا جارہا۔ اس سے قبل بھی ۱۹۲۸ء میں مَیں نے اکیڈمی کی
ونسل میں ایک ریزولیوشن پیش کیا تھا کہ اکیڈمی کی مطبوعات اُردو ہندی کے علاوہ رومن حروف میں بھی چھاپی جایا کریں۔
لیڈمی نے اُس وقت اس تجویز کو مسترد کردیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد یہ مسئلہ دوسرے مقامات پر با اثر شخصیتوں
ی طرف سے اُٹھایا گیا اور پریس میں اور لیکچروں اور مقالات کے ذریعے پبلک کے سامنے کافی نمایاں شکل میں آیا۔

ایک عرصے تک الہ آباد کے مقتدر اخبار "لیڈر" میں یہ بحث چھڑی رہی اور پروفیسر شیتا داس نے قابلیت کے ساتھ
ور عالمانہ طریقے سے اُس کی حمایت میں مضامین لکھے۔ غالباً شانتی نکیتن میں بھی اس کی تائید میں ایک مضمون پڑھا گیا۔گو وہ میری
نظر سے نہیں گذرا اور سب سے آخر میں جواہرلال نہرو کی سی محترم اور ہردل عزیز ہستی نے بھی اپنی سوانح عمری میں اس پر
ظہارِ خیال فرماکر اس کی اہمیت کو دوبالا کر دیا۔

اس وقت کہ یہ مسئلہ اکیڈمی کی کونسل کے حضور ایک کم سواد شخص کی طرف سے پیش ہُوا تھا، اُس کی ہنسی اُڑائی گئی تھی۔
یکن مَیں اُمید کرتا ہوں کہ شاید اب کے یہ کانفرنس اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائے۔

مَیں ابتدا ہی میں یہ عرض کردُوں کہ مَیں انتہا پسند ملک کا پیرو نہیں، اور شاید اسی وجہ سے مَیں از یں سُو رانده و زاں سُو
رانده ہوں! اگر مَیں یہ کہتا ہوں کہ عربی اور دیوناگری حروف کا استعمال بالکل ترک کر دیا جائے اور بہ جبر رومن حروف کو
رواج دیا جائے تو غالباً لوگ بھڑکتے اور شدت سے میری مخالفت کی جاتی اور جیساکہ مخالفت کا اکثر نتیجہ ہُوا کرتا ہے چند
شدید حمایت کرنے والے بھی مجھے مل جاتے۔ پہلی مرتبہ بھی مَیں نے صاف طور پر یہ کہدیا تھا کہ مَیں یہ نہیں چاہتا کہ عربی اور دیو
اگری حروف میں کتابیں چھاپنا یک قلم موقوف کردیا جائے اور اب بھی یہی کہتا ہوں۔

اور صاف تو یوں ہے کہ ہمارے ملک میں خوش قسمتی سے یہ ممکن بھی نہیں۔ یہ باتیں تو وہیں ہو سکتی ہیں جہاں "ڈکٹیٹرشپ" ہے۔
جہاں کسی امیرِ مطلق کا حکم چلتا ہے۔ ٹرکی اور سوویٹ روس میں اس قسم کے احکام نافذ کیئے جا سکتے ہیں اور کیئے گئے ہیں۔ کم سے کم
مَیں تو اس قسم کی "ڈکٹیٹرشپ" کا ہندوستان کے لیئے آرزومند نہیں۔ رسم الخط کی جنگ ان صوبہ جات میں کم و بیش تیس پینتیس سال
سے جاری ہے۔ رسم الخط کے ساتھ زبان کی جنگ بھی ہے مگر یہ عربی حروف اور دیوناگری حروف اور اُردو زبان اور ہندی زبان

کی جنگ تھی۔ میدان میں اب ایک چھوٹا سا بچپیت اور کوڑ پڑا ہے اور وہ رومن رسم الخط ہے۔ یہ توقع کرنا کہ عربی اور دیوناگری حروف ہندوستان سے اُٹھ جائیں گے یا اس کی کوشش کرنا قطعاً بے سود ہے۔ دو بڑی قوموں کی معاشرت، تہذیب و تمدن، تاریخ و روایت کے یہ حروف حامل ہیں۔ جن قوموں کے پاس ایسی عظیم الشان، ایسی روشن تاریخ و روایت نہ ہوں، ایسا مالا مال لٹریچر نہ ہو، وہ آسانی سے زبان چھوڑ سکتی ہیں، رسم الخط چھوڑ سکتی ہیں، اپنی معاشرت چھوڑ سکتی ہیں۔ صحرائے افریقہ کے زولو اور بانٹو کو جو حروف چاہیے، سکھا دیجئے، جو زبان چاہیے، اُس کی زبان قرار دیدیجئے، گو وہ بھی بخوشی اپنی زبان چھوڑنے پر تیار نہ ہوگا، لیکن ہم کیسے چھوڑ دیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک قرآن کریم عربی حروف میں اور وید مقدس دیوناگری حروف میں محفوظ ہیں، کسی گوشۂ دماغ میں بھی اس خیال کا گذر نہیں ہوسکتا۔ دیوناگری اور عربی حروف قدیم تہذیب و تمدن کی یادگار ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر انسانی ارتقاء کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ وہ انسانی آواز کو مقید اور ظاہر کرنے کے ایسے ہی عجیب اور مکمل طریقے ہیں جیسا کہ رومن حروف! مکمل اور بے عیب رسم الخط نہ عربی حروف ہیں نہ دیوناگری اور نہ رومن۔ ان تینوں میں ان کی مخصوص خوبیاں اور مخصوص عیوب ہیں۔

ناگری رسم الخط، بشرطیکہ تمام ماتروں کے ساتھ لکھا جائے آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے اسکے لئے یہ ضروری نہیں کہ پڑھنے والا تحریر شدہ لفظ کو پہلے سے جانتا ہو تو صحیح پڑھ سکے مگر وہ بہت دیر میں لکھا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے عربی رسم الخط مختصر نویسی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ یہ مختصر نویسی اُس وقت سے صدیوں پہلے ایجاد ہوئی جب کہ پٹ مین (Pitman) کے دماغ میں "شارٹ ہینڈ" کا خیال پیدا ہوا، مگر اُس کے الفاظ کو صحیح پڑھنے کے لئے اُن الفاظ کا تلفظ پہلے سے جاننا ضروری ہے۔ اعراب اس عیب کو دور کر دیتے ہیں، مگر اعراب سے اس خط کی زود نویسی میں فرق آجاتا ہے۔ ان دونوں رسم الخطوں کی قصیدہ خوانی کے بعد بھی اگر میں رومن رسم الخط کی حمایت کرتا ہوں تو کیوں؟ اس لئے کہ موجودہ حالات میں ہندوستانی زبان کی ترویج کا یہ بہترین ذریعہ ہے!

اسلام جہاں گیا، اپنے حروف ساتھ لیتا گیا۔ جس ملک کو اُس نے فتح کیا یا جہاں وہ پھیلا وہاں کی زبان پر اُس نے گہرا اثر ڈالا۔ بعض ملکوں نے تو اسلام کے ساتھ عربی زبان کو بھی اختیار کر لیا جیسے کہ مصر و شمالی افریقہ۔ اکثر نے حروف ضرور لئے، ایران، افغانستان، سندھ، بلوچستان، کردستان، ترکستان اور غالباً جاوا، سماٹرا وہ ممالک ہیں جنھوں نے اپنی زبان تو نہ چھوڑی لیکن مذہب کے ساتھ عربی رسم الخط کو اختیار کر لیا۔ شائد چین ہی وہ ملک ہے جہاں عربی رسم الخط نے وہاں کے مسلمانوں میں رواج نہ پایا۔

ہندوستان کی آرین قوم نے اپنے مفتوحہ ممالک نیز اُن میں جو اُس کے زیر اثر آئے، اپنے رسم الخط کو منوا لیا۔ اس برّاعظم کے مختلف صوبوں میں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک اقلیم ہے، رسم الخط دیوناگری، اُس کی ترمیم شدہ شکل کا ایک رسم الخط گیا۔ جنوبی ہند کی زبانوں، لٹریچر اور مختلف رسم الخطوں نے بھی اس قومی اثر کو محسوس اور قبول کیا۔ تیلیگو اور کناری خطوں نے اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھی۔ لیکن دیوناگری رسم الخط کا اثر ان میں بھی نمایاں ہے۔

اب اس وقت ایک اور رسم الخط کا ہمہ گیر اثر تمام برّاعظم ہند پر طاری ہے۔ یہ رسم الخط، رومن رسم الخط ہے۔ بنگالی، پشتو، تلنگی، کناری، گجراتی، مرہٹی بولنے والا اپنی زبان، اپنے حروف میں پڑھتا ہے۔ لیکن اُس کا تعلیم یافتہ طبقہ روز افزوں تعداد میں رومن حروف سے لامحالہ واقفیت پیدا کرتا ہے۔ ہندوستانی زبان کی رسائی اس طبقے تک رومن حروف کے واسطے سے نہایت آسان ہوگی۔ بمبئی کے پارسی اور اُس پریذیڈنسی کے اور شہروں کے رہنے والے، کلکتے اور بنگال کے بڑے شہروں کے باشندے

ہندوستانی زبان سے، جس طرح کہ وہ عام طور پر بولی جاتی ہے، عموماً واقف ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہندی بھجن اور ٹھمریاں اور اُردو غزلیں ہندوستانی زبان کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچاتی ہیں، مگر بمبئی اور بنگال اور دوسرے صوبوں کے ہندوستانی سمجھنے والے لوگ دیوناگری یا عربی رسم الخط نہیں جانتے۔ اور اس لئے عموماً اُردو ہندی کے اخبار اور کتاب نہیں پڑھ سکتے۔ انگریزی دانی کے "عالم شمول" اثر کی وجہ سے اُنھیں رومن حروف سے عموماً واقفیت ہوتی ہے۔ اُن سے یہ توقع کرنا تو زیادتی ہوگی کہ وہ عربی یا دیوناگری حروف سیکھیں، لیکن اگر رومن حروف میں کتابیں چھپی ہوں تو بلاکسی محنت و مشقت کے اُنھیں پڑھ سکیں گے۔ ایک زمانہ تھا کہ انگریز ہندوستانی زبان اور اُس کے لٹریچر سے اچھی طرح شناسا تھے۔ یہاں تک کہ اُن میں سے بعض ذہین اور طباع حضرات تو شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتے تھے، چنانچہ اُردو کے تذکروں میں ایسے یورپین حضرات کے نام بھی ملتے ہیں جو اُردو میں اچھی نظم و نثر لکھنے پر قادر تھے لیکن غدر کے بعد سے جو ہندوستانیوں سے قطع تعلق کی پالیسی یک قلم موقوف کردی گئی اور رعایا پر رعب اور سفید سفید نسل کی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کے لئے اُن سے کامل علیحدگی اختیار کی گئی۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زبان اور لٹریچر کا پڑھنا انگریزوں میں کم ہوگیا۔ گو اس ملک میں رہنے کی وجہ سے زندگی کی ضروریات اُنہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ اہلِ ملک کی زبان نوکروں کے ذریعے سے ہی سیکھیں۔ اس طبقے کے لئے بھی ہندوستانی کتابوں کا رومن میں چھپنا مفید ہوگا۔

رومن حروف کا رواج بغیر کسی باقاعدہ ریزولیوشن کے پاس کرنے کے، پہلے ہی سے ہو رہا ہے۔ اس معاملے میں عیسائی مشنروں کی مساعی بہت مشکور ہیں۔ وہ انجیلِ مقدس اور کلیسا کے بھجنوں کی کتابیں رومن حروف میں بھی چھاپتے ہیں۔ ہندوستانی فوج کے سپاہی رومن حروف سیکھتے ہیں اور فوجی احکام اور پریڈ کے قواعد ان حروف میں پڑھتے ہیں۔

ہندوستانی اکیڈیمی کی ابتدائے تاسیس سے اس وقت تک اچھی اچھی تصانیف اکیڈیمی کی طرف سے اُردو اور ہندی میں شائع ہوئی ہیں۔ اُن میں سے ایک کتاب تو ایسی ہے جو تنہا اپنی ذات سے، اکیڈیمی کے وجود کا بہترین ثمرہ ہے! میرا اشارہ علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" کی طرف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی کے مطالعہ سے گزرے اور میری آرزو تو یہ ہے کہ وہ مصنف کے الفاظ میں ہی زیادہ تعداد میں پڑھی جائے، اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اس کا ایک رومن ایڈیشن بھی چھاپا جائے۔

عربی رسم الخط کی ترمیم کے لئے بہت سی کوششیں کی جارہی ہیں اور بہت سی کی جاچکی ہیں۔ وہ کوششیں مستحسن ہیں جو اُس کی اصلی ہیئت کو مسخ کئے بغیر اُسے آسان کردے۔ ان سب کوششوں میں سب سے زیادہ کامیاب کوشش پنجاب میں ڈاکٹر ہالرائیڈ اور اُن کے رُفقا کی ہے، جنھوں نے ایسی اچھی ترمیمیں کیں کہ وہ پنجاب کے سررشتۂ تعلیم کے ذریعے پنجاب میں اور وہاں سے بغیر کسی خاص جد و جہد کے تمام ہندوستان میں رائج ہوگئیں۔

مثلاً نُونِ غُنّہ کو بغیر نقطے کے لکھنا۔ ہائے مخلوط چھا، جھا دوچشمی (ھ) سے لکھنا۔ تھے، تھی کے فرق کو ے ی سے ظاہر کرنا وغیرہ مگر بعض تجویزوں میں ایسی اُپج کی جاتی ہے کہ بالکل ایک نئی ابجد ایجاد کرنے کے مساوی ہوتی ہے۔ مثلاً حال میں مرزا عظیم بیگ چغتائی صاحب کی ایک تجویز پڑھی، جس میں وہ رومن حروف کو اختیار کرتے ہیں اور اُن پر عربی اعراب لگاتے ہیں! میں نہیں سمجھا کہ اس میں کونسی خاص آسانی پیدا ہوئی؟ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ رومن حروف معہ اپنے consonants اور

Vowels کے لے لیئے جائیں اور اُن میں نہایت جزئی ترمیمیں کردی جائیں۔

چنانچہ ترکوں نے یہی کیا ہے۔ انھوں نے ہم آواز حروف میں سے صرف ایک حرف رکھ لیا ہے، باقی کو خارج کر دیا
مثلاً V اور W میں ایسا باریک فرق ہے کہ ہم لوگ اُسے ادا نہیں کر سکتے۔ ترکوں نے "و" کے لئے "V" لے لیا اور "W"
کو ترک کر دیا۔ اِسی طرح "ch" مِل کر جو کہیں "چ" کہیں "ش" کی آواز دیتے ہیں، انھوں نے "c" کے نیچے ایک
کاما لگا اُسے "چ" قرار دے دیا وغیرہ۔

میرے خیال میں اُردو ہندی کے لئے Hunterian System بہت کافی ہے۔ اور زیادہ ترمیم و تنسیخ
کی ضرورت نہیں۔ ورنہ ؎

شُد پریشان خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

کا معاملہ ہو جائے گا!

قوت

گلی کے کنارے میں اس مجمع کو اکثر دیکھا کرتا تھا۔ مزدوروں کے، قلیوں کے لڑکوں کے غول کے غول دوپہر کو وہاں کھیلتے
تے تھے، آپس میں اُلجھتے تھے، چیختے چلاتے تھے۔

ایک دن میں اس راستے سے گذر رہا تھا، لڑکوں کا مجمع تو تھا مگر کھیل نہ تھا۔ بلکہ لڑکے حلقہ باندھے کسی چیز کا تماشا
یکھ رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ مزے دار تماشا انہیں بہت لطف دے رہا تھا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی، میں
نے دیکھا کہ جسے وہ اس ذوق وشوق سے دیکھ رہے تھے، وہ ایسا تماشا تھا جو غالباً اُن کی تفریح طبع کے لئے روز ہوتا ہوگا۔ ایک
ا لڑکا جو سن میں سب سے زیادہ معلوم ہوتا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ قریب قریب جوان ہو چکا تھا، متکبرانہ، بیچ میں کھڑا تھا
ور ایک چھوٹا لڑکا اس سے دست و گریباں ہو رہا تھا۔ بڑا لڑکا اس کو چپتا رہا تھا اور غلیظ گالیاں دے دے کر اپنے سے علیحدہ
ر رہا تھا۔ چھوٹا لڑکا گھونسے کھا رہا ہے، تھپڑ کھا رہا ہے۔ بڑے لڑکے کے ہر جھٹکے پر زمین پر گر پڑتا ہے، ہر گھونسے اور تھپڑ
پر ہائے کی آواز اس کی جگرگاہ سے نکلتی ہے مگر گر کے اُٹھتا ہے، روتا جاتا ہے۔ رونے سے اور زمین پر گرنے سے اس کے بال،
س کا چہرہ خاک آلود ہو رہے ہیں، لیکن وہ پھر بڑے لڑکے سے غصّہ میں لپٹ جاتا ہے، ہچکیاں بندھ رہی ہیں، مگر کہے جاتا ہے'
یری ہے' لاؤ!!

یہ کہکر ایک قینچی کو بڑے لڑکے سے چھیننا چاہتا ہے۔ ہر طلب حق کے مقابلے میں اسے ایک گھونسا، ایک لات ملتی ہے
جسے کھا کے وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹتا ہے، مگر پھر آگے آتا ہے، رونے اور چیخنے کی وجہ سے اس کی آواز بیٹھ گئی ہے۔ اس کا
عجز وضعف بڑھتا جا رہا ہے لیکن اپنی قینچی اس سے واپس لینے کی کوشش کئے جا رہا ہے۔

آخر کار اس پر ایک ایسا لپڑا پڑا، جس سے وہ بھنا گیا اور چکر کھا کے زمین پر آ رہا۔ اب اس میں اُٹھنے کی بھی قوت
نہ رہی تھی۔ کمزوری سے زمین پر پڑا رو رہا تھا اور بڑے لڑکے کو گالیاں دے رہا تھا اور وہ جبر و قہر سے حاصل کی ہوئی
قینچی کو متفخرانہ انداز سے ہلا ہلا کے اس چھوٹی مخلوق کی جو حلقہ باندھے کھڑی تھی اور (جو قوت کے مقابلے میں عاجز کو
ہیچ جانتی تھی) قہقہوں اور تالیوں میں جھومتا ہوا چلا گیا۔

عین اس وقت اس منظر کے اُوپر سے ایک کوّا جس نے ایک آشیانۂ شفقت میں گھس کر ابھی ابھی انڈوں کو پھوڑا
تھا اور انھیں کھا کر شکم سیر ہوا تھا، مصنوعی فراد کے انداز سے گذر رہا تھا اور غیض مادرانہ میں بھری ہوئی ایک مینا، سادہ
لوحی سے ٹھونگیں مارنے کی کوشش کر کر کے، قوت اور حیلہ کو اپنے زعم میں مجروح کر رہی تھی۔

ہمایوں - اپریل ۱۹۲۳ء

احمد

علی گڑھ کا ایک قصّہ

مجھ میں اور اس میں عمر کا تفاوت تھا، درجہ کا تفاوت تھا، اور خیر یہ سب تو بھگت لئے جاتے۔ طبیعت کا تفاوت تھا۔ پہلی ملاقات، ابھی ملاقات کہاں ہوئی، کیونکہ مَیں نے اسے لڑکوں کے ایک غول میں دیکھا تھا، یوں کہیئے پہلی ہی نظر میں، مَیں نے اپنی سائیکالوجی اور قیافہ شناسی کی تمام قابلیت اور قوت صرف کرکے پہچان لیا کہ احمد نہایت درجہ شریر مستھزی لڑکا ہے۔ مَیں نے اس کو کسی عالم میں دیکھا تھا، ابھی درِ رزق، ڈائننگ ہال کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ پہلی گھنٹی ہو چکی تھی۔ لڑکے جوق کے جوق بارکوں سے آ آکر پکّی بارک برآمدوں میں، کمروں میں جمع ہو رہے تھے۔ گفتگوئیں زور شور سے ہو رہی تھیں، مگر اس کل زور شور میں احمد کی آواز سب پر غالب تھی، کاش یہی ہوتا کہ آواز سب پر غالب ہوتی۔ نہیں اس کی شخصیت سب پر غالب تھی اور اس وقت جب کہ وہ اس کل حلقہ کو جس میں وہ تھا گرما رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوُا کہ اس کی ہئیتِ معنویہ سے ایک ہوائے باردہ نکلی اور میرے حسّیاتِ دل کو ٹھنڈا کر گئی۔ اس کو خبر نہ تھی لیکن عین اس وقت جب کہ اس کا دل و دماغ، اس کی آنکھیں و بشرہ، غرض اس کے ہاتھ پاؤں اوروں کے لئے باعث الفت تھے، مَیں اس کی طرف اپنے دل میں نفرت پیدا کر رہا تھا۔ احمد غنڈہ تھا۔ بُلّی (Bully) تھا اور مَیں کبھی اس کی ملاقات کی کوشش نہ کروں گا! نئی بارک کی طرف سے ایک اور ٹولی آئی اور گویا یہ اک معمولی اور ضروری کیفیت تھی۔ سب بلا کسی بات کے کہے ہوئے اسی کی طرف جھک پڑے۔ احمد نے ان میں سے ایک کا کندھا پکڑ کے اور اپنی پوری قوت سے اسے ہلا کے کہا:۔

"اتنے دن سے کہاں غائب تھے، لگاؤں ایک چانٹا!"

"یہیں تھا، ہوتا کہاں؟"

"یہیں تھے تو ملے کیوں نہیں؟"

مَیں اس سوال کے جواب کا منتظر تھا۔ اپنے اصول موضوعہ کے مطابق میں لوگوں کے تعلقات کا اندازہ اس گفتگو کے طرز و انداز سے کیا کرتا تھا جو وہ آپس میں کریں۔

"ملتا کہاں، سینکڑوں مرتبہ تمہارے کمرے پر گیا، مگر تمہیں نہ پایا؟"

مَیں نے فوراً اصول موضوعہ پر نظر ڈالی۔ جو لڑکا تحکمانہ انداز سے اپنے کلاس فیلو سے یہ کہتا ہے کہ "تم ایک ہفتہ سے

ملے کیوں نہیں" اور دوسرا اس کے جواب میں یہ نہیں کہتا کہ "ملتا کس سے، تم نے کبھی صورت بھی دکھائی" بلکہ یہ کہتا ہے "ملتا کہاں، سینکڑوں مرتبہ تمہارے کمرے پر گیا، مگر تمہیں کبھی نہ پایا" وہ گو ہزار دعوے مساوات کرے، وہ اسے اپنے سے بڑا سمجھتا ہے اور یا تو اس کی عزت کرتا ہے، یا اس سے ڈرتا ہے۔ احمد کی عزت کون کرے گا۔ پس یہ ضرور اس سے ڈرتا ہے۔ محبت کا نام نہیں لینا چاہیئے۔ دروازہ کھلا، قبل اس کے کہ کھانے کی دوسری گھنٹی "حی علیٰ الطعام" موگری اور تھالی کی زبان سے ادا کرے، ایک بھوکا مگر پرصحت شباب کا زندہ سیلاب ہنستا ہنساتا، چیختا چلاتا، سیٹی بجاتا، زمین پر دھمک دھمک کے قدم رکھتا ہوا، دراتا ہوا داخل ہوا۔ میں بھی اب کس مپرس تنکے کی طرح اس سیلاب میں تھا اور دروازے سے ڈائننگ ہال کے اندر پہنچتے پہنچتے جو قدم میں نے اٹھائے وہ میری عمر کے ارادی حرکتوں میں شمار نہیں ہونے چاہئیں۔ امید ہے کہ کراماً کاتبین نے اس بات کو نوٹ کر لیا ہو گا۔

ڈائننگ ہال میں ایک محشر اکل تھا۔ ہر شخص اپنے ہاتھوں اور دانتوں سے جس قدر جلد اور جس قدر زیادہ کام لے سکتا تھا لے رہا تھا۔ باز جس طرح اپنے شکار پر گرتا ہے، احمد اس طرح مختلف لڑکوں کے پاس جا کر، ان لڑکوں کے پاس جو پرہیزی[1] کھانا کھا رہے تھے، ان کی پلیٹوں پر گرتا تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ کچھ چون وچرا کرے۔

احمد کھانے سے فارغ یا زیادہ صحیح یہ کہ اس سے مطمئن ہو کر کہ اب کھانا باقی ہی نہیں رہا، ڈائننگ ہال سے برآمد ہوا اور پہلے کی بہ نسبت زیادہ شور مچاتا ہوا۔ وہ شکم سیر ہو چکا تھا۔ ہر شخص پر پھبتی کستا ہوا، اس کا منہ چڑاتا ہوا، اس کا ہاتھ مروڑتا ہوا، اس کو ڈانٹتا ہوا، اس کو ڈپٹتا ہوا، اپنے کمرے میں پہنچا۔ گرمیوں کی راتیں تھیں، اپنے کمرے کے سامنے آ بیٹھا۔ وہاں اک مجمع تھا اور یا الکھوں کیسا مجمع تھا۔ طالب علموں کا مجمع تو تھا نہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھوت پریت زیر زمین ہیڈیز (جہنم) میں قید ہیں، چھوٹ آئے ہیں۔ میں بدقسمتی سے اسی بورڈنگ ہوس میں، گو احمد کے کمرے سے بہت دور لیکن اسی لائن میں رہتا تھا۔ میں تازہ وارد تھا۔ اور یہاں کی زندگی سے متوحش۔ میور سنٹرل کالج میں جہاں سے میں آیا تھا، علم کے طالب رہتے تھے۔ مگر یہاں علی گڑھ میں، یہاں وہ رہتے تھے جنھیں میں غول بیابانی کے سوا اور کوئی لقب نہیں دے سکتا۔ احمد، شریر، مستہزی، غنڈے نہ لکھنے پڑھنے والے احمد کے یہاں تو یہ مجمع ہو اور میں جو ایسی زبردست شہرت لے کر میور سنٹرل کالج سے آیا تھا، جس کی فلسفہ دانی کے خود ڈاکٹر ماتھیو اس قدر تعریف کرتے تھے، یوں کس مپرسی کی حالت میں رہوں۔

میں اپنے کمرے سے لیمپ باہر نکال کر لایا، اور یہ خیال کرنے کی بات تھی کہ طالب علموں کے اس مسکن میں صرف میرے ہی کمرے کے سامنے ایک لیمپ اور کتابیں تھیں۔ میں مانتا ہوں کہ چاندنی رات تھی اور نیچر غرق نور اور قلب انسانی غرق طرب۔ لیکن طالب علم کو چاندنی یا نیچر یا قلب انسانی سے کیا غرض!

غول کے اس مجمعے میں خاموشی کا کہاں گذر ہو سکتا تھا، قہقہوں پر قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں، تاہم میں اتنی دور تھا اور اپنی توجہ کو ایسی کوشش سے کتاب پر جمائے ہوئے تھا کہ یہ قہقہے مجھے زیادہ پریشان نہ کرتے تھے کہ یکایک احمد کی کرخت اور بھاری آواز اپنی پوری کرختگی اور بھاری پن کے ساتھ اور آوازوں کی سپہ سالاری کرتی ہوئی، مگر انہیں اپنی معیت میں لئے ہوئے سنائی دی

---

[1] پرہیزی کھانے کی تعریف شوکت علی صاحب کر چکے ہیں۔

یہ ایک کورس تھا ؎

پڑھو ہیں پڑھو ہیں وہ تو　　　دیکھو نہ ان کی جانب دیکھو
دُور ہی رہنا اے لوگو!!　　　کاٹ نہ کھائیں وہ تم کو!

"پڑھو ہیں پڑھو وہ تو ــــــ" یہ کورس ختم ہی ہوا تھا اور شور کے مقابلے میں سناٹا بہت زیادہ گہرا معلوم ہوتا تھا کہ یکایک اس مجمع میں سے کسی صاحب نے جنھیں میں ہمیشہ ڈھونڈتا ہی رہا کہ ان کا سُریلا گلا گھونٹوں کیونکہ ان کی چوٹ بہت زیادہ لگتی ہوتی تھی۔ لوچ بھری اور پُرنم مگر پاٹ دار آواز سے جو سادے بورڈنگ میں گونج گئی، گانا شروع کیا ؎

دیکھنا پیر مغاں حضرت زاہد تو نہیں!
کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو!

پھر خود ہی دہرایا:-

"دیکھنا، دیکھنا پیر مغاں آن ن ن حضرت زاہد تو نہیں" دوسرے مصرع کو جلد ہی سے ادا کیا "کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو" اور گویا سارا مجمع سازش کے لیے بیٹھا تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی کورس پھر شروع ہوا۔ مگر اب کے سرپٹ چلا ؎

پڑھو ہیں پڑھو ہیں وہ تو　　　دیکھو نہ ان کی جانب دیکھو
دُور ہی رہنا اے لوگو!　　　کاٹ نہ کھائیں وہ تم کو!

پڑھو ہیں، پڑھو ہیں وہ تو، پڑھو ہیں وہ تو ــــــ

اس شور میں میں کیا اقلیدس ہوتا تو وہ بھی اپنی توجہ قائم نہ رکھ سکتا۔ میں نے چپکے سے اُٹھ کے لمپ اور کتابیں اندر رکھیں میرے باہر نکلتے ہی اک فرمائشی اور بہت طول طویل قہقہہ اس مجمع نے میری طرف سے منہ پھیر کر لگایا۔

اولڈ بائے
علی گڈھ

مئی سنہ ۱۹۰۶ء

آشیانِ مستقبل!

وہ ہمیشہ اسی طرح، کبھی کبھی مختصر سی ہوا خوریاں کیا کرتے، شام ہو جانے کے بعد، یا دن کو بھی ایک کرایہ کی گاڑی میں سوار ہو کر شہر سے نکل کے، دریا کے کنارے، کسی ٹیلے پر بیٹھ کر، منظر کا والہانہ نظارہ کرتے وقت، اپنے عشق، اپنی حیاتِ محبت کے استقبال کے متعلق بحث کرنے میں انہیں ایک ذوقِ عظیم حاصل ہوتا۔

تین سال کے ازدواج کے بعد بھی ان کی تپ الفت کم نہیں ہوئی تھی! اس تین سال میں ان کا حال ؎

سرما بگذشت و این دل زار ہمان ———— گرما بگذشت و این دل زار ہمان!
القصہ تمام گرم و سرد عالم ———— برما بگذشت و این دل زار ہمان!

ہرروز جو گذرتا تھا، ان کے عشق کو قوت اور زندگی ہی دے کے جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ پورے ہونے والے برس، رابطہ کے ریشمی تاگے میں انہیں اور زیادہ ہی کس رہے تھے، اور یہ دونوں عم زادے شمشاد اور انجم آرا، ایک میٹھے دلدل میں دھنستے ہی جاتے تھے اور اس دلدل سے نکلنے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے تھے۔

انجم آرا کی چچی، شمشاد کی ماں نے کچھ عرصے سے اس دلدل سے نکالنے کا فرض خود بخود اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ شام کو اپنی مختصر سی بیس روپیہ کرایہ کی کوٹھی میں جو شہر کے ایک خاموش اور غیر آباد حصے میں واقع تھی، شمشاد کے ساتھ احاطے ہی کے اندر پھرنے پر چچی معترض، دفتر سے جلد واپس آجانے یا ذرا سے بہانے پر بالکل دفتر نہ جانے پر شمشاد سے اماں جان ناراض!

اس پنہاں اور آشکارا تنقید سے شمشاد اور انجم کی روحیں اپنی من بھاتی آزادی نہ ملنے پر فریاد کر اٹھتی تھیں اور ایک تحمل شکن وصال، آتشیں ان میں بھڑک اُٹھتا اور وہ، اماں جان تو علیحدہ رہیں، کسی نوکر کو بھی خبر کئے بغیر راتوں کو پیدل نکل جاتے، اور دُور تک جاکر واپس آتے۔

اس دن بھی، مگراب کے کھکے، دریا کے کنارے تک جہاں وہ اکثر آیا کرتے تھے، آئے۔

یہ دونوں ایک گھر میں بچپن سے بڑھے تھے۔ اور ان بچوں کے صاف ومعصوم حس سے جن کی نسبت ایک دوسرے کردی گئی ہو، اور جو ایک ہی گھر میں پلے ہوں، ایک دوسرے کو چاہا کرتے تھے، آخر تین سال ہوئے ان کا نکاح ہوگیا، اور یہ دو منگیتر ایک دائمی حیات رفاقت کے لئے اور زیادہ مضبوط رسی سے باندھ دیئے گئے، اس کو سوچ کر دونوں میں ایک لطیف اور جادوانی امید پیدا ہوتی۔

یہاں اس ریتلے ساحل کو ناز شکار بوسوں میں غرق کرنے والی موجوں کے پاس جو نہ معلوم کہاں کہاں سے سنگریزے

لالا کے جمع کر گئی تھیں، بیٹھ کر اپنی حیاتِ حال و مستقبل کے خوابیا سے ایک مستیٔ حظ حاصل کرتے اور کبھی باتیں کرکے، اور کبھی خاموش اپنے معاشقات کے صفحاتِ مستقبل کو سوچتے۔ آہ! زندگی میں کیسے مسترح جوڑا ہوں گے!

شمشاد، اس چھریرے نازک نوجوان کے ذہن میں یکایک اک لمحۂ تصور پیدا ہوتا، اور وہ، ہاتھ بڑھا کر دریا کے ایک موڑ کی طرف، جہاں زمین آگے کو بڑھ کر جزیرہ نما بن گئی تھی، اور جس پر سرسبز درختوں کا جھنڈ تھا، اشارہ کرکے کہتا:۔

"دیکھنا انجم، وہ کیسی خوبصورت جگہ ہے"!

انجم آراء بھی جس کے سامعہ میں یہ شیریں رعشہ دار آواز ایک عکس لطیف پیدا کرتی تھی، ایک استغراق سے چونک کر جواب دیتی:۔

"درحقیقت عجب شاعرانہ مقام ہے"!

شمشاد، جس کے دماغ میں اسی دن ایک فکر پیدا ہوتا، اک سریع حملۂ تصویر سے ایک ذہنی نقشہ کھینچ کر کہتا:۔

"مثلاً وہاں جہاں زمین دریا میں بالکل آگے نکل گئی ہے، اس جھنڈ کے درمیان ایک لطیف، سفید، چھوٹی، انڈا سی کوٹھی ہو۔ لیکن یہ خیال رہے، انجم، کہ بجائے اس کے کہ اس میں نہایت اندھا دُھند سجے ہوئے کمرے ہوں، اس کے مختشم ڈرائنگ روم کی زینتیں نظر رہا ہوں، ان کی چمک آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرے، بالکل سادہ فرنیچر ہو"۔

(ناتمام)

نقاد ۔ جنوری ۱۹۱۴ء

تقریظ بر "زود پشیمان"[1]

یہ بحث، دب دب کے اکثر انگلستان کے علمی جرائد میں ابھرتی رہتی ہے کہ وہ حیرت انگیز ڈرامے جن کا مصنف شکسپیئر سمجھا جاتا ہے، اصل میں لارڈ بیکن کے فلسفی دماغ کا نتیجہ ہیں۔ اس کہنہ اور ایک حد تک ناقابل تصفیہ بحث میرے دوست ناظر، نے میرے لئے ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی ہے۔

حضرت 'ناظر' اے ناظرین کرام! آپ کے جانے پہچانے مشہور و معروف مصنف ہیں۔ لیکن اب تک آپ ان کے فلسفی تصانیف اور ان کے علمی مضامین کی وجہ سے ان کو پہچانتے ہیں اور یہ جامۂ فلسفہ ان پر اب کچھ ایسا زیب دیتا ہے، یہ رنگ علمی ان پر ایسا کھلتا ہے کہ وہ خود اپنے تئیں کسی اور ملبوس میں آپ کے سامنے لاتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ اور ہے بھی یہی کہ ان کے جبہ و دستار فضیلت و وقار کہ جس میں وہ ایسی کامیابی سے جلوہ گر ہیں، دفعتۂ فسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی کی کلاہ کج و قبائے رنگین پہنی، بظاہر ایسی ہی معلوم ہوتی ہے کہ خانقاہ سے بہ یک جست مے خانے میں قدم رکھا جائے۔

مجھے افسوس ہے کہ وہ یہ بانکی اور رنگین قبا پہنتے ذرا شرمائے ہوئے نظر آتے ہیں، کیونکہ اپنے دیباچے میں اُنہوں نے اس میدان میں آنے کا، جسے وہ پبلک کی نگاہ میں مبتذل قرار دیتے ہیں، بہت کچھ عذر خواہی کے لہجے میں ذکر کیا ہے۔ ان سے زیادہ اور کوئی کیا واقف ہوگا کہ یہ فن نااہل ہاتھوں میں پڑ کر ذلیل ہوا ہے اور صحیح مذاق اور غائر نظر رکھنے والوں سے اس کو گلۂ قدیم ہے کہ وہ اُسے اپنے ہاتھوں میں نہیں لیتے ؎

مئے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است   بلکہ مئے می شود از صحبت ناداں بدنام

میں خوش ہوں کہ 'ناظر' نے اس طرف توجہ کی اور وہ ایک بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ "زود پشیمان" ادبی حیثیت سے اور نیز (میں انہیں کا لفظ ادا کرتا ہوں) کیرکٹر نگاری کی حیثیت سے ایک تصنیف لطیف ہے۔

میرے نزدیک وہ یوسف کی تخلیق میں بہت زیادہ کامیاب ہوئے ہیں لیکن انہوں نے ڈراما لکھتے وقت اس بات کو پیش نظر رکھ کر کہ یہ ایسا ہو کہ کوئی کمپنی اور وہ بھی آج کل کی ناٹک کمپنی اسے اسٹیج پر ایکٹ کر سکے، ایسے اجزاء کو داخل کر دیا جو اس کی ادبی حیثیت کی تنقیص کرتے ہیں۔ ان اجزاء میں جزو اعظم مسٹر بیٹی ہیں۔ جس مسئلہ کو انہوں نے موضوع

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے عنفوان شباب میں ایک ڈرامہ "زود پشیمان" کے نام سے لکھا تھا۔ اور اس کے لئے قلمی نام "ناظر" اختیار کیا تھا۔ یہ تقریظ اسی ڈرامے پر لکھی گئی ہے۔

تصنیف قرار دیا ہے، اس میں شک نہیں کہ ہماری موجودہ سوسائیٹی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ حق انتخاب، مناکحت میں بالکل فریقین کو دیا جائے یا نہ دیا جائے اور دیا جائے تو کس حد تک۔ والدین اس حق کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور اب من حیث المجموع انہوں نے اس حق کے استعمال میں ایسی فجیع غلطیاں کی ہیں، جیسی کہ نواب باقر حسین سے سرزد ہوئیں؛ اور آیا دو نوجوان، سودا زدہ دل، رفاقتِ مادام الحیات کے تمام لوازمات پر ایک دور بین نظر ڈال سکتے ہیں تو ڈالنے کی کوشش بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری سوسائیٹی کے نظام میں جس میں عمر طبیعی کے ایک طویل حصے تک مرد بھی اپنے والدین کے دستِ نگر رہتے ہیں، آیا جائز بھی ہے کہ حق انتخاب تو نوجوانوں کو دے دیا جائے اور ازدواج کے مصارف اور ازدیادِ نسل کے علاوہ باقی تمام ذمہ داریاں نوجوان میاں بیوی کے سر رہیں۔ میری رائے میں یہ مسائل نہایت غور طلب ہیں اور "زود پشیمان" ان مسائل کے تاریک و غیر منکشف پہلوؤں میں سے ایک پہلو پر نہایت دلچسپ اور نہایت مؤثر روشنی ڈالتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "زود پشیماں" کی ٹریجڈی سوائے ہماری سوسائٹی کے اور کہیں نہیں ہو سکتی۔

لکھنؤ۔ ۲۸ مئی ۱۹۱۷ء

سجاد حیدر

ظالم محبّت ـــــــــ ایک ناولٹ

مصنّفہ

حجاب امتیاز علی کا مقدمہ

مَیں نہیں سمجھتا کہ اس کتاب کو کسی مقدمہ تقریب کی ضرورت ہے۔

عزیزہ حجاب امتیاز علی نے بزم اُردو میں جو جگہ حاصل کرلی ہے، وہ بحمداللہ ہرگز پائین مجلس نہیں۔ وہ اب مسند کا ایک کونہ دبائے ہوئے ہیں۔ استعارے کو جاری رکھ کر اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ شمع جس وقت ان کے سامنے لائی جاتی ہے تو ساری محفل ہمہ تن گوش ہو جاتی ہے۔

ان کے ادبی ارتقاء کو میں نہایت دلچسپی اور مسرت سے دیکھتا رہا ہوں۔ ان کی تحریر کی ندرت کو دیکھ کر معارض بھی پیدا ہوئے اور مدّاح بھی۔ لیکن اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو غالباً معترضین کی تعداد گھٹ رہی ہے اور مدّاحین کی روز بروز ترقی پر ہے۔

حجاب کے تخیل نے ایک نئی دنیا خلق کی ہے اور اس دُنیا میں ایک نئی اور نہایت دلکش مخلوق آباد کی ہے۔ یہ دُنیا اس دُنیا سے جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں علیحدہ ہے۔ گو اس سے ملتی جلتی ہے اور جو لوگ اس میں آباد ہیں وہ ہم سے مشابہ ضرور ہیں مگر بالکل ہماری طرح نہیں۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک دائمی قوس قزح، دائمی رنگ و بُو، دائمی حسن و عشق کی دُنیا ہے! یہاں پھول کھلتے ہیں سرو و صنوبر پر نغمہ سنج پرندے گاتے ہیں یا سیٹیاں بجاتے ہیں۔ فرانسیسی دریچوں سے سمندر کا نظارہ ہوتا ہے:۔

"میں ہارسنگھار کی ٹہنیوں کے نیچے ٹہلتی رہی۔ مَیں چنبیلی کی بیلوں میں بھاگ گئی"!

"بانس کے لمبے درختوں پر ایک ہدہد زور زور سے گا رہا تھا۔ میرے آگے فرانسیسی لمبی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ مشرقی ممالک کی سُرخ چونچ والی مینائیں حنا کے پودوں پر مصروف نغمہ تھیں"

"حرم سرا والے باغیچے میں نرگس کے پودوں کے قریب مشغلے کے طور پر الف لیلہ پڑھ رہی تھی"!

"وہ مشرقی ممالک کی ایک نہایت حسین رات تھی۔ بالکل ایسی ...... جیسی کہانیوں میں ہوتی ہے۔ تاریک باغ کے تناور تاڑ کے درختوں پر کسی نامراد عاشق کے چہرے کی طرح چاند اب چمکنے لگا تھا۔ باغ کے آخری حصے میں ناشاد بلبل کی میٹھی نغمہ سرائی سنائی دے رہی تھی"!

"پانی کی ننھی ننھی لہروں کا ترنم ارغنوں کے شور کی طرح ہوا میں گونج رہا تھا۔ زیتون کے درختوں پر کوئل کوک رہی تھی"!

"دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی تھیں جن پر حبشی خانہ زاد دادی زبیدہ کے حکم کے مطابق خس اور کیوڑے کا عطر پانی میں ملا کر چھڑک رہے تھے۔"

مشرقی فسوں کار مناظر میں یکا یک پیرس کی جدید ترین تزئین کا ایک نظارہ :-

"کئی مشاطائیں اس پر جھکی ہوئی تھیں۔ کوئی ناخنوں پر پالش کر رہی تھی، کوئی نرگسی آنکھوں میں بڑی مہارت سے سُرمے کی تحریر کھینچ رہی تھی۔ کوئی ہونٹوں پر گلناری رنگ لگا رہی تھی!"

مناظر طبیعی میں بھی مشرق و مغرب کا امتزاج ہے، مگر مجموعی طور پر جو تصویر آپ کی آنکھوں کے سامنے آتی ہے وہ کس قدر دل آویز اور نظر فریب ہوتی ہے!

ملحوظ خاطر رہے کہ حجاب ہاتھ میں فوٹو کا کیمرا لے کر عکاسی نہیں کرتیں۔ وہ ہاتھ سے تصویر بناتی ہیں اور اس میں اپنے رنگین تخیل سے رنگ بھرتی ہیں۔ وہ نقاش ہیں، عکاس نہیں۔

یہ ایک پرانی بحث ہے کہ لکھنے والا زندگی کا حسین رُخ ہی دکھلائے یا اس کے تاریک رُخ کو بھی عیاں کرے۔ آپ جس مسلک کو چاہے اختیار کیجئے اور جس مسلک کو چاہے سراہیے۔ مگر حجاب کا قلم زندگی کی عفونت اور گندگی سے گریز کرتا ہے۔ آپ خشک واقعیت کے جویا ہیں تو حجاب کے افسانے نہ پڑھیے مگر رنگینی، دل آویزی، بے پناہ کشش و جاذبیت کی تلاش ہو تو یہ افسانہ اور مصنفہ کے دوسرے افسانے آپ کو ایک رنگین دُنیا میں پہنچا دیں گے۔

فاضل نقاد پروفیسر مرزا محمد سعید نے ایک شعر کی مثال دے کر ایک مرتبہ نہایت خوبی سے اس مبحث پر اظہار خیال فرمایا تھا۔ شعر ہے، غالباً داغ کا شعر ہے ؎

یہ بات کیا دم رفتار ہوتی جاتی ہے
کہ اپنے سائے سے تکرار ہوتی جاتی ہے

اپنے سائے سے کوئی لڑتا دیکھا نہیں گیا۔ مگر الھڑ پنے کی جو تصویر آپ کے سامنے اس شعر کو پڑھنے سے آکھڑی ہوتی ہے کیا اس پر بے ساختہ قربان ہونے کو دل نہیں چاہتا؟ حجاب کے افسانوں کی دنیا بھی کچھ اسی قسم کی دُنیا ہے۔ ان کے ہیرو اور ہیروئن ہم ہی جیسے انسان ہیں اور پھر ہم جیسے نہیں! وہ شعر و خیال، حسن و آن کی اقلیم میں بستے ہیں۔ ان کے قدم اس خاکدان ارضی کو مس کرتے ہیں، مگر وہ ہوا میں چلے جاتے ہیں۔ وہ حُسن و عشق کے نخشرستان حسرت و آرزو، کرب و الم، درد و غم کی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ مگر جس کشمکش حیات میں ہم مبتلا ہیں، اس سے یہ آزاد ہیں۔

اس مصنفہ کے افسانے محض عورتوں اور لڑکیوں کے لئے نہیں ہوتے۔ وہ سب کے لئے ہیں۔ حسن و عشق ان کا موضوع ہے۔ لیکن ان کی لطیف تحریر یہ بتاتی رہتی ہے کہ یہ ایک ذکی الحس خاتون کے "خامۂ عنبر فشاں" کی تحریر ہے۔ ان کے ہاں وضاحت ہے، عریانی نہیں، شوخی ہے، بے باکی نہیں۔

مصنفہ کے بیان کی شیرینی سے تو آپ کتاب پڑھ کر ہی لطف اندوز ہوں گے مگر بعض فقرے کتاب ختم کرنے کے بعد بھی میرے حافظے میں اس طرح در آتے ہیں جس طرح خوب صورت بچوں کے کھیل کی یاد :-

"جس ساختہ بے ساختگی سے سوال کئے جارہے تھے، اسی ساختہ بے ساختگی سے میں ان کے جواب دے رہا تھا۔"
"تقدیر ایک طنز کا تبسم لئے ہماری پرسکون زندگی اور والہانہ محبت کو دیکھ رہی تھی۔"
"میرے ارمانوں کا چاند تو کبھی کا غروب ہو چکا!"
"میں نے حُسن توبہ شکن سُنا تھا، مگر یہاں حُسن تقویٰ پرست ثابت ہُوا تھا!"

ان کے افسانوں کے کیرکٹر (اشخاص افسانہ) ایک مستقل خاندان کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ دادی زبیدہ، ڈاکٹر گار، سرہارلی، جبشی، زوناش وغیرہ سب سے اب ہم سب اس قدر وابستہ ہیں جیسے اپنے عزیز دوستوں یا رشتہ داروں سے۔ اور ان کی سوانح حیات سے ہم کو اسی قدر گہرا تعلق ہے جیسا کہ کوہ فیروز، کوہ الماس، کیباس، دریائے ناشپاس کے ساحل یا جزیرہ عباس کے رہنے والوں کو ہو سکتا ہے۔ خدا کرے یہ حضرات رہتی دُنیا تک جئیں اور یہ جزیرے اور یہ پہاڑ اور یہ دریا (جنھیں آپ کسی اٹلس میں تلاش نہ کیجئے گا) اس آب و گل کے کرہ سے کبھی نہ ٹکرائیں۔ روحی ان کی زندگی کے کارنامے اپنے دلکش انداز میں لکھتی ہیں۔

میں نے حجاب، وامتیاز کے لئے ان کے عقد کے وقت جو پیشنگوئی کی تھی، مجھے مسرت ہے کہ ان کی زندگی، اور تصانیف سے سچی ثابت ہو رہی ہے ؎

قیس و لیلیٰ کا سکھائیں گے یہ درس الفت
ان کو تفسیر رہ و رسم وفا آتی ہے!

لکھنؤ۔
۱۵ راگست سنہ ۱۹۴۰ء

فتح اندلس

(مصنفہ عبدالحق)

اشخاص ڈرامہ ـــــــ عربوں کی ہیئت عسکریہ

موسیٰ بن نصیر	فاتحان
طارق بن زیاد	فاتحان
عزیز	موسیٰ کا لڑکا
مروان	" " "
زہرا	موسیٰ کی لڑکی
ایوب بن حبیب	موسیٰ کا بہنوئی
میقر الرومی	معزز جرنیل
زید بن کسادی	معزز جرنیل
طریف بن مالک	معزز جرنیل
مسلم یا کونٹ جولیانس	
صلحا	ایوب کی لڑکی

عذرا، امینہ، عائشہ، زینب ـ مجاہد خواتین

ایک بوڑھا مجاہد

ماتم زدہ لڑکی کا عاشق

امرائے عرب

علمائے اسلام

شیخ الشیوخ

مجاہدین فوج

دوسری مجاہد خواتین

خدمت گار

قاصد

مخبر

اسپین کی ہیئت عسکریہ

راڈرک	پادشاہ
ہیلا	ملکہ

ایک پادری لوسی کا رقیب

ایک سیاہ پوش عورت ـ مرکاڈو کی بیوی

کونٹ جولیانس یا مسلم
لوسی
فوج کی ساقیہ
ایک ماتم زدہ لڑکی
بوڑھے مجاہد کی معشوقہ عاشقہ
کونٹ زادے (نواب زادے)
دوسرے فوجی افسر
شاہزادیاں
کونٹیس (نواب زادیاں)
ڈچزیں (نواب زادیاں)

کونٹ ڈوفریا
ڈوں لوئی مرکاڈو
جنرل الفانسو
جنرل دون سول
جنرل انجیلو۔ کپتان دمینو
} مشہور فوجی افسر
دوتا
سپاہی
فوجی ساقیہ (شراب پلانے والی عورتیں)
ایڈی کانگ وغیرہ

سبتہ کے قریب موسیٰ بن نصیر کا کمرہ نظر آتا ہے

مجلس اوّل —— (موسیٰ بن نصیر، عزیز بن موسیٰ، مروان بن موسیٰ، زہرا بنت موسیٰ اور بہت سے فوجی افسر سب تعظیماً استادہ ہیں اور خاموشی سے موسیٰ کی تقریر سُن رہے ہیں)

موسیٰ بن نصیر :- آج سے ساٹھ سال پیشتر یعنی ہجرت کے بیس سال بعد حاکم مصر عبداللہ بن ابی سرحی نے افریقہ پر فوج کشی کی تھی - ہمارے دشمن جو چاہیں کہیں، سب ان کی ہرزہ سرائی ہے- ہماری تاریخ ایک ترانہ ظفر ہے - افریقہ اس وقت قیصر روم کے زیر نگیں تھا - طرابلس سے لیکر طنجہ (Tanguz) تک جو اس ستبہ کے قریب ہے- جہاں ہم ہیں- جرجیز قیصر کا نائب حکومت کرتا تھا- جرجیز نے ایک لاکھ سے زیادہ فوج سے مجاہدین اسلام کے سدِّ راہ ہونا چاہا- شبیطلہ کے قریب چالیس دن تک گھمسان لڑائی ہوئی - جرجیز کی فوج کو ہر قسم کی سہولتیں حاصل تھیں - برخلاف اس کے مجاہدین اسلام مملکتِ اسلام سے دُور مرکز خلافت سے رسل و رسائل قریب قریب منقطع، اسی نسبت سے مجاہدین کی امداد کو پہنچنا مشکل تھا- بناء علیہ ہماری جانب آہستہ آہستہ علامتِ ضعف ظاہر ہوئے - دشمنوں نے اس فرصت سے کس طرح فائدہ اُٹھایا اسے آپ کے سامنے کیوں کر بیان کروں خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کی درگاہ ایک محشر شہدا ہوگئی تھی - صحرائے کبیر میں مسلمانوں کا ہجرت کر کے جانا، گویا سفر آخرت اختیار کرنے کے مساوی تھا - چالیس ہزار جنادے کس طرح جاتے ہیں - بس مہاجرین کی فوج کا بعینہٖ یہی حال ہوگیا تھا- مرکزِ خلافت میں جب یہ خبر پہنچی تو وہاں کا نقشہ یہ ہوگیا- گھر ویران پڑے تھے- کھڑکیوں پر سیاہ ماتمی پردے لٹک رہے تھے - مکانوں کے دروازے بند، مسجدیں، زیارت گاہیں، سیر گاہیں، مجلسیں، محفلیں اور عشرت کدے، محلات اور بازار، سڑکیں اور گلیاں خاموش اور بے رونق قبرستان معلوم ہوتے تھے - ایک معمورۂ تمدن جس پر موت کی خاموشی چھاگئی ہو-
... جزیرۃ العرب میں مجاہدین کے لئے جو آنسو بہائے گئے وہ بہہ کر مجاہدین کے خون سے

جا ملے۔ افریقہ کی اس منحوس سرزمین پر جو خونِ ناحق ہوا۔ یتیموں کے جو مال کھائے گئے۔ اس کا داغ اس کی پیشانی پر ہمیشہ رہیگا۔ عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عقبہ بن نافع اور چند اصحاب یہاں سے بچ کر نکل سکے، اس وقت اُن کو لیکر عبداللہ بن زبیر قعت کی طرح بے اطلاع، آسمانی بلا کی طرح اچانک اپنے ساتھ ایک جم غفیر لیکر ریگ کے دریا کو حرکت میں لاتا ہوا وہاں پہنچا۔ جہاں بدبخت عبداللہ بن سعد میدان کارزار میں دادِ شجاعت دے رہا تھا۔ یہاں وہ لڑائی ہوئی جو تاریخ میں "حرب العبادلہ" کے نام سے مشہور ہے۔ فتح ونصرت کی وہ شمشیر آبدار جو چار یار سے انہیں ورثے میں ملی تھی۔ پھر چلی اور تاریخ عرب میں ایک شاندار ظفر نامہ کا اضافہ کر گئی۔ ایسا ظفر نامہ کہ حجر المعلق میں اسے مک کر کے کھود کے لکھا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بربری سردار جرجیز نے زبیر کے ہاتھ سے قید حیات سے بری ہوا۔ فوج اور سردارانِ فوج اسیر ہوئے۔ صلح ومسالمت کا اعادہ ہوا۔ عقبہ بن نافع افریقہ پہنچا اور اس نے قرطجہ اور تونس کو فتح کیا اور اس شہر کی بنا ڈالی جو اب قروان کے نام سے مشہور ہے۔ یعنی وہ تہذیب کا نہیں ہوا تعمیر کا بانی تھا۔ کیسی اچھی یادگار ہے اور کیسی شاندار فتح ہے۔ پھر اس نے اطلس کے سلسلۂ کوہ سے جنوب کی طرف رُخ کیا اور مملکتِ سوس کے ساحل پر اُترا۔ ابن نافع کناری جزیروں کے سامنے جس ملک کو وہ فتح کر چکا تھا اُس کے ساحل پر وہ اپنے اُونٹ پر سوار کھڑا تھا۔ سامنے سمندر کو دیکھ کر اُس نے ایک نظر سمندر پر ڈالی اور ایک آسمان کی طرف۔ اور کہا" الٰہی تو شاہد ہے کہ سمندر میرے راستے میں حائل نہ ہوتا تو تیرے پُر جلال نام کی اور آگے تک تبلیغ کرتا۔" یہ خطاب جو نیچے سے عالم بالا کی طرف گیا ان خطابوں سے کم بزرگ نہ تھا جو آسمان سے زمین کی طرف آتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گھومنے والی زمین چند لمحوں کے لئے اپنے محور پر رک گئی ہوگی تاکہ اس خطاب کو آسمان کے فرشتے اچھی طرح سُن لیں۔ ان لوگوں نے اس طرح فتح ونصرت کی اس طریقہ پر ابتدا کی تھی۔ وہ ہمارے لئے ایک شاہراہ قائم کر گئے میں موسیٰ بن نصیر وہ ہوں جس نے حاکم مصر عبدالعزیز کے حکم سے افریقہ فتح کیا۔ وہ عبدالعزیز جس نے خلیفہ عبدالملک کے فرمان کے مطابق حسن بن نعمان کی جگہ زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ میرے پیشرو بزرگ جس مغرب اقصا پر غلبہ حاصل نہ کر سکے خدا کے فضل وکرم سے میں فتح مند ہوا۔ اور وہاں کے جنگجو اور دیر بربریوں کو میں نے زیر کیا۔ میں عَلَمِ اسلام بلند کرکے جن جن مُلکوں میں سے گزرا شوکت اسلام ساتھ ساتھ گئی۔ دنیا موحدین سے آسمان توحید سے پُر ہو گیا۔

میں نے عقبہ کے مسلک کی پیروی کی۔ لیکن وہ جہاں تک صرف پہنچ سکا۔ اُن پر قبضہ نہ کیا۔ میں خدا کا شکر ہے کہ ان مقامات پر قابض ہو گیا۔ اُس نے جو ممالک جن سے لئے تھے۔ اُنہیں پھر واپس دیدیئے۔ میں نے انہیں فتح کرکے اسلام کو ہدیۃً پیش کئے۔ بربری جو شکل وشباہت میں، ثبات واستقلال میں، بہادری اور دبدبہ میں عربوں کے مانند ہیں لیکن حیلہ وخیانت میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ یہ بربری جو اپنے گھر میں آرام کرتے وقت بھی اپنے بدن سے زرہ نہ اتارتے تھے انہوں نے اپنے سروں سے کفن باندھ کر مجھ سے امان طلب کی۔ لاکھوں سیاہ چہرہ انسان کفن باندھے میرے سامنے اس طرح آئے۔ گویا ایک متحرک قبرستان ہے۔ جس پر سفید بادل جھک آئے ہیں۔ موت کا لباس پہنے امان مانگنے یہ جس وقت ہیئے تو میرے دل میں جو حسیات موجزن ہوئے ہیں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایسے ہی بلند پایہ تھے جو جناب مسیح کے دل میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ جب اُن کے معجزے سے مُردے زندہ ہوتے تھے۔ ہم نے اس وحشی قوم سے انتقام لینے کا ارادہ

نہ کیا۔ سب کو معاف کر دیا۔ سب کو امان دے دی۔ میں انسانیت کا عاشق ہوں۔ لیکن میں نے چاہا کہ میں انسانوں کا محبوب بن جاؤں۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں دُنیا میں کسی سے مشابہ نہیں۔ جو دریا ابن نافع کی راہ میں حائل ہوئے۔ وہ میرے ارادہ کو پلٹ نہ سکے۔ ہم یہاں تک آئے ہیں۔ انشاءاللہ اب اس کے آگے جائیں گے۔ میری تمنا ہے کہ اسلام کو صرف خشکی پر حکمراں دیکھوں میں اسے سمندر پر بھی حکمران دیکھنا چاہتا ہوں۔ سلطان بحر و بر اسلام ہی ہو۔ ہم جن صحراؤں سے گزرے اُن میں اور سمندر میں کیا فرق ہے؟ بحر محیط کی طرح ان صحراؤں کا کنارہ نظر نہیں آتا۔ سمندروں میں اگر موجیں پہاڑوں کی طرح بلند ہوتی ہیں تو اُن ریگستانوں کے تودے بھی متحرک پہاڑ معلوم ہوتے ہیں۔ ہم ڈوبتے اُچھلتے آئے۔ انشاءاللہ ڈوبتے، اُچھلتے اور آگے بڑھیں گے۔ بربریوں کو دیکھا۔ اب اسپین کے لوگوں کو دیکھیں گے۔ اندلس کی زمین اپنی عمدگی کی وجہ سے بر الشام، معتدل آب وہوا کی مناسبت سے یمن، خوشبودار مسالوں اور پھولوں کے سبب سے ہندوستان، کثرتِ پیداوار کی بنا پر مصر اور قیمتی کانوں کے باعث چین مشابہ ہے جس ملک میں اتنے محاسن طبعی جمع ہوں۔ جس پر خدا کی نعمتوں کی اتنی بوچھاڑ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہاں کے لوگوں کو شانِ خدائے لم یزل، فیض و حقیقت دین مبین، ہمتِ بزرگانِ دین اور فرائضِ عبودت انسان سے بھی آشنا کروں۔

عزیز:۔ خلیفہ کو آپ کے فتح اندلس کے ارادے کی اطلاع ہے؟

موسیٰ:۔ اس اطلاع کی مطلق ضرورت نہیں۔ خلیفہ نے مجھے فوج کا سردار مقرر کیا ہے اور جہاں میں مناسب سمجھوں ادھر جا سکتا ہوں۔ مجھے اس کا اختیار دے دیا گیا ہے۔ اگر میں شکست کھاؤں اس وقت البتہ خلیفہ مجھے ذمہ دار قرار دے سکتا ہے اور مجھ سے جواب طلب کر سکتا ہے۔ تاہم میں نے طلب اجازت کے لئے ایک عریضہ ارسال کیا ہے۔ اس عریضہ کی کاتب زہرا ہے۔ جو میری زندگی کا پھل ہی نہیں میری طبیعت اور قابلیت کی وارث بھی ہے۔ میرے خیالات و تصورات کو اچھی طرح بیان کر سکتی اور اُن کی تصویر عمدہ اسالیب سے کھینچتی ہے۔

عزیز:۔ مروان —— میری بہن غازیہ ہے —— میری بہن ادیبہ ہے۔

زہرا:۔ میں امیر موسیٰ کی بیٹی ہوں۔ میں قوم نجیب عرب سے ہوں۔ اگر میں غازیہ اور ادیبہ ہوئی تو اس میں تعجب کس بات کا ہے۔ عرب میں کوئی ایک لڑکی آپ دکھا سکتے ہیں۔ جو لکھنا پڑھنا نہ جانتی ہو۔ آپ کو جو لڑکی، جو عورت ملے گی وہ ادب اور غزا سے ہی بحث کرتی نظر آئے گی۔ نوجوان سے نوجوان کے ہاتھ میں قلم ہوگا اور مکتب ادب میں رزمیہ اشعار لکھ رہی ہوگی۔ بوڑھوں تک کے کمر میں تلوار بندھی ہوگی اور وہ فوج کے کیمپ میں جنگ کی تیاری کرتی ہوئی اور اشعار پڑھتی ہوئی دیکھی جائیں گی۔ میں اسلام کی لڑکی، میں اسلام کی ہمشیرہ، اسلام کی رفیقہ کیوں میں اپنے ہمعصروں سے پیچھے رہوں۔ کیا اسلام میں ہر عورت اور مرد کے لئے یہ حکم نہیں ہے کہ علم حاصل کرے۔ میں اوروں کی طرح کیوں نہ ہوں۔ کیا آپ مجھے نااہل سمجھتے ہیں؟

عزیز:۔ اس قدر گرماگرمی کا اظہار نہ کرو۔ تمھاری تلوار لوہے کی ہونی چاہیئے، زبان کی نہیں۔ تمھاری تقریر سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم وہ عرب مجاہد ہو جسے غزا میں رتبۂ شہادت نصیب نہ ہوا اور اس محرومی پر تم اپنے طالع سے شکایت کر رہی ہو تمھارا مطلع یہ سپر نورانی ہے جو یہاں موجود ہے۔ تمھارا نصیب تمھارا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ تمھیں جو شکایت ہے ہم سے نہیں۔ اپنے نصیب سے کرنی چاہیئے۔

زہرا:۔ آپ نے مجھے ادیبہ اور غازیہ اس طرح کہا گویا آپ کو اچنبھا ہے۔ میں اس کا جواب دے رہی ہوں۔ قسمت سے شکایت کرنا ایسا ہی ہے۔ جیسا ایک خیالی وجود پر تلوار چلانا۔ قسمت ایک اندھی پری ہے جو انسان کے ساتھ رہتی ہے جدھر چاہو اُسے لے جاؤ۔ آپ کے خیال میں وہ عرب مجاہد جسے شہادت نصیب ہوئی کیا آپ کی تیز تیز گفتگو کو، باہر سے سننے والا یہ خیال نہیں کرے گا کہ یہاں ایک جنگ جاری ہے، ایک معرکۂ جدال و قتال برپا ہے ؟

آپ کی آوازیں بجلیاں ہیں، آپکے قدم سے زمین میں زلزلہ پیدا ہورہا ہے۔ آپکے نزدیک میں لڑائی لڑ رہی ہوں مگر آپ کیا کر رہے ہیں، ایک طوفان، ایک قیامت اُٹھا رہے ہیں۔ ہاں، دُنیا ایک طوفان میں مبتلا ہو جائے تو آپکی آنکھ پُرنم نہ ہو، اگر آپکی آنکھ کسی غم سے نمناک ہو جائے تو آپ خیال کرنے لگتے ہیں کہ دُنیا ایک سیلاب میں غرق ہو گئی۔ آپ عرب ہیں۔ میں بھی ہوں۔ ہم تینوں ایک باپ ایک وطن کی اولاد ہیں۔ آپ عورت ذات کو سمجھتے ہیں کہ اس کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں، وہ ایک بے ثمر ہے۔ مگر یاد رہے کہ وہ، وہ یتیم ہے۔ جس کے حقوق چھین لئے گئے ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ حقوق اسے کبھی ملے ہی نہیں۔ نے کہا تھا کہ آپ کور دیدہ ہیں۔ دُنیا کو غریق الم سمجھتے ہیں۔ مَیں نہیں کہہ سکتی کہ آپ صبح محشر کو دیکھ کر ہنسیں گے یا آفتاب مغرب سے نکلے تو آپ روئیں گے۔

مردان:۔ اس میں شبہ کی کیا گنجائش ہے۔ آفتاب مغرب سے نکلے تو ہم روئیں گے اس لئے کہ وہ خورشید سیاہ، اس کے لئے ایک غم منحوس ہوگا۔

ہم خوش کب ہوں گے، کب ہنسیں گے ؟ جب ہمیں یہ یقین ہو جائے گا کہ ہم دین اسلام کو فردائے حشر تک مظفر و منصور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

موسیٰ:۔ تم اکثر لڑائیوں میں میرے ساتھ رہیں، کئی لڑائیوں میں، مَیں تمہارے لئے سینہ سپر ہُوا۔ چند مرتبہ تم زخمی بھی ہوئیں۔ مَیں اس کی گواہی دے سکتا ہوں۔ لیکن تمھیں غازیہ کے نام سے جو یاد کیا جاتا ہے، اسے مَیں نہیں مانتا۔ تم نے اسلحہ کا استعمال اپنی حفاظت کے لئے کیا۔ محض جنگ میں شریک ہونے سے کوئی غازی نہیں ہو جاتا، جب تک کہ اپنے ہاتھ سے دشمن کو تہ تیغ نہ کرے، جب تک جنگ میں مارا نہ جائے شہید نہیں کہلاتا۔ ہاں اگر تم ایک سلطان ہوتیں جس کی فوج ہمیشہ رہی تو یہ لازم نہ تھا کہ تم اپنے ہاتھ سے کسی دشمن کو قتل کرتیں۔ تب غازیہ ہوتیں۔ تم مجاہد ہو۔ تم نے کسی دشمن کو کیفر کردار کو نہیں پہنچایا کہ تمھیں غازیہ کا لقب دیا جاتا ہے۔

زہرا:۔ تم نے مجھے لڑائی میں ہر جگہ دیکھا کہاں ہے ؟ اگر مَیں سلطان ہوتی تو بھی تمھیں مجھے دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

عزیز:۔ (موسیٰ سے اشارہ پاکر) مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اُس نے ایک بربری کو قتل کیا۔ جس نے طارق بن زیاد کو قتل کیا تھا۔ مَیں نے یہاں تک دیکھا کہ اس نے طارق کے زخموں کو، مقتول کے سر کی رومال سے مرہم پٹی کی۔ یہ غازیہ بھی ہے۔ ادیبہ بھی ہے۔

زہرا جوش میں آتی ہے۔ مگر اپنے کو روکتی ہے۔

مردان:۔ مَیں نے بھی اپنے کانوں سے سُنا ہے کہ اس نے اشعار تصنیف کئے ہیں جنھیں طارق بن زیاد شوق سے

رہا تھا۔ بے شک زہرا غازیہ بھی ہے اور ادیبہ بھی ہے۔

(زہرا کی صورت سے پھر آثار ہیجان ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر اپنے پر قابو رکھتی ہے)

موسیٰ:۔ (دل میں) آفریں! طبیب خود بیمار تھا۔

زہرا:۔ (کڑک کے) شعر میں نے لکھے ہیں مگران کی لے طارق نے قائم کی ہے۔ وہ یہ آواز اسی لئے پڑھ رہا تھا۔

موسیٰ:۔ یعنی طارق نے تمھارے اشعار کی لے باندھی۔ تم نے اُس کے زخموں کو باندھا۔ ٹھیک ہے مشفقانہ معاملہ کا عاشقانہ مقابلہ!

زہرا:۔ (موسیٰ کے چہرے کو غور سے دیکھ کر اپنے دل میں) ناراض نہیں ہیں۔ (آواز سے)۔ ایک لعین بربری ہمارے سردار (معمولی سپاہی نہیں) جان لینا چاہتا تھا۔ وہ ملعون اس سردار کی جان جو ہم سب کی جان ہے لینا چاہتا تھا۔ ہماری امیدوں کو خاک میں ملانا چاہتا تھا۔ طارق ابن زیاد سپاہی نہیں، سردار نہیں، اپنی ذات میں ایک فوج ظفر موج ہے۔ ایک آہنی قلعہ ہے۔ وہ شریر ایک فوج کو قید کرنا، ایک قلعہ کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ نہیں ـــــ طارق ابن زیاد فوج نہیں، قلعہ نہیں، ایک اقلیم ہے۔ وہ خبیث اس اقلیم کو تسخیر کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ سردار جاتا تو فوج محو ہو جاتی، ملک ہاتھ سے نکل جاتا۔ ملک ہی نہیں ہم سب تباہ ہو جاتے۔ میں دوڑی، میں نے اس سردار کی مدد کو پہنچکر فوج کو بچایا۔ ہاتھ سے گئے ہوئے ملک کو واپس لیا۔ ملت کو زندہ کیا اس میں ایک انتقام کی لذت بھی شامل تھی۔ لیکن چونکہ وہ میری ذات سے متعلق ہے (رکتی ہے)

موسیٰ:۔ بات پوری کرو، تمھاری ذات سے متعلق ہے تو؟

زہرا:۔ میں نے اسے اتنی مہلت دی کہ اس کی جان کو پوری تکلیف ہو۔ کیونکہ جب اس نے امیر طارق پر حملہ کیا۔ اس کا دل زہرا کے لئے بھی نہ دُکھا۔ مجھے اس کا خیال جس وقت آیا تو میرا دل .... ہاں، کچھ نہیں، میں جانے کیا کہہ رہی ہوں۔ بہر حال میں غازیہ ہوں، یا نہیں ہوں آپ ہی اس کا فیصلہ کیجئے۔

عزیز:۔ مردان: عاشقۂ جہاد، معشوقۂ ابن زیاد

موسیٰ:۔ (دل میں) غازیہ عشق

زہرا:۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا

مروان:۔ اور یہ تصنیف اشعار؟ یہ جو سُنتا ہوں، سچ ہے؟

زہرا:۔ وہ اشعار، کسی بزم عشرت کا بیان نہیں کر رہے ہیں۔ وہ اس واقعہ کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔

مروان:۔ (جیب سے دو کاغذ نکال کر) میں پڑھوں؟ یہ اشعار تمھاری اور یہ طارق کی تصنیف ہیں؟

زہرا:۔ (دل میں) اگر مقصد یہ ہے کہ میرے حیات کا علم والد کو ہو جائے تو تم سُنا رہے ہو۔ میں نہیں۔

موسیٰ:۔ اس کے خیالات اُس کے چہرے سے عیاں ہیں۔ مجھے ایسی خوشی ہو رہی ہے۔ گویا میں خود پڑھ رہا ہوں۔

مروان:۔ (عزیز سے) ابن زیاد کے اشعار تم پڑھو۔ یہ لو (ایک کاغذ اسے دیتا ہے)۔ میں اپنی بہن کے اشعار پڑھتا ہوں (زہرا سے) لو یہ یہ تمھارے اشعار ہیں۔

مروان:۔ (پڑھتا ہے)

ابر میں جیسے چمکتی ہوئی برق   نور میں تھا میرا شہزادہ غرق
گھیرے اعدا تھے کہ تھا غرب میں شرق   مجھ سے امداد کا طالب وہ ہُوا

عزیز :- (پڑھتا ہے)

وہ ملک چہرہ بہ سیرت ضرغام   اُس کی خدمت میں مرا پہنچے سلام
جس نے جاں بخش دیا مجھ کو پیام   "میں نے دشمن کا ابھی سر کچلا"

مروان :- کیوں نہ تا حشر مرے دل میں بسے   شکریہ میں لئے بوسے اس نے
اپنے لب سے مری پیشانی کے!   غرق احسان و کرم مجھ کو کیا!

عزیز :- عالم خواب میں وہ مہر لقا   جان و دل اس پہ فدا اس پہ فدا
مجھ کو دکھلاتی ہے پیارا چہرا!   دل نے پھر اس کو طلب کر ہی لیا

مروان :- کبھی شکر اور کبھی شکوہ کرے   میں کہوں میں نے کیا کیا وہ کہے
دیدم از تو کہ ندیدم کسے   کرکے زندہ مجھے پھر قتل کیا
جب میں خیمے میں پڑی ہوتی ہوں   کاش وہ کان میں پھونکے یہ فسوں
آگیا دیکھ یہ تیرا — مجنوں   غم ہجراں کو بہت میں نے سہا
لے کے ایک بوسۂ آتش ترکیب   بجلیاں دل میں دوڑائے حبیب
کیوں نہ ہو (جب کہ میں ہوں اس کے قریب   سمن جسم مرا آتش زا

عزیز :- کاش میں پھر خطرے میں پڑ جاؤں   اور وہ آواز خوش آیند سنوں
"نہ کرو خوف کہ میں آتی ہوں   کون ہے جس نے کہ پھر حملہ کیا
یعنی پھر اس کا میں دیدار کروں   جان کو صدقے میں ہر بار کروں
چارۂ دردِ دلِ زار کروں   یوں کہو بہر خدا اب نہ ستا

مروان :- کون سُنتا ہے دلِ زار کا حال!   زندگی میری ہوئی مجھ پہ وبال
جب سے دیکھا وہ فرشتہ تمثال   دل تڑپتا ہے مرا صبح و مسا
اس کو جی بھر کے نہ میں دیکھ سکی   ہائے کس کام کی تھی عمر مری
لمحۂ عیش کی قیمت یہ ملی   عمر بھر کے لئے اک روگ لگا

عزیز :- ہو گئی دل میں مرے آکے مقیم   کوئی اس کا نہ شریک اور سہیم
کرم خاص ہے تیرا یہ کریم   ایسے ویرانے کو آباد کیا

مروان :- کیوں نہ ہو دل میں مرے آکے مکیں   ہم نشیں اس سا کہیں کوئی نہیں!
نہ فلک پر ہے نہ بالائے زمیں   مرا محبوب وہ بے ہمتا

عزیز:۔ ہو مسیحا یہ ہے سب کو معلوم، دل پہ یہ نقش مگر ہے مرسوم
یہ بھی کر سکتی ہو کار مذموم کہ تغافل سے کرو مجھ کو فنا
اپنا دیدار دکھاؤ پیارے خواب میں رات کو آؤ پیارے
مژدۂ وصل سُناؤ پیارے سارے عالم کو فدا تم پہ کیا
ٹھوکروں سے وہ جلاتا آئے قم باذنی وہ سُناتا آئے
اپنے طارق کو بلاتا آئے پھر نہ جائے کہ قیامت ہو بپا
(حاضرین سے) بس نظم ختم ہو گئی۔

عزیز:۔ بس یہ بھی ختم ہو گئی۔

زہرا:۔ ان کے پڑھنے سے مقصد کیا ہے؟ کیا آپ مجھے ادیبہ یا بے ادب ظاہر کرنا چاہتے ہیں؟

مروان:۔ پڑھنے کا اثر تو اب ظاہر ہوا، نتیجہ بھی بعد میں معلوم ہوگا۔ اس وقت تم سب پر عیاں ہو جائے گا۔ یا تو تمھارے دل میں ایسی امید رہے گی، جیسی اس ماں کے دل میں ہوتی ہے، جس کا لڑکا زخمی ہو چکا ہے، مگر جب تک اس زخمی دل میں حرکت ہے۔ امید بھی باقی ہے۔ یا تم ایسی خوش ہوگی، جیسی وہ لڑکی خوش ہوتی ہے جو میدان جنگ میں شہیدوں کے درمیان اپنے منگیتر کو صحیح و سالم باقی ہے۔

موسیٰ (دل میں) خیر یہ لطیفہ بازی تو ہو چکی۔ واقعہ یہ ہے کہ میری لڑکی خوارق میں سے ہے۔ ایک غیر معمولی ہستی ہے بنتِ موسیٰ کے سر پہ بجلیاں چمکیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک عظیم الشان فوج تباہ و برباد ہو جائے۔ قلعے اس طرح زمین پر آ رہیں گویا ایک زلزلے نے انھیں گرا دیا۔ ملک کا ملک جہنم کی آگ میں سوزاں ہو۔ اہل ملک کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہیں۔ بنتِ موسیٰ پھر بھی بُت کی طرح بے حس و حرکت رہے گی۔ لیکن کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ طارق کا اگر ذکر کیا جائے۔ تو وہ سروِ سیمیں کی طرح جیسے بادِ صبا ہلا رہی ہو۔ لرزہ براندام ہو جاتی ہے۔ بنت موسیٰ زحمتوں پر سے موت کی طرح گذر جاتی ہے۔ خون میں زندگی کی طرح پوشیدہ رہتی ہے۔ آتشیں مخلوق کی طرح شعلوں میں، پری کی طرح دھوئیں میں نظر آتی ہے جس طرح ہوا آگ میں، محبت دل میں، ایک مبہم شکل تاریکی میں داخل ہوتی ہے۔ جس طرح شہید مٹی اور پتھر کے نیچے دفن ہونے کے بعد نیر سحر کی طرح اپنا دیدار پھر دکھاتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی بے عیب و مکمل ظاہر ہوتی ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ طارق کا نام سنتے ہی اس کا چہرہ ایسا ہو جاتا ہے، جیسے آفتاب کو گہن لگ گیا ہو۔ زہرا، اگر خواب میں دلہن دولھا دیکھتی ہے تو اسکی تعبیر یہ کرتی ہے کہ وہ دو جنگجو لڑتے ہوئے دیکھے گی۔ زہرا، حسن و عشق کو ایک دوسرے کا ایسا ہی خدا تصور کرتی ہے، جیسا کہ صلح و جنگ کو تصور کیا جاتا ہے۔ وہ زہرا جو خطروں اور مہالک میں ایسی خوش نظر آتی ہے، جیسی دُلہن اور اس لئے حجرۂ عروسی سے اسے کیا خوف ہونا چاہیئے، وہ زہرا بنت موسیٰ طارق کا نام آتا ہے تو ایک جہنم کی طرح خوف زدہ معلوم ہوتی ہے۔

ایک شکست خوردہ انسان کی طرح ہراساں نظر آتی ہے۔ اس میں ایک عاشقہ کی بے چینی، ایک مدقوق و مسلول لڑکی کی ناطاقتی ظاہر ہوتی ہے۔ کیسے تعجب کی بات ہے۔ پھر بھی کیا اچھا ہوا۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ حصولِ مقصد کے اس موقع

کو آلۂ کار بنانا چاہیئے۔ یہ تمام باتیں ظاہر کررہی ہیں کہ ہم کامیاب ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ زہرا بنت موسیٰ کے لئے طارق جیسا ہی ایک معشوق عاشق مناسب و شایاں ہے (باہر کی طرف آواز دیکر) کوئی ہے۔

زہرا:۔ (دل میں) انشا اللہ جو میں چاہتی ہوں، وہی ہوگا۔

موسیٰ:۔ (اُس کی آواز پر جو خدمت گار کمرے میں داخل ہوتا ہے اس سے) جاؤ طارق بن زیاد کو اطلاع دو، میں اُن کے تشریف لانے کا منتظر ہوں۔

زہرا:۔ (دل میں) میں اُن کے ارادہ کو سمجھتی ہوں۔ نہ معلوم کیوں مگر میرا دل یہ کہتا ہے کہ سمجھتی ہوں۔

دوسرا نوکر:۔ سبتہ کے محافظ کاونٹ جولیانوس آرہے ہیں۔

موسیٰ:۔ (نوکر سے) تشریف لائیں۔ (نوکر باہر جاتا ہے) کاونٹ جولیانوس جو آرہے ہیں، انہوں نے شاہ اندلس اوڈرک سے ظلم و حقارت دیکھی ہے وہ ہمارے پاس پناہ گزیں ہو کر آرہے ہیں۔ لیجئے وہ آگئے۔ آیئے تشریف لایئے حضرت کونٹ

مجلس دوم ———— اشخاص سابقہ ———— کونٹ جولیانوس

جولیانوس:۔ (آداب سلام کے بعد) میں اپنی صداقت و وفاداری ثابت کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں یا امیر۔

موسیٰ:۔ (بیٹھنے کے لئے جگہ کا اشارہ کرکے) کیسی دلپذیر خوش خبری، میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔

جولیانوس:۔ بغیر خوں ریزی کے بھی میں سبتہ کو آپ کے حوالے کردوں گا۔ اپنی صداقت اور وفاداری کو اس طرح ثابت کروں گا۔

موسیٰ:۔ اچھا ہے کہ بغیر خون بہے، ہمارے سپرد کیا جارہا ہے۔ ورنہ خوں ریزی ہوتی اور ہم اُسے فتح کرتے لیکن اسی سے آپکی صداقت اس قدر ثابت نہیں ہوتی۔ آپ نے اس طرزِ عمل سے خدمتِ انسانیت کی ہے ظاہر ہے کہ آپ اپنے شہروں، اپنے صحراؤں کو خون کے سرخ دریا میں ڈبونا نہیں چاہتے تھے۔

جولیانوس:۔ پچھلی ملاقات میں آپ نے فرمایا تھا کہ آپ اپنا فرض یہ سمجھتے ہیں کہ حقوق انسانیت کی حفاظت کریں میں نے اس فرض میں آپکی مدد کی۔ کیا میں اس خدمت کے عوض میں سزاوارِ انعام نہیں ہوں؟

موسیٰ:۔ آپکے دمِ واپسیں تک آپ کا ضمیر آپکی اس خدمت کا انعام آپکو دے گا۔ پیغمبر بھی، بادشاہ بھی وہ انعام نہیں دے سکتے جو انسان کو اس کا ضمیر دیتا ہے۔ آپکی خدمت اس قدر عظیم الشان ہے کہ اس کا خیال بھی کہ میں اس کا کچھ معاوضہ دے سکتا ہوں۔ ایک جسارت تصور کرتا ہوں۔

جولیانوس:۔ میں حضور کی ایک خاص خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ قوط کی حکومت کی حالت کس قدر غیر منظم اور پریشان ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح عرض کروں گا جس طرح کوئی علم الاعضاء کا بیان کرے۔ اگر میرا بیان غلط ہو تو مجھے سزا دی جائے

موسیٰ:۔ میں بربریوں سے طریف کو تحقیق کے لئے بھیج چکا ہوں۔ کوئی پانچ سو سوار ایک کشتی پر بیٹھ کر گئے تھے۔ اس جسد کی تشریح کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں یہاں تک معلوم ہے کہ اس مردار جسد پر کتنے کیڑے رینگ رہے ہیں۔

جولیانوس:۔ یقیناً طریف کے اور میرے بیانات میں فرق نہ پایا گیا ہوگا۔یعنی میں جھوٹا نہیں۔

موسیٰ:۔ طریف کا بیان تمہارے بیان کے مطابق نہ بھی ہوتا تو تب بھی ہم اندلس پر حملہ آور ہوئے بغیر نہ رہتے۔ سبتہ اور طنجہ کے بندرگاہوں میں ہمارے جہازات تباہ ہو رہے ہیں۔تم نے اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھ لیا ہوگا۔سمندر کے اُن تلعوں میں صحرائے عرب کے چالیس ہزار شیر بھرے جائیں گے۔اوڈرک اپنے سپاہیوں کی جگہ اگر چاہتا ہے اژدھے بھیجے۔تم سے صاف بات کہدوں۔اول تو یہ کہ ہمارے عقیدے کے مطابق جاسوس کی سزا قتل ہے۔اگر تمھیں یہ سزا دی جائے تو ہم حق بجانب ہوں گے۔دوم یہ کہ تمھارا مقصد کیا ہے۔ہمیں معلوم نہیں۔اپنے بادشاہ کی رہانت یا ہم سے اظہار وفاداری وصداقت۔ یہ مجہول ومبہم ہے۔

جولیانوس:۔ فرض کیجئے تینوں باتیں ہیں۔ میں تین کام ایک ارادہ کے تحت کر رہا ہوں مگر جو آپ کے فائدہ کا کام ہے اس کا انعام چاہتا ہوں۔

موسیٰ:۔ مگر جاسوسی ہمارے مفید مطلب کی بھی ہو تو مقبول وممدوح نہیں۔

جولیانوس:۔ آپ پوچھیئے تو میں چاہتا کیا ہوں ایک استفہام انکاری ہو۔

موسیٰ:۔ ہاں پہلے تسلیم اسلحہ وقبول اطاعت کی بات چیت کو ختم کر لیں۔ پھر اور باتیں ہوں۔ دو گھنٹے بعد شہر کے اندر ملاقات ہوگی ــــــ (کھڑا ہو جاتا ہے)

جولیانوس:۔ میں روڈرک کو مضمحل دیکھوں گا۔ میں اس سے خوش ہوں۔ میں پھانسی کے تختہ پر لٹک کر بھی روڈرک کو مضمحل و پریشان دیکھوں۔ مجھے منظور ہے۔

موسیٰ:۔ وہ طریف آ رہا ہے۔   اپریل ۱۹۴۳ء   پہلی قسط

مجلس سوم

اشخاص سابقہ   طریف   صلحا بنت ایوب   چند نوکر

موسیٰ:۔ پہلے یہ تو بتاؤ کاونٹ نے اندلس کے بارے میں جو اطلاعات دی تھیں۔ وہ صحیح تھیں؟

طریف:۔ یا امیر، بالکل صحیح۔کوٹ کی حکومت کا حال ایسا نہیں کہ ہمارا مقابلہ کر سکے۔

جولیانوس:۔ اس کی تو آپ تصدیق کریں گے کہ میں جھوٹا نہیں، یا امیر!

موسیٰ:۔ جناب کاؤنٹ انشاء اللہ دو گھنٹہ بعد شہر کے اندر ملاقات ہوگی (جولیانوس شکریہ کا اشارہ کر کے جاتا ہے)۔ لڑکو دیکھو تم میں سے ہر ایک ایک امیر ایک آمر ہے جو تمھارے زیر حکم ہوں۔ اُن کے ساتھ انصاف و عدل کا برتاؤ کرنا۔ وہ سردار جو اپنے ساتھیوں کو دلگیر ورنجیدہ کرے، اس سے زیادہ خطرے میں ہوتا ہے، جیسے دشمن گھیرے ہوئے ہوں۔اس کے ساتھی، اس کے ندیم، اس کے مصاحب، اس کے مختار و وکیل سب اس کے خلاف مگر دشمن کے طرفدار ہوتے ہیں۔اس کا ثبوت اگر چاہتے ہو تو جولیانوس کے طرز عمل میں دیکھو، جو اپنے آقا سے غداری اور ہم سے وفاداری ظاہر کر رہا

ہے۔ ہاں طریف بتاؤ ساحل کے اس جانب تم نے کیا دیکھا۔ کیا کیا؟

طریف:۔ میں یہاں سے روانہ ہو کر مقابل کے ساحل پر ایک جگہ اُترا۔ دشمن سے ایک دو جگہ جھڑپ بھی ہوئی۔ سات آٹھ سو کی تعداد میں ہوں گے۔ انہوں نے ہمارا مقابلہ کیا، مگر بے فائدہ۔ ہم نے سب کو قید کر لیا۔ بہت سے گھوڑے بھی ہمارے ہاتھ آئے۔ بادشاہ پریشان و ضعیف ہے۔ اس میں ہم سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں۔ اگرچہ اُس کی فوج ہم سے دوگنی تگنی ہے۔ لاکھ سوا لاکھ کے قریب ہوگی۔

صلحا:۔ یہ تم نے کیسے کہا کہ ہمارے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ تین آدمیوں کا ایک آدمی مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن ایک آدمی تین پر کسی وقت حملہ نہیں کر سکتا۔

موسیٰ:۔ صلحا، دشمن ہم سے تین سو گنا بھی زیادہ ہو، ہم پھر بھی اُس پر حملہ کریں گے۔ وہ تعداد میں بہت ہی ہیں مگر اُن میں اختلاف ہے۔ ہم تعداد میں اس سے کم ہیں، مگر ہم متحد ہیں۔ اُن کے کئی خدا ہیں۔ ہمارا ایک خدا ہے۔ ہم متحد ہیں، ہم موحد ہیں۔ ان تینوں آدمیوں پر جو آپس میں لڑ رہے ہیں ایک آدمی کیوں حملہ نہیں کر سکتا۔

صلحا:۔ اُن میں آپس میں اختلاف ہو، لیکن جب اُن کے معبود، ان کے معبد اور اُن کے مقصد ایک ہیں تو ان کے دشمن بھی ایک ہو سکتے ہیں۔ دو بھائی آپس میں لڑ رہے ہوں لیکن باہر سے کوئی ہلاک کرنے کے ارادہ سے اُن پر حملہ آور ہو، میں تو یہ کہوں گی کہ انہیں چھڑانے کی غرض سے بھی آئے تو وہ اپنا لڑائی جھگڑا چھوڑ کر اس سے مقابلہ کریں گے۔

موسیٰ:۔ اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ وہ مقابلہ کریں گے، تب بھی یہ مشتبہ ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے۔

طریف:۔ اُن کی فوج زرہ پوش، آہن پوش ہے۔

موسیٰ:۔ (بات کاٹ کر) ہمارے دل آہن پوش ہیں۔

طریف:۔ اُن کا ہر ایک سپاہی ایک خوفناک دیو ہیکل اُن کا ہر گھر ایک قلعہ کی طرح مضبوط ہر بُرج گویا آسمانی بُرج کی طرح روشن و شاندار، ان کے شہر تو ہے، پتھر، پانی، خندق اور انسانوں کے بدن اور جان کے ذریعہ سے محفوظ اور مستحکم ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ ان میں تفرقہ اور اختلاف ہے۔ اُن کا بادشاہ پریشان اور غیر مطمئن ہے۔

صلحا:۔ کیا اسلیئے وہ ہمارا مقابلہ نہیں کرینگے تو کیا اس واسطے ہم اُن کے شہروں پر اس طرح گرینگے جیسے آسمان سے بجلی گرتی ہے۔

موسیٰ:۔ یہ بات نہیں صلحا، تم یعنی اسلام کی خواتین اُن پر ایک فرشتوں کی فوج کی طرح نازل ہوگی۔ ہم بجلی کی طرح نہیں، آیات کی طرح نازل ہوں گے۔ وہ فلاح کی راہ دکھانے کے لئے، صلح و صلاح قائم کرنے کے لئے۔

صلحا:۔ (زہرا سے) تم کس قدر خاموش ہو!

زہرا:۔ (صلحا سے) تم کتنی باتیں کر رہی ہو!

صلحا:۔ (اپنے دل میں) طارق جا رہا ہے۔ زہرا کو اس کی خبر نہیں مگر یہ خاموشی اس وجہ سے ہے۔

زہرا:۔ (دل میں) طارق جا رہا ہے۔ صلحا کو اس کی خبر نہیں۔ (طارق فاصلہ پر نظر آتا ہے)

صلحا:۔ (دل میں) آہ! آ رہا ہے۔

زہرا :- (دل میں) آرہا ہے — آہ!

مجلس چہارم ——— اشخاص سابق ——— طارق

طارق :- حضرت امیر! کیا آپ نے مجھے طلب فرمایا تھا؟ (دل میں) زہرا بھی یہاں ہے۔

موسیٰ :- ہاں جیسا ہمیشہ تم کو طلب کرتا ہوں - اب بھی میں نے تم کو طلب کیا ہے - اندلس پر چڑھائی کرنے کے لئے میں خلیفہ کے حکم کا منتظر نہ ہوں گا - اس مرتبہ اس فرض کی تعمیل سے قاصر رہوں گا - اگر کوئی موقع خدمت کا ملے - اس سے فائدہ نہ اُٹھانا وہ حکم حاکم کا انتظار نہ کرنے کی قباحت سے زیادہ بُرا ہے - کشتیاں حاضر ہیں - اسپ و شتر حاضر ہیں - سامان جنگ حاضر ہے - فوج تیار ہے - سوار و پیادہ دونوں تیار ہیں - ۹۲ھ کا موسم بہار فتوحات سے نامدار و باوقار ہے — کل اندلس کے لئے فوج حرکت کرے گی - میں نے تمہیں سردار فوج مقرر کیا ہے۔

زہرا :- (دل میں) اٹھا وہ انقلاب جس کو میں پہلے سے سمجھ رہی تھی۔

صلحا :- (دل میں) آئی وہ قیامت جس کا میں کچھ عرصہ سے خوف کھا رہی تھی۔

طارق :- میں فوج کا سردار ہوں گا تو فوج میرے زیر ہدایت ہوگی، لیکن اگر فوج نے شکست کھائی تو میری کون اصلاح کرے گا - مجھے کون ہدایت کرے گا - میں بھی ایک آمر ایک حکم دینے والے کا محتاج ہوں - وہ آمر آپ ہیں - خلیفہ نے فوج کا سردار اول آپ کو مقرر کیا ہے - میں صرف آپ کے زیر ہدایت کام کر سکتا ہوں - آپکی معیت سے علیحدہ ہو کر ان خواہشات کی طرف جو عقل سے دُور ہوں خیالات کا تابع ہو جاؤں گا - میری آرزو ہے کہ بڑے بڑے کارنمایاں کروں - شاندار فتوحات کروں - ایک بے لگام عرب گھوڑا جہاں ٹھہرنا چاہیئے وہاں بھی نہیں رکتا - برابر دوڑتا پھرتا ہے۔

موسیٰ :- اول یہ کہ کسی کے سردار ہونے کی قابلیت اُسے محض سردار کا عنوان دے دینے سے ثابت نہیں ہوتی - سرداری کی حیثیت ایسے بہت سوں کو حاصل ہے جو محض ناقابل و عاجز ہیں اور اُنکی معیت میں بہت سے عقلمند و صاحب وراثت لوگ ہیں دوم یہ کہ ارباب فہم کو کسی حاکم و آمر کی ضرورت نہیں ہوتی - ایک بہادر شہوار اس بے لگام عرب گھوڑے کو بھی اچھی طرح استعمال کرسکتا ہے - جس کا تم نے ابھی ذکر کیا تھا - میں سمجھا تم جتنا آگے بڑھنا چاہو جا سکتے ہو - میں تمہیں ایک خود مختار بادشاہ کی طرح، یا خلیفہ وقت کی طرح عالم غیب سے حکم اجازت دیتا ہوں - اگر کہیں تم بہت مصیبت میں پھنسے تو انشاء اللہ خضر کی مانند تمہارے پاس پہنچوں گا - اگر تم مغلوب ہوا و ہوس ہوگئے تو عزرائیل کی طرح تمہارے سامنے موجود رہوں گا - اگر خدائے بزرگ کے نام جلیل پر تکیہ کر کے بڑھو گے یا واپس ہوگے - توفیق ربانی تمہاری معین و مددگار ہوگی - وہ خفت و خواری جو نفسانیت کے مقاصد رذلہ سے تمہیں حاصل ہوگی - قہر آسمانی تمہارے نزدیک ہوگا - بس تم کل سبتہ کی بندرگاہ سے روانہ ہو جاؤ۔

صلحا :- (دل میں) ایک مرتبہ حکم دیدیا - اس کا حکم منسوخ نہیں ہوتا۔

زہرا :- (دل میں) ایک مرتبہ ارادہ کرلیا - اُسے پُورا کرکے رہے گا۔

طارق :- میری عقل، ارادہ، شجاعت و عزم سب یہیں رہ جائیں گے - کیا آپ مجھے ایک قیدی کی طرح جس کے ہتھیار چھین لئے

گئے ہوں، روانہ کردیں گے؟ ایک قیدی ایک فوج کی کمان کس طرح کرسکتا ہے۔ ایک مریض طبیبوں کا علاج کس طرح کرسکتا

موسیٰ :۔ اگر تمھارے پاس ہتھیار نہیں تمھارا جسم فوج کے لئے سپر کا کام دیگا۔ ڈھال بھی ایک ہتھیار ہے۔ مجھ
دوبارہ مت کہلواؤ۔ کل تم اندلس کی بندرگاہ میں داخل ہوگے۔

طارق :۔ (دل میں) جانے میں فتح ہے۔ شان ہے۔ ثواب ہے۔ کیا میں یہ نہیں چاہتا؟ جان و دل سے جنگ میں
داخل ہوں گا۔ مگر موسیٰ بن نصیر بہت بڑھا ہوگیا ہے۔ اُس کا خوف ہے۔ میں بھی عجیب آدمی ہوں۔ موسیٰ کے مرنے کا خوف
ہے؟ وہ مرے نہ مرے میں قربان ہوں گا۔ جو خدمت میرے سپرد کی گئی ہے۔ وہ پوری ہو جائے۔ مجھے صلہ مل گیا۔ حمید
جو مجھ سے طلب کر رہی ہے، وہ کروں گا اور اپنی ہر اُمید اس پر قربان کر دوں گا، اور زہرا یہ جان سے زیادہ عزیز شباب
سے زیادہ لطیف لڑکی۔ کیا اس کی محبت شباب کی طرح ناپائیدار اس کا وصال زندگی کی طرح موہوم و ناقابلِ اعتبار ہے۔ یہ
صرف چاہے جانے کے لئے نہیں۔ تصور میں رہنے کے لئے، جلوہ افروز ہونے کے لئے نہیں، میری تمام حسرتیں اور آرزوئیں
اس سے وابستہ ہیں۔ کیوں کہ اس کے حضور ہی اس کے سوا میری کوئی اور آرزو رہتی ہی نہیں، تو کیا میں اسے بھی قربان کردوں
وہ جنت اس کی دُنیا کی طرح فانی اور وہ دُنیا ایک خواب کی طرح خیال ہوکے رہ جائے۔ میری تمام تمناؤں کا مرکز یعنی خوا
زماں، وہ تختِ رواں سماوی، وہ سریر محبت وہ کعبۂ انوار، ایک تاریک خاکدانی، ایک زندان خاک اندر خاک ایک سنگ
ایک مزارِ عدم ہوکے رہ جائے گا۔ کیا مستقبل کی وہ امیدیں ایک یاد ماضی میں منتقل ہوکے رہ جائیں گی؟ (بے حال
بے قابو ہوکر یکایک) — زہرا! زہرا! (یہ دیکھ کر حاضرین اس کی حالت دیکھ رہے تھے) میں کل جاؤں گا۔ کل قیا
ہی ہو جائے۔ کل ضرور جاؤں گا۔

موسیٰ: تم پہلے جزیرۃ الخضرا میں اترو گے اور وہاں کے حاکم (تدبیر) ممکن ہے۔ تمھارا مقابلہ کرے۔ تمھاری پہلی
لڑائی وہیں ہوگی ——— اگر اُسے تم نے جیت لیا تو میں اُس کا انعام تمھیں دُوں گا۔ اپنی لڑکی زہرا تمھیں دُوں گا۔

طارق اور زہرا دونوں چونک اُٹھتے ہیں۔ دونوں اپنی نظریں زمین پہ گاڑ دیتے ہیں۔ بلا اختیار صلحا کے منہ سے
ایک آواز نکلتی ہے۔ لیکن وہ اپنے تئیں بعد میں سنبھالتی ہے

مروان :۔ عزیز :۔ (زہرا سے) دیکھی ہمارے اعلان کی تاثیر اس کا نتیجہ بھی بعد میں دیکھو گی۔

موسیٰ :۔ (دل میں) عشق انسان کی معنوی قوت پر غلبہ حاصل کرلیتا ہے۔ دلیرا بن زیاد ایک بیچارہ مسکین
طارق بن جاتا ہے (آواز سے) مگر میری لڑکی کے لئے اندلس سے تمہیں ایک تحفہ لانا ہوگا۔

طارق :۔ طلیطلہ کے محل شاہی میں قوط کے بادشاہوں کے بیس اکیس تاج کہے جاتے ہیں کہ میں بس انہیں لاکر پیش کروں

موسیٰ :۔ وہ ہمارے تمہارے لئے نہیں، وہ لڑکی کو بھی نہیں دئے جا سکتے۔ اگر وہ تمہارے ہاتھ آئے تو وہ خلیفہ کے تحفہ
میں بھیجے جائیں گے۔ خلیفہ اُن کی قیمت ادا کرے گا۔ اس قیمت کا پانچواں حصہ خزانہ شاہی میں رہے گا۔ باقی فوج میں تقسیم کر
جائے گا۔ تم ہمیں ایک ایسا تحفہ بھیجو کہ بیچیں تو کوڑی کو نہ بکے اور خریدنا چاہیں تو خزانوں کے طلاد جواہرات بھی اس کے لئے
کافی نہ ہوں۔ آؤ میرے پاس آؤ ——— اگر تحفہ کے طور پر بھیجنا چاہتے ہو تو (کان میں لفظ کہہ کر) اس وقت میری لڑکی

ادی ہو جائے گی۔

طارق:۔ آپ اطمینان رکھیئے گا۔ ایسا ہی ہوگا۔

موسیٰ:۔ طریف آؤ اب تم جو قیدی اور گھوڑے وغیرہ لائے ہو۔ اُنہیں دیکھیں۔

طارق:۔ (ہنسکر) طریف اندلس پہنچنے میں ہم سب سے آگے۔

طریف:۔ (اسی طرح مسکراکر) سیروسیاحت کے بہانے بہت سے بربری جا چکے ہیں۔

موسیٰ:۔ پھر بھی جس ساحل سے تم اُترے وہاں طریف کے نام سے ہمیں ایک قصبہ آباد کرنا چاہیئے تاکہ جو دیکھے وہ سمجھ
ے کہ ہمارا مقصد اندلس کو برباد کرنا نہیں آباد کرنا ہے۔ (صلحا کے چہرہ پر کچھ دیر نظر ڈال کر حاضرین مجلس سے)
آپ لوگوں سے ایک بات اور کہنا ہے۔ حاضرین میں سے جو چاہے اسے اپنے اوپر لے لے۔ مَیں بڈھا ہوں۔ محبت کے
ں درجے ہوتے ہیں۔ پہلے تیسرے درجہ سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرے درجہ پر آتی ہے۔ پھر پہلے پر پہنچتی ہے یعنی اُوپر سے
ے آتی ہے۔ تیسرے درجہ میں جس وقت محبت ہوتی ہے، اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور اُسے روکا جا سکتا ہے۔ دوسرے
جہ کی محبت کو بدلا جا سکتا ہے۔ محبت جب پہلے درجہ میں پہنچتی ہے تو نہ ہٹایا جا سکتا ہے، نہ تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس
ے بعد آیئے اسیروں کی اور جانوروں کی سیر کریں۔

مجلس پنجم ——— (زہرا شروع میں تنہا ہے۔ اُس کے بعد طارق و موسیٰ داخل ہوتے ہیں)

زہرا:۔ وہ کل جا رہا ہے۔ لیکن ابّا جان بھی یہاں کب رہیں گے۔ چوں کہ ابھی وہ افریقہ میں انتظام و آسودگی نہیں
ر رہے ہیں۔ جس دن انہوں نے یہ فرمایا تھا۔ عزیز و مروان میرے ساتھ یہاں رہیں گے۔ میں کسی اور کو اندلس بھیجوں گا۔ اسی
ت میں نے سمجھ لیا تھا کہ طارق بھیجا جائے گا۔ چنانچہ وہ بھیجا جا رہا ہے۔ مَیں کس لئے اجنبیوں کی طرح، اسیروں کی طرح، یتیموں
طرح یہاں رہوں۔ لڑائی میں مرد زہرا، محبت میں عورت، غیرت و شجاعت میں بہادر بنت موسیٰ، فرقت میں ضعیف! وہ زہرا
ت موسیٰ جو حسن کی ملکہ مانی جاتی ہے۔ عشق میں مملوکہ و کنیز کی طرح مطیع ہے۔ مجاہدین کی بیویاں لڑائی میں جا رہی ہیں۔ اپنے
وہروں کے ساتھ یا شہید یا غازی ہو رہی ہیں۔ مَیں نے کیا گناہ کیا ہے کہ طارق کو خطرے میں تصور کروں اور اُس کے پاس نہ
وں۔ ابن زیاد کا کیا قصور ہے کہ میرے پاس رہنا چاہتا ہے۔ اس پر مجھ سے دور ہے۔ ابّا جان کیوں میرے بغیر طارق کو
ج رہے ہیں۔

طارق:۔ (یکایک داخل ہوتا ہے) اس لئے کہ تمہیں حاصل کرنے کی ہوس مجھے اندلس کو فتح کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

زہرا:۔ آہ! کیا پھر یہ کہنے آئے کہ کل جاؤں گا۔

طارق:۔ میرے خیال میں تم سے یہ دوری ایسی ہی ہے کہ جیسے کسی جگہ دوڑ کے جلد پہنچنے کے لئے، پیچھے کے لئے یہ
ئی ہے۔ خوش ہو کہ تمہارے والد نے تمہیں اندلس کی عظیم الشان اور وسیع مملکت کے برابر ٹھہرایا ہے۔ اگر میں اندلس کو تسخیر کروں گا
تو کیا مجھ [illegible] تم جیسی ملکہ مجھے احسان و عطا کر سکا۔

زہرا:- مجھے یقین ہے کہ میرے والد نے مجھ سے پہلے یہ پہچان لیا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔

طارق:- ذکی عرب زبان حال کو پہچانتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ ان کے سامنے نظر اور قلب باتیں کرتے ہیں۔

زہرا:- اگر یہ بات ہے تو تم کیوں نہیں سمجھتے کہ تمہاری فرقت میرے لئے برداشت سے باہر ہے۔آہ! ابن زیاد، اندلس سے تم مجھے تحفہ نہیں فاتح بھیجو گے۔

طارق:- بچی ہو۔تمہیں معلوم نہیں کہ فرائض سرداری، جذبات محبت پر غلبہ حاصل کر رہے ہیں۔

زہرا:- شان وشوکت، فتح وظفر کے لئے مجھے قربان کر رہے ہو، بے وفا؟

طارق:- اگر تمہیں قربان کرنا سہل ہے تو یقین مانو وہ سہل ممتنع ہے۔ زہرا میں عرب ہوں۔جھوٹ نہ بولوں گا میں بہت باتیں جانتا ہوں، مگر ریاکاری نہیں جانتا۔ اسلام کی شان اونچا کرنے کے لئے میں تمہیں قربان کر سکتا ہوں۔اگرچہ یہ قربانی فتح اندلس سے بھی مرے لئے زیادہ مشکل ہوگی۔

زہرا:- مشکل ہوگی۔لیکن پھر بھی یہ قربانی آپ کر ہی دیں گے۔کیوں ہے نا؟

طارق:- ہاں — ! ایسا ہی ہے۔مجبوری کے ساتھ ایسا ہی ہے۔فخر وافتخار کے ساتھ ایسا ہی ہے۔

موسیٰ:- (ہنستا ہوا داخل ہوتا ہے) طارق ابن زیاد، اس قابل ابن زیاد کہ اس کے شہرے کا ڈنکا دنیا میں بجے۔ دنیا حیات انسانی کے لئے فانی ہے۔ مگر جو نام نیک وکارہائے نیک دنیا میں چھوڑ جائیں۔اُن کے لئے فانی ہے۔ جولیانوس مشرف بہ اسلام ہوا۔ کل تمہارے ساتھ جائے گا۔خلیفہ کے پاس سے ایک امرنامہ ابھی آیا ہے (دکھاکر) دیکھو۔ انصاف وعدالت کا حکم دے رہے ہیں۔

زہرا:- (بے اختیار) تو کل جاؤ گے؟

طارق:- کل، پرسوں، ہر دن، ہر لحہ جاؤں گا۔

موسیٰ:- خدا تمہیں مظفر ومنصور، اور تمہارے دشمنوں کو مغلوب کرے۔

(طارق، ابن موسیٰ جاتے ہیں)

زہرا:- (اپنے دل میں) اگر وہ کل نہ جائے گا تو میں اُسے بھیجوں گی۔

فصل دوم

مجلس اوّل

(وادیٔ لطہ کے میدان کے ایک کونے میں، ودریائے شریش کے قریب اسپانیا کا فوجی ہیڈکوارٹر)

مجلس اوّل —— دون توئی مرقادو —— جنرل دون صول ——

زرہ پوش فوجی سردار —— کونٹ ڈوفریا —— کپتان دومینو —— تیر وکمان —— گرز وتبر —— شمشیر وخنجر —— فلانن وگوبھا۔

نیزہ و سپر سے مسلح سپاہی، فوج کو شراب پلانے والی عورتیں، ایڈی کانگ، ہرکارے، شتر سوار، بعد میں دون الفونو ـــــــ

کونٹ ڈوفریا:- خبریں بہت اہم ہیں۔ بہادر تدمیر نے شکست کھائی۔ فتح و ظفر ساری عربوں کے حصہ میں آئی، ہر شخص کی زبان پر طارق کی شجاعت اور مہابت کا ذکر ہے۔ اُس کے ہمراہ جو بدوی فوج ہے۔ اس طرح بڑھتی آرہی ہے جس طرح صحرا میں گردباد اور جس طرح ریگستان کی آندھی اپنے ساتھ ہر چیز کو لئے چلی جاتی ہے۔ اس فوج کے سامنے بھی کوئی چیز نہیں ٹھہرتی۔ کہا جاتا ہے، ہم ان کا مقابلہ کریں۔ وبا کا بھی کہیں مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ بھاگو۔ سیلاب و طوفان سے بھاگ کر ہی جان بچائی جا سکتی ہے۔

دون لوئی مرقادو:- آندھی اور طوفان آدمی اور پتھروں سے ٹکراتے ہیں۔ مگر ناموس و عزت کو ٹھیس نہیں لگاتے۔ ہمیں مدافعہ اور مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑا ہونا چاہیئے۔ اگر ہم اس میں فنا بھی ہوگئے تو ہمارا نام و ہماری عزت تو فنا نہیں ہوگی۔ ہم عربوں کو، طارقوں کو، وہ جہاں سے آئے ہیں وہاں بھیج دیں گے یا جہنم میں دھکیل دیں گے۔

دون صول:- یہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ ہماری فوج نوے ہزار سے زیادہ ہے۔ طارق کے ہمراہ چالیس ہزار سے زیادہ مجاہد نہیں اور ان میں ایک چوتھائی عورتیں ہیں۔

دومینو:- ہم اس قوم کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں جس کی عورتیں تک ہتھیار بند ہیں۔

دوفریا:- مقابلہ بھی کیا تو کیا کامیابی کی امید ہے؟

دون لوئی مرقادو:- اگر پہلے ہی سے شکست کھانے کا ارادہ ہے تو ظاہر ہے کہ ہمیں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ فوج کی ہمت امید سے بڑھتی ہے۔ سردارِ فوج، سپاہیوں کے سامنے فتح و ظفر اور فتح و ظفر کی شان و شوکت، مال غنیمت اور مالِ غنیمت کی کشش کا ہی ذکر کرتے ہیں۔ اگر تم جیسے لوگ جن کے دل میں ناامیدی اور جسم میں ضعف ہے۔ ہمیشہ یاس انگیز باتیں ہی کرتے رہیں تو وہ بھی، جن کے تھوڑے بہت ہوش و حواس قائم ہیں، پاگل ہو جائیں گے۔ نوے ہزار کیا نوے لاکھ آدمی ہوں تو ہم اُن کا بیڑا غرق کر دیں گے۔

دون صول:- عربوں میں مجاہد عورتیں ہیں، تو کیا ہم میں نہیں؟ یہ ساقیا لڑکیاں، کیا محض براتیوں کو شربت پلانے کے لئے ہیں۔ یہ خود بہادر نہ سہی، اوروں کی تو ہمت بڑھاتی ہیں۔ آؤ لڑکیو! بھر تو دو پیالے، یہ کیا، تم بھی کیا اُن عورتوں کی طرح ساکت و صامت ہو جو خواب میں نظر آتی ہیں۔ نہ بات کرتی ہیں نہ بات کا جواب دیتی ہیں۔ یہاں جو آدمی ہیں، اُن کے دل برف کی طرح سرد ہیں۔ ذرا ان کے دلوں کو گرمی تو پہنچاؤ۔

(ساقیہ لڑکیاں، شراب کے پیالے بھر بھر کے دیتی ہیں)

دون لوئی مرقادو:- (دون صول سے) تم ہماری لشکر گاہ کو مے خانہ میں تبدیل کئے دیتی ہو۔

دون صول:- چوں کہ ہمارے فوجی سردار خراب خانوں ہی میں اپنی بہادری دکھلاتے ہیں۔

... مگر اُن کی صورتیں خود ریزی کرتی ہیں۔ ہماری مے گساری، بادہ ریزی۔ وہ

شربت شہادت پیتے ہیں۔ ہم ملکہ مائی شراب

دون صول :- شراب ؛ اہاہا! ——— رُوح ! رُوح !

ایک ایڈی کانگ :- تدمیر جزیرہ کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔

(آپس میں گھبراہٹ کی گفتگو۔ ایڈی کانگ کی لائی جاتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو سُناتے ہیں)

دوسرا ایڈی کانگ :- طارق پہنچ گیا۔ ایک گھنٹہ کی راہ کے فاصلہ پر ہوگا۔ دمدار ستارہ کی طرح اپنی فوج کے آگے آگے آرہا ہے اور دمدار ستارے کی طرح یکایک ظاہر ہوگیا ہے۔

دون لوئی مرقادو :- اُفوہ کس تیزی سے آیا ہے۔ ہمارے ہراول دشمن کے آنے کی خبر دشمن کے آنے کے بعد دیتے ہیں

(دون الفونس سے جو اس وقت داخل ہوتا ہے) تدمر نے راہ فرار اختیار کی۔ اور طارق آرہا ہے۔

دون صول :- ہم بھی طارق کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کریں گے۔ ہمیں آگے بڑھ کے جنگ کرنی چاہیئے۔

دون الفونس :- اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو ہمیں مقابلہ کے لئے پیچھے ہٹنا چاہیئے

دومینو :- مَیں تو یہاں سے ٹلتا نہیں۔

دوفریا :- ہے یوں کہ چارہ غیر اطاعت نہیں کوئی

چند فوجی افسر :- ہمیں بڑھ کے حملہ کرنا چاہیئے .... نہیں ہمیں بھاگ جانا ہے۔ ہتھیار ڈال دینے چاہئیں .... نہیں تسلیم اسلحہ کرنی چاہیئے۔

مرقادو :- مَیں جان گیا کہ اس تفرقہ و اختلاف کا کیا نتیجہ ہوگا۔ لو ایک قاصد اور آیا۔ کیوں کیا خبر ہے ؟ تم نے چالیس ہزار عربوں کو اس طرف آتے دیکھا ؟

قاصد :- مجھے جہاں تک علم ہے۔ طارق نے جزیرہ کی پہاڑی پر قبضہ کر لیا اور اس کا نام جبل طارق رکھا ہے۔

مرقادو :- (حقارت آمیز طریقہ سے) ہاں! یہ بات تو دو مہینہ پہلے کی ہے۔

دون صول (کہتا ہُوا جاتا ہے) ہم بھی طارق کو پکڑ کر اس کا نام قیدی رکھیں گے ——— زندہ باد اسپانیا!

عوام :- زندہ باد رودرک! زندہ باد اسپانیا!

ہراول :- بادشاہ حملہ کا بگل بجوا رہا ہے۔

مرقادو :- اس کے خبر دینے کی ضرورت نہیں۔ ہم بھی سُن رہے ہیں۔ اب کیا مخمور شرابی اس شاہی بگل نواز کے زیر کمان ہوں گے ؟

دوسرے ہراول :- بادشاہ حملہ کا بگل بجوا رہا ہے۔

مرقادو :- تمہیں خبر بھی ہے۔ دشمن آرہا ہے۔ !

ایڈی کانگ :- دشمن نظر آگیا۔ دشمن آرہا ہے!

مرقادو :- ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔

(بات چیت، عمومی حرکت، سپاہی دوڑ رہے ہیں۔ طبل ونقارے بج رہے ہیں، اسپانیا کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ سوار حملہ کرتے ہیں۔ یہ کیفیت جاری رہتی ہے)

ایک ایڈی کانگ:۔ عرب شریش دریا سے، اپنے اونٹوں سمیت اس پار اُتر آئے۔

جنرل دون الفونس:۔ (اپنی تلوار میان سے نکال کر) زمین کے نیچے تحت الثریٰ میں جائیں...... میرا گھوڑا

(گھوڑا آتا ہے۔ دہشت انگیز قیل وقال)

آوازیں:۔ زندہ باد بادشاہ! زندہ باد ملکہ!

مرقادو:۔ بادشاہ اور ملکہ ہر وقت مل سکتے ہیں۔ ملک وملت زندہ باد ـــــ ملک وملت!

(جنرل دون الفونس سوار ہو کے روانہ ہوتا ہے۔ لوگ اس کے ساتھ دوڑتے ہیں۔ حرکت عمومی، لوگ ادھر اُدھر جاتے ہیں)

ایک فوجی افسر:۔ عرب نطہ تک پہنچ گئے۔ میدان سے گذر رہے ہیں

دو فریا:۔ کاش ہم بھی اس لڑائی سے صاف نکل جاتے!

(جھگڑا اور بحث وتکرار بڑھتی ہے۔ آخر میں تیر اندازی شروع ہوتی ہے۔ کمانیں کھنچتی ہیں۔ زخمی سپاہیوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ حملہ ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر گرتے ہیں۔

چند آوازیں:۔ بادشاہ آ رہا ہے۔ ہمارا بادشاہ روڈرک زندہ باد!

مرقادو:۔ زندہ باد اسپانیہ! بادشاہ تخت رواں پر سوار ہو کر آ رہا ہے۔ غالباً اس کا تخت روانہ ہو رہا ہے۔ احمق! کیا عورت کا شکار کرنے نکلے ہیں آپ؟ کیا لڑائی میں جواہرات کے زیور پہن کر، نفیس کپڑے پہن کر نکلا جاتا ہے؟ ہاں! تخت رواں لینڈو گاڑی ہے۔ اپنی شاہی جلوس کی گاڑی پر آ رہا ہے۔ گردونۂ گردوں رفتار پر سواری فرمائی ہے۔ (لوگ ہنستے ہیں) اللہ اللہ! خیر ہم تو مر رہے ہیں۔ مگر مرتے وقت، اس منظر نے ہمیں ہنسا تو دیا۔

سرکار! گردونۂ آتش مدار، دشمن گرفتار پر سوار آ رہے ہیں۔

نا تمام

نگار۔ بابت اپریل ۱۹۴۳ء

مکاتیب

۱- نقاد کے اڈیٹر جناب دلگیر کے نام

۲- جلیل قدوائی کے نام

۳- تاجور نجیب آبادی کے نام

۴- قاضی عبدالغفار کے نام

اپنی وفات کی خبر چھاپنے پر
رسالہ نقاد کے اڈیٹر جناب دلگیر کے نامے

...... میرے پاس نومبر کا نقاد نہیں پہنچا۔ نہ معلوم آپ نے اس میں کیا تحریر فرمایا ہے۔ صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ مَیں مرا تو ہُوں، مگر اس موت کی تشہیر کی کیا ضرورت تھی؟ خواہ مخواہ عزیزوں اور احباب میں کھلبلی پڑ گئی۔ میرے پاس اور خطوط بھی ایسے آرہے ہیں۔ از راہ کرم "نقاد" کا وہ نمبر جس میں مَیں مار ڈالا گیا ہُوں، میرے دیکھنے کے لئے بھیج دیجئے۔ مَیں بھی تو دیکھوں کہ پسِ مُردن میری گِل کے ساغر بنائے گئے ہیں یا خاکِ رہ گزر!

تاریخ؟ سجاد حیدر

جلیل قدوائی کے نامے

سجاد مرحوم نے مجھے بہت سے خطوط لکھے۔ ۱۹۲۲ء میں مَیں انٹرنس کا امتحان پاس کرکے اناؤ (اودھ) سے علی گڈھ گیا اور جلد ہی مجھے اُن کی ملاقات کا شرف حاصل ہوگیا۔ اس کے بعد سے غالباً ۱۹۳۶ء تک اُن سے برابر خط و کتابت رہی۔ افسوس کہ اُن میں سے بیشتر خطوط میری زندگی کے انتشار کی نذر ہو گئے۔ جو بچے اور مل سکے وہ پیش کئے جاتے ہیں۔ ممکن ہے چند خطوط اِدھر اُدھر اور پڑے ہوں۔

ھ ہمایوں - جولائی ۱۹۴۳ء

جب تک ہم دونوں علی گڈھ میں تھے۔ اُن خطوط کی شانِ نزول یہ ہوتی تھی کہ نوکر کے ہاتھ میرے کمرے یا گھر پر پہنچتے تھے۔ زیادہ تر اُس مضمون کے کہ ان کے پاس پہنچ کر اُن کے مضمون کی ڈکٹیشن لوں۔ جب میں اُن کے دفتر میں بہ حیثیت اُن کے پرسنل اسسٹنٹ ملازم ہو گیا (جو خود انہیں کی مہربانی کا نتیجہ تھا) تو اپنے کمرے سے لکھ کر میرے پاس چٹیں بھیجتے تھے۔ جن میں کبھی اپنے ہمراہ مونگ کی کھچڑی اور مکھن کھلانے کی دعوت دیتے تھے۔

ان خطوط کی دلچسپی بڑھانے اور اُن کا ماحول پیش کرنے کی غرض سے حوالہ طلب مقامات پر میں نے حواشی کا اضافہ کر دیا ہے۔ میرے حالات کے سلسلہ میں جہاں الجھن پیدا ہو اسے دور کرنے کی غرض سے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں اپنی علی گڈھ کی ملازمت سے بیزار ہو کر استعفیٰ دینا چاہتا تھا اور چونکہ علی گڈھ میں اُردو کے ایم۔ اے۔ کی ڈگری اس وقت نہ تھی۔ میں الہ آباد یونیورسٹی میں باقاعدہ داخلہ لے کر پڑھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس سلسلہ میں میں نے اپنے تمام سرپرستوں اور دوستوں کو امداد کے لئے کہا تھا اور مجھے اس امر پر ہمیشہ فخر و ناز رہے گا کہ یہ سعادت میرے حصہ میں آئی کہ سر راس مسعود اور قاضی سر عزیز الدین احمد مرحوم کے علاوہ اس موقع پر سجاد مرحوم نے بھی میری خوشی خوشی امداد فرمائی۔

جلیل قدوائی

رجسٹرارس ہاؤس علی گڈھ

ڈیر جلیل!

ابھی خواجہ سرور[1] آئے تھے۔ میں نے اُن کے ساتھ کل موٹر سے لکھنؤ جانے کا وعدہ کر لیا ہے۔ لیکن سوچتا ہوں۔ وہاں سے واپس آکر دوسرے ہی دن مجھے اکیڈمی کے جلسہ میں الہ آباد بھی جانا ہوگا اور اتنی طویل مسافت میرے لئے واقعتاً تکلیف دہ ہو جائے گی۔ آپ اُن سے کہیئے کہ اگر "اس سفر میں مجھے ساتھ" نہ "لے چلیں" تو

"حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی"

خاکسار
سجاد

ہردوئی ــــ ستمبر ۱۹۲۹ء

ڈیر جلیل! سلام مسنون

آپ سے رخصت ہو کر بخیر ہردوئی پہنچا۔ "پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر" اس دفعہ سفر علی گڈھ "نون تیل لکڑی"

---

[1] خواجہ سرور حسن صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (کنٹب) بار ایٹ لا، دہلی۔ اس زمانہ میں خواجہ صاحب علی گڈھ میں تھے۔

ی کی نذر ہوگیا اور کسی سے ٹھیک سے نہ مل سکا۔ جب یہاں سے چلا تھا، یہ سوچ کر چلا تھا کہ اور کسی سے ملوں یا نہ ملوں
پ سے ضرور ملوں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آرزو پوری ہوئی اور آپ نے اس قدر مہربانی فرمائی کہ مسز جلیل سے بھی مجھے
ا دیا۔ میں اُن کی صفات و اخلاق کا بہت اچھا اثر لے کر آیا ہوں۔ خدا کرے آپ کی توقعات اُن سے پوری ہوں۔ علی گڈھ
ں مسز سجاد سے اکثر آپکی نسبت گفتگو رہتی تھی اور باوجودیکہ وہ آپکے بعض دوستوں کے سامنے آتی تھیں۔ وہ آپکے سامنے
س خیال سے نہیں آئیں کہ آپ بے پردگی کو معیوب سمجھیں گے۔ مگر افسوس آپ نے اس نظریہ کو غلط ثابت کیا۔ جب
سز سجاد علی گڈھ میں نہیں ہیں۔ مسز جلیل کو میرا سلام اور اس سے زیادہ دعائیں کہیئے۔
علی گڈھ[1] میں اُردو کے ایم۔اے اور آنرز کی کلاس کھلنا علی گڈھ کی روایات کے عین مطابق ہوگا اور وہ دن بہت
بارک ہوگا۔ جب ایسا ہو جائے۔ رہا آپ احباب کی یہ کوشش کہ مجھے علی گڈھ دوبارہ بلائیں۔ مجھے اس کی کامیابی
ں شبہ ہے۔ خداوندانِ یونیورسٹی ع .... ملاتے ہیں اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے

آپ کا چاہنے والا

سجاد

پورٹ بلیئر۔ انڈمان —— ۲۱-۷-۱۹۳۰ء

ڈیر جلیل! یہ تو آپ سُن ہی چکے ہوں گے کہ میں نے پھر ہندستان چھوڑ دیا۔ دو برس کے
ے جلاوطنی اختیار کرلی۔ یہاں فرصت ہے اور تنہائی۔ اس لئے کبھی کبھی شعر بھی کہہ لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں پہنچ کر جو
ھا ہے۔ اس میں سے کچھ پیش کرتا ہوں

قید خود اختیاری

ہوں مبارک دوستو دُنیا کی تم کو وسعتیں — میری قسمت میں فقط اک تنگئ زنداں رہ گیا
ہم کو کیا اہلِ خرد ہوں محوِ گل گشتِ چمن — "چل دیے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گیا"

انڈمن کا جزیرہ بہت بدنام ہے مگر یہاں عیش بھی ہے۔ کالے آدمیوں کے لئے جن کی قسمت میں محنت و مشقت کے سوا
ھ نہیں بلکہ انگریزوں کے لئے، اُن کی الگ آبادی ہے، بنگلے ہیں، سبزہ ہے، کلب ہے جس میں میمیں اور انگریز ہر طرف نظر آتے
یں، مگر ہندوستانی شاذونادر، میں بھی اس کلب میں شامل کرلیا گیا ہوں، مگر چونکہ نہ ناچنا آتا ہے نہ پینا۔ اُلو کی طرح بیٹھا
ہتا ہوں۔ اس پر ایک شعر کہا ہے ؎

واہ کس کے واسطے تو ہوگیا عشرت کدہ! — انڈمن کیوں ہند کا منحوس زنداں ہوگیا

---

[1] سجاد صاحب علی گڈھ کی یونیورسٹی کی رجسٹراری سے سبکدوش ہوکر ڈپٹی کلکٹری پر واپس جاچکے تھے۔ اُن کے بعض
حباب کی تجویز تھی کہ انہیں بہ حیثیت ریڈر اُردو ڈپارٹمنٹ واپس بلالیا جائے۔

میری سستی دیکھئے اب تک یونیورسٹی سے امتحان کا معاوضہ اور سفر خرچ میں نے وصول نہیں کیا اور مجھے تاریخیں بھی یاد نہیں۔ میں نے عظمت الٰہی[1] کو لکھا ہے۔ میرا ٹی۔ اے بل اور نیز زبانی امتحان کے معاوضہ کا بل بناکر بھیج دیجئے۔ نہایت ممنون ہوں گا۔ ایک میٹنگ اردو ڈپارٹمنٹ کی اٹنڈ کی تھی اور دوسری مرتبہ زبانی امتحان کے لئے علی گڈھ گیا تھا۔ تاریخیں وغیرہ آپ وہاں ریکارڈ دیکھ کر معلوم کر لیجئے گا۔

ہاں وہ نظم "آج تو مائل مقصود ہوا خوب ہوا" جو سیدین[2] کی شادی پر لکھی تھی "علی گڈھ میگزین" میں بھیج دی تھی۔ شائع ہو گئی تو میگزین کی ایک کاپی مجھے بھجوا دیجئے۔

نذر سجاد[3] نے نیرنگ خیال میں جو کچھ شائع کرایا وہ اضطراری طور پر تھا۔ مجھے شرمندگی کی وجہ نہیں۔ ہاں بہتر ہوتا اگر وہ نظم چھپنے سے پہلے کسی کو دکھائی گئی ہوتی۔ کم سے کم آپ کو دکھائی گئی ہوتی۔

آپ لوگوں کی یاد اور تذکرہ ہر وقت رہتا ہے۔ اسی پر کہا ہے ؎

سیدین و سرور و قدوائی کا ذکر و خیال　　　درد بھی یہ ہو گیا اور یہ ہی درماں ہو گیا

مسز جلیل کی خدمت میں آداب۔ میرا پتہ یہ ہے :۔

اسسٹنٹ ریونیو کمشنر۔ پورٹ بلیر۔ انڈمان

خاکسار :۔ سجاد

پورٹ بلیر۔ انڈمان —— ۹-۲-۱۹۳۱ء

مائی ڈیر جلیل! آپ کا محبت نامہ ملا۔ مدت کے بعد آپکی تحریر دیکھ کر بے حد خوشی حاصل ہوئی۔

میں خود آپکی موجودہ نوکری سے مطمئن نہیں ہوں مگر آپکو یہ مدِ نظر رکھنا چاہئے کہ یہ نوکری اس اصول پر کی گئی تھی کہ "خالی سے بیگار بھلی" ظاہر ہے کہ آپ تمام عمر اس نوکری پر بسر نہیں کر سکتے لیکن جو تجویز آپ نے لکھی ہے وہ ایسی نہیں کہ آپ اس پر فوراً عمل پیرا ہو جائیں۔ آپ نے جن ذمہ داریوں کی تفصیل لکھی ہے، میری رائے میں وہی آپکو موجودہ نوکری سے دستبردار ہونے سے روکنے کے لئے کافی ہیں۔ فرض کیا کہ آپ نے موجودہ نوکری چھوڑ کر دو سال میں ایم۔ اے (اردو) کر لیا۔ اس کے بعد؟ کیا یہ یقین ہے کہ آپکو ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں فوراً نوکری مل جائے گی؟ آج کل کی کشمکش کا اندازہ کرکے تو یہ خیال کرنا کچھ غلط نہیں کہ آپکو از سر نو وہی جدو جہد کرنی ہوگی جو بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کرنی پڑی تھی اور پھر نتیجہ متعین نہیں۔ میری رائے میں آپ موجودہ نوکری کو ہرگز نہ چھوڑیں (میں نہیں کہتا کہ آپ اس پر قانع رہیں) اگر کسی طرح سے یہ ممکن ہو کہ آپ اپنے عہدہ کا کام بھی کرتے رہیں اور بی۔ ٹی میں داخل ہو سکیں تو یہ کیجئے ورنہ پتّا مار کے محنت سے ایل ایل بی پاس کیجئے اور اور نوکریوں کے لئے بھی کوشاں رہیئے۔ اور اگر آپ کسی حال اور کسی صورت میں اپنے ارادہ سے باز نہیں آسکتے تو میرے نام دس روپیہ ماہوار لکھ دیجئے۔ بہر حال

---

[1] عظمت الٰہی زبیری حال رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ [2] خواجہ غلام السیدین صاحب بی۔ اے۔ ایم ایڈ (لیڈس) حال ناظم تعلیمات کشمیر۔ [3] نذر سجاد کی اس نظم کا پہلا مصرعہ یہ تھا :۔ "انڈمن جب سے مرا ہائے دل آرام گیا"

آپ جولائی میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ اس سے قبل میں انشاء اللہ واپس آجاؤں گا اور بالمشافہ آپ سے بحث کرونگا۔
خواجہ سیدین اور خواجہ منظور[1] کے متعلق خوش خبری سُن کر دو تین شعر بے ساختہ قلم سے نکل گئے ہیں۔ وہ ملفوف ہیں۔ انہیں پہنچا دیجئے گا۔
میری تسلیم مسز جلیل کی خدمت میں عرض کر دیجیئگا مسز سجاد آپ کو اور مسز جلیل کو سلام کہتی ہیں۔
یہ تینوں شعر علی گڈھ میگزین کے ایڈیٹر صاحب کو دے دیجئے گا۔ اگر پسند کریں تو میگزین میں شائع کر دیں۔
سجاد

گورکھپور (یو۔پی) —— ۱۶-۱۱-۱۹۳۱ء
مائی ڈیئر جلیل! عنایت نامہ کا شکریہ۔ میں یہاں پہنچ گیا ہوں مگر ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوا۔ مکان کی بہت دقت ہے۔ ایک بنگلہ ملا ہے جن میں ایک اور صاحب آدھے کے شریک ہیں۔ بلکہ شریک غالب۔
علی گڈھ سے غازی پور اس قدر دور ہے کہ تین دن کی چھٹی سے کم میں علی گڈھ آنا جانا اور وہاں کسی میٹنگ میں شریک ہونا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے مجھے خوف ہے کہ کورٹ کی میٹنگ میں بھی شریک نہ ہوسکونگا۔ اگرچہ میں کوشش کرونگا کہ شریک ہوسکوں۔ اگر کورٹ کی میٹنگ میں شریک ہوا تو دوسرے روز یعنی دوشنبہ کو یہاں نہیں پہنچ سکتا۔
خلیل احمد[2] صاحب مراد کو میں نے اطلاع دی تھی کہ اولڈ بائیز ڈنر میں بھی نہیں آسکتا۔ بال بچوں کو لئے بے ٹھکانے بنگلے میں پڑا تھا۔ غرض کہ گو ہندوستان آگیا مگر علی گڈھ سے دُور ہی رہا ع
آکے منزل کے قریں واردِ منزل نہ ہوئے
بچّی کی ولادت سے بے حد خوشی ہوئی۔ خدا اُسے پروان چڑھائے اور آپ اس کی سیکڑوں خوشیاں دیکھیں۔ میں اس روپیہ سے زیادہ اگر نکال سکتا تو بخوشی نکالتا۔ میں بہت جلد سبکدوش ہونے سے پیشتر طبی فرلو لینے والا ہوں۔ غالباً ایک سال کے بعد فرلو لوں گا۔ اس وقت تنخواہ آدھی ہوجائے گی اور ذمہ داریاں یہی قائم رہیں گی۔ میں تو ہندوستان چھوڑ کر قسطنطنیہ جانا چاہتا ہوں۔
خاکسار —— سجاد

غازی پور —— ۴-۶-۳۱ء
مائی ڈیئر جلیل! آپ کا عنایت نامہ ملا تھا۔ جواب تاخیر ہوئی۔ معاف! میں جس تاریخ سے کہیئے آپکو روپیہ بھیجنا شروع کردوں۔
میرے بھائی سید وحید الدین حیدر آباد میں سول سرجن ہیں۔ امید ہے آپ اُن سے ملے ہوں گے۔
خاکسار
سید سجاد حیدر

جلیل احمد قدوائی صاحب اناؤ

---

[1] خواجہ منظور حسین صاحب ایم۔اے (آکسن) علی گڈھ یونیورسٹی۔ [2] موصوف علی گڈھ یونیورسٹی میں شعبہ طبیعات ڈیمانسٹریٹر ہوئے ۔۔۔ علی گڈھ اولڈ بائیز ایسوسی ایشن کے سکریٹری تھے۔

غازی پور ـــــ ۱۳ - ۱۲ - ۳۳ء

مائی ڈیر جلیل! چونکہ آپ نے اپنی کامیابی کی خوشخبری کی مجھے اطلاع نہیں دی تھی اس لئے جب مدتوں کے بعد آپ کا خط آیا تو مَیں نے بھی چپ سادھ لی۔

آپ کا اُردو میں ایم-اے ہونا آپ کے لئے کوئی ایسی بات نہیں جس کی مبارکباد دی جائے۔ ہاں الہ آباد یونیورسٹی کے لئے قابلِ مبارکباد ہے کہ اس کے ہاں سے شاید پہلا (حقیقی معنوں میں) اُردو کا اسکالر ایم-اے ہُوا۔

یہ خط میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپکو اطلاع دوں کہ مَیں خدا خدا کر کے غازی پور سے چھٹکارا حاصل کر رہا ہوں۔ ۲۴ر دسمبر ۱۹۳۳ء سے آٹھ مہینے کی چھٹی پر جا رہا ہوں۔ فلسطین، شام، ٹرکی کی سیاحت مدّنظر ہے۔ خدا پوری کرائے روانہ ہونے سے قبل آپ لوگوں سے ملنے علی گڈھ بھی آؤں گا۔

خواجہ منظور صاحب اور خواجہ غلام السیدین صاحب سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ مسز جلیل کی خدمت میں آداب!

خاکسار: ـــــ سید سجاد حیدر

اٹاوہ ـــــ ۲۱-۱۱-۳۴ء

مائی ڈیر جلیل! ـــ عنایت نامہ کا شکریہ! جواب دیر میں دینے کی معذرت نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ آپ کا خط بھی دیر میں آیا تھا۔ جن ذمہ داریوں کا ادا کرنا زیادہ ضروری ہے۔ بے شک انہیں پہلے ادا کرنا چاہیئے۔ میرے لئے جلدی نہ کیجئے۔ مَیں کورٹ کی میٹنگ میں آنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انشا اللہ اس وقت ملاقات ہوگی۔

خاکسار: سجّاد

شمس العلماء کے خطاب پر تاجور نجیب آبادی کو مبارکباد کا خط[1]

جنابِ مولانائے مکرم! ـــــ مَیں بیان نہیں کر سکتا کہ آپ کا نام فہرستِ خطابات میں دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی۔ آپ شمس الادباء تو پہلے ہی تھے۔ اب شمس العلماء بھی ہو گئے۔ یعنی گورنمنٹ کے نزدیک ورنہ ہم تو شمس الادباء و شمس العلماء و شمس الشعراء آپ کو مانتے چلے آئے ہیں۔

میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں!

خاکسار
سید سجاد حیدر (یلدرم)

سر محمد یعقوب کی وفات پر قاضی عبد الغفار کے نام تعزیت نامہ

تمہیں میں تعزیت نامہ کیا لکھوں۔ ہمدم دیرینہ کی یاد میں تعزیت بھی ہے اور دوستوں کو چھوڑ کر چلے جانے والے دوست کے نام ایک پیام بھی...... سر یعقوب مرحوم کی قوم پرستی کی نہیں، احباب پرستی کی یاد مجھے تڑپا رہی ہے۔

۱۲ر دسمبر ۱۹۴۲ء

تمہارا ـــــ سجاد

---

[1] شاہ کار - لاہور - اگست ۱۹۴۰ء

کلام

مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں!

ہو وطن سے کبھی جدا نہ کوئی — گھر سے بے گھر ہوائے خدا نہ کوئی
درد غربت سہا نہیں جاتا — رنج فرقت کہا نہیں جاتا
یاد احباب کی جو آتی ہے — دل میں اک درد سا اُٹھاتی ہے
بی بی بچّوں کا آگیا گر دھیان — سینہ کوبی سے ہو گئے ہلکان
گھر کے نقشے کا دل میں پھر جانا — اس کا سو سو جتن سے پھر جانا
گھر سے بے گھر جو کوئی ہو جائے — عیش و آرام اس کا کھو جائے
نئی دُنیا، بشر نیا دیکھے — گویا عالم ہی دوسرا دیکھے
الغرض یہ مصیبت ایسی ہے — ساری دُنیا کے غم ہیں کم جس سے

اب سُنیں صاحباں ہوش و ذکا! — اک نیا ماجرا نیا قصّہ!
ایک صاحب اودھ میں رہتے تھے — مرزا پھویا، سب ان کو کہتے تھے
کیا کہوں تھا کہاں چمن ان کا — لکھنؤ تھا کبھی وطن ان کا!
گھر سے نکلے نہ تھے وہ ساری عمر — گویا بھونرے ہی میں گزاری عمر
اپنے ماں باپ کے دلارے تھے — اور عزیزوں کے وہ پیارے تھے
خیر سے تھا ابھی شباب شروع — عمر کا بیسواں تھا باب شروع
رات دن کھیلتے مگر پھرتے — سارے گھر والے "بچّہ" کہتے تھے
باتیں کرنے میں بھی لجاتے تھے — غیر شخصوں سے سہم جاتے تھے
عیش سے دن مگر گزرتے تھے — نہ کسی کا خیال کرتے تھے!
چین تھا دن کو، لطف راتوں میں — وقت کٹتا تھا یوں ہی باتوں میں!
کہ فلک ہو گیا خلل انداز — تجھ سے سمجھے خدا! اے دم باز!
دُور پھینکا وطن سے ہائے غضب — آخر اس دشمنی کا کوئی سبب؟

اس کی تفصیل اس طرح سُنیے — دردِ مرزا کی پھر دوا کیجیے!
قوم میں سب سے اعلیٰ و ادنیٰ — مُحسن الملک، مُحسن الدولہ!
دردِ قومی کے اس معالج نے — یعنی سکریٹری کالج نے
اپنے احباب کی معیت سے — اور مشاہیر کی جماعت سے
سارے شہروں کا جب کیا دورہ — لکھنؤ بھی مشرف اس سے ہوا
دُھوم تھی اک فصیح آیا ہے — نیچری فوج ساتھ لایا ہے!
وقتِ تقریر اس کا طرزِ بیان — گہ شرر بار، گاہ نُور فشاں!
جادو کرتا ہے، سحر کرتا ہے — مہر کرتا ہے، قہر کرتا ہے!
گہ ہنساتا ہے گہ رُلاتا ہے — کچھ عجب ڈھنگ اس کو آتا ہے
جب ہوئے ان کے دوست سارے بضد — تب تو مرزا کے والدِ ماجد
جا کے جلسے میں خود شریک ہوئے — سارے لکچر بغور اُنہوں نے سُنے
کر گیا ان پہ جادو اپنا کام — تھا علی گڈھ کا ہی زبان پر نام
ایک دم یہ تہیہ کر بیٹھے — بس علی گڈھ میں جا کے مرزا پڑھے
اس ارادے کو جب کہا گھر میں، — پڑ گیا رونا پیٹنا گھر میں!
چیخی مرزا کی ماں کہ ہائے ہائے — کوئی جاکر ذرا انہیں سمجھائے!
ان کو تو ہو گیا ہے کچھ سودا — سوچتے ہی نہیں بُرا و بھلا
میرا بچّہ نہ جائے گا کوئل! — میرا پتھر کا تو نہیں کچھ دل
نہ انہوں نے سُنی کسی کی بھی — اپنی ضد ہر طرح سے پُوری کی
دے دیا حکم "جائے مرزا کل" — ہائے! یہ حکم تھا پیامِ اجل
جُوں جُوں ہوتی سفر کی تیاری — اُن پہ ہوتی تھی زندگی بھاری
وقتِ رخصت تھا مرزا پر — چاہتے تھے مروں میں پھوڑ کے سر
کچھ بھی لیکن نہ کرتے دھرتے بنا — باپ نے جو کہا، انہوں نے کیا
خالہ ماں، مومانی، بھابی جان — اپنے مرزا پہ سب ہوئیں قربان
یاالٰہی یہ خیریت سے پھرے — اور دشمن پہ اس کے بجلی گرے
واسطہ مرتضیٰ علی کا تجھے! — جلد لا کر ملائیے ہم سے!
اشک برسا کے دیدۂ تر سے — کیا کہوں مرزا چل دیئے گھر سے
[illegible] — آہ بر لب درود، سینہ فغاں!

ایک ہفتہ تو کاٹا رو دھو کر ‌ ‌ ‌ بعدہٗ ہر طرح سے زچ ہو کر
اک عریضے کی یوں بنا ڈالی ‌ ‌ ‌ قبلہ ام مدظلہ العالی!
اوّلاً مجرا عرض کرتا ہوں ‌ ‌ ‌ حال پھر اپنا عرض کرتا ہوں
ہو کے رخصت جناب سے پہنچا ‌ ‌ ‌ کیا کہوں اس جگہ پہ کیا دیکھا
یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جدا ‌ ‌ ‌ ایسا دیکھا کبھی، کبھی نہ سنا
جنس ہر اک نئی، دکان نئی، ‌ ‌ ‌ اور تو اور، ہے زبان نئی!
ایک "دال" ایک "گوشت" کہتے ہیں ‌ ‌ ‌ جانے کس دیس میں یہ رہتے ہیں
ہوں پریشاں تو "آپا" فرمائیں ‌ ‌ ‌ خوش ہوں گر تو "ہیر ہیر" یہ سنائیں
گر ہوا اچھا لباس "ٹھاٹ" کہیں ‌ ‌ ‌ اور گنواروں کو "راج گھاٹ" کہیں
تو تنعم کی ہو ذرا سی بھی ‌ ‌ ‌ اس کو کہتے ہیں یاں "عیاشی"[1]
عمدہ کھانا کھلانا عیاشی ‌ ‌ ‌ عمدہ شربت پلانا عیاشی
عطر میں گر جو کپڑے بسائیں ‌ ‌ ‌ فوراً عیاش آپ یاں کہلائیں
کورنش، مجرا، بندگی، آداب ‌ ‌ ‌ سب کی یاں ہو گئی ہے مٹی خراب
ان کے بدلے ہے بس سلام علیک ‌ ‌ ‌ گویا لے ڈھیلا کھینچ مارا ایک
دوڑتے، کودتے، اچھلتے ہیں ‌ ‌ ‌ بھول کر بھی نہ سیدھے چلتے ہیں
کوئی مارے پھلانگ تو یہ خوش ‌ ‌ ‌ ٹوٹ جائے جو ٹانگ تو یہ خوش
گیند بلاّ، سواری اور فٹ بال ‌ ‌ ‌ یہ یہاں کے ہیں کھیل، یہ اشغال
گر پڑے کوئی گر تو خوش ہو جائیں ‌ ‌ ‌ اور پھر خوب خوب تالی بجائیں
صبح ہوتے ہی کرتے ہیں ڈمبیل ‌ ‌ ‌ نہ جبیں پر شکن، نہ دل پر میل
صبح تڑکے، ڈرل کراتے ہیں ‌ ‌ ‌ ایسے بے رحم ہیں تھکاتے ہیں
جو قواعد کراتے ہیں سب کو ‌ ‌ ‌ کیا دعا دوں میں ایسے بے ڈھب کو
ہو گئی میری جان بھی بے کل ‌ ‌ ‌ جب وہ چیخے "بریک ان ٹو ڈبل"
حکم ہے وقت پر ہی کھانا کھاؤ ‌ ‌ ‌ شام کو جمع اک جگہ ہو جاؤ!
بھوک ہو یا نہ ہو نہیں پروا ‌ ‌ ‌ ہے اسی وقت ٹھونسنا پڑتا!

---

[1] یہ اصطلاحات وہ ہیں جو میرے زمانۂ علی گڑھ میں رائج تھیں۔ غالب اب بھی ہوں گی۔ چونکہ مرزا پھوپا میرے زمانۂ کالج میں تشریف لائے تھے۔ لہذا انہیں اصطلاحات کا ذکر کیا گیا۔ (سجاد)

یاں کی آزادی ہے بہت محدود ۔۔۔ شہر جانا بھی ہو گیا مسدود
اس لئے عرض ہے کہ یہ چیزیں ۔۔۔ لکھنؤ سے روانہ آپ کریں
ایک ڈبیہ دیا سلائی کی، ۔۔۔ پوڑیا ایک نیلی روشنائی کی
اک برُش جوُتہ صاف کرنے کا ۔۔۔ اور برانکو بھی ساتھ تھوڑا سا
بُوٹ کے لیس کی ضرورت ہے ۔۔۔ اور موزے بھی چند اچھے سے
دو گھڑے اک صراحی، پیالے چار ۔۔۔ اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار!

اور باقی تو خیریت ہے سب
سب کو تسلیم زیادہ حد ادب!

شملہ کالکا ریلوے پر ایک نظّارہ

ماتھے پہ بندی ۔۔۔ آنکھوں میں جادو
ہونٹوں کی بجلی ۔۔۔ گرتی تھی ہرسُو
چال لچکتی ۔۔۔ بات بہکتی
جیسے کسی نے ۔۔۔ پی ہو دارُو!
آنکھڑیاں ایسی ۔۔۔ جن میں تھے رقصاں
لمحہ میں رادھا ۔۔۔ لمحہ میں راھو!
ایسی پھڑک تھی ۔۔۔ خلق تھی حیراں
ریل پہ آیا ۔۔۔ کہاں سے آہو!

نغمۂ مسرّت

گُل ریز ہے دشت و دمن ۔۔۔ گُل پاش ہے صحنِ چمن!
ہر سُو طرب جلوہ فگن! ۔۔۔ صوفی بھی ہے کیا شوخ دہن
آئی بہار اب پھر چمن، ۔۔۔ ہے بلبل و گل کا وطن
دیر و حرم سے نعرہ زن ۔۔۔ آئے ہیں شیخ و برہمن

یاں جو ہے وہ گُل پیرہن — رنگین بیان رنگین سخن!
ہاں مطربا! بربط بزن! — ساقی! مرا از پا فگن
زاہد سے کہدو یہ سخن — ہے فصلِ گُل توبہ شکن
گر چاہیے عیشِ جان و تن — مے خواروں کے سیکھے چلن

اس شہر کے پیر و جوان — ہیں خوش لقا و خوش بیان
یہ دل ربا و دل ستان — دل باختہ دل دادہ آن!
لیلیٰ طبع، مجنوں وشان — مہر و وفا کے رازدان!
دل، دار بام و آستان — دل دار ہر اک مرد و زن

اک دشمنِ ایمان و دیں، — ثانی نہیں جس کا کہیں
چنگیز جس کا خوشہ چیں، — مذہب ہے جس کا غیظ و کیں
ایسا شقی اک نازنیں، — وحشت فزا قہر آفریں!
خوں ریز جس کی آستیں — قاتل کی جس کی بھبن!

خنداں و خوش آیا یہاں، — مسرور تھا اور شادماں
رُخ پہ مسرت تھی عیاں — لب پر خوشی کی داستاں
تیر و تبر تیغ و سناں — رکھ کر ہُوا سجدہ کناں
کرنے لگا وردِ زباں! — شکرِ خدائے ذوالمنن

جب شادیاں ہوں ہر طرف — جب رنج و غم ہو برطرف
خوشیاں کھڑی ہوں صف بہ صف — ہر شخص ہو جب زر بکف
ہے باعثِ عز و شرف، — گر چھوڑ دوں اپنا شغف
یوں ہاتھ میں چنگ اور دف، — کیا خوب ہے مطرب کا فن

یہ سب تو اک افسانہ تھا — تخئیل کا کاشانہ تھا
رندانہ تھی طرزِ ادا — دل میں ہے حرفِ مدعا

گو سب نے سُنائی واہ وا | ہے مگر اب وقتِ دعا
مقبول ہو نزدِ خدا، | مقصد نہیں شعر و سخن

کہتے ہیں سب گردوں نشیں | کہتے ہیں سب اہلِ زباں!
ہو آج تم الفت قریں | اے میرے نوشہ آفریں!
اے قیس کے طینت گزیں | اک لیلیٰ محمل نشیں!
گھر میں تمہارے ہو مکیں | با عفت و با علم و فن

ایک نکاحِ ثانی پر

جگر سوز آہیں و دل بے قرار | وہ لب پر فغاں آنکھ وہ اشک بار
وہ اندوہ و حرماں نگاہوں سے پیدا | رُخِ زرد سے زعفراں شرم سار
وہ بیدادِ محبوب سے دل کے ٹکڑے | جفا ہائے پیہم سے سینہ فگار
وہ ماہِ دو ہفتہ کی اندھیر دُنیا | وہ رشکِ چمن ہے خزاں در کنار
وہ کانٹوں میں شبہائے ہجراں گذارے | جسے آہ سب کہتے ہیں گلِ عذار
مگر یہ عقیدہ تمہارا یہ مسلک | جسے آج تم نے کیا آشکار

زنِ نو کن اے یار ہر نو بہار
کہ تقویمِ پارینہ نیاید بکار

جُرأتِ رندانہ

رنگین شگوفہ ہے کہ چمن زار ہے | اسبابِ ذوق و شوق فزوں از شمار ہے
ہر دم ہوائے عشق سے دل بیقرار ہے | ساقی! زمانِ عیش و مے خوشگوار ہے
دردی کشو پیو کہ یہ فصلِ بہار ہے
بانگِ طربِ ترانۂ الفت صدائے سِتار | عاشق کے دل کا جوش ہے یا نغمۂ ہزار

ہے مژدہ پاش عشق یہ آہنگِ جوئبار — بُجھے نسیم و رنگِ گُل و رونقِ بہار!

سامانِ فضل و رحمتِ پروردگار ہے

غم کا خیال چھوڑ کہ پایانِ غم نہیں! — دُنیا میں کون ہے جسے رنج والم نہیں!

لا جام ساقیا! کہ کچھ جم سے کم نہیں! — کیوں آج تیرا کل سا دستِ کرم نہیں!

رکھ یاد تیرا وقت بھی ناپائیدار ہے

مسجد کی مجھ کو کچھ بھی موافق نہیں ہوا — کوچہ سے تیرے مَیں تو نہ جاؤں گا ساقیا

فردوس بھی ملے تو نہ چھوڑوں گا میکدہ — وہ وقتِ زہد و موسمِ ریب و ریا گیا

ہنگامِ عیش و عشرت و کشت گداز ہے

ایک درخواست

مَیں ہُوں اور امتحانِ جذبِ دل! — تم ہو اور کاوشِ گمانِ آرزو!

رشتۂ قہر چھوڑو مہر کو لو! — دونوں ہوں سینہ ریشِ قلب گداز؟

کیوں تمنائیں دل میں گھٹ کے رہیں؟ — کیوں دلوں کا نہ ہو دریچہ باز؟

کیوں بسائیں نہ ملکِ یک رنگی؟ — چھوڑ دیں کیوں نہ شہرِ ناز و نیاز؟

کس لئے لُوں میں راہِ ترکستان؟

ہو اگر تم کو شوقِ سیرِ حجاز؟

دُعا

(ایک ناکتخدا عزیزہ کے لئے جو اس کے آٹوگراف البم میں لکھی گئی)

ہمیشہ بن کے نگہ چشمِ مادمن میں رہو — عزیز ہو کے صدا مصرِ علم و فن میں رہو

جبیں پہ بل ہو کبھی گر تو زلف کا بل ہو! — چھپو کسی سے تو بُو ہو کے یاسمن میں رہو

شگفتہ خاطر و دل شاد انجمن میں رہو!

"بہار ہو کے رہو' جا کے جس چمن میں رہو"!

رُخصتِ شباب

وہ جنوں انگیزیاں رخصت ہوئیں | عقل سے وہ سر مساری اب کہاں!
ہائے وہ پینا پلانا رات دن | اب کہاں وہ خیر جاری اب کہاں:
اب کہاں وہ زہد اور تقویٰ سے بیر | شوقِ رُسوائی و خواری اب کہاں!
بزمِ حُسن و عشق ہے اب بھی جمی | بار یابی پر ہماری اب کہاں!
چل رہے ہیں اب بھی گو نظروں کے تیر | آرزوئے زخم کاری اب کہاں!
لہلہائے لالہ زارِ داغِ دل، | عشق کی وہ کشت کاری اب کہاں!
رہ نمائی رہ بری کا شوق ہے | رہ روی کی خواستگاری اب کہاں!

ہم رکاب اتقا آئی ریا!
صدق کی وہ استواری اب کہاں!

قیدِ خود اختیاری

(۱)

ہوں مبارک دوستو! دُنیا کی تم کو وسعتیں | میری قسمت میں فقط اک تنگ زنداں رہ گیا
ہم کو کیا اہلِ خرد ہوں محوِ گلگشتِ چمن | "چل دیے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گیا!"

(۲)

راحت کی تمنائے کم انجام بہت ہے | یعنی کہ مجھے بھی ہوسِ کام بہت ہے:
لیکن کبھی کوشش سے نہ حاصل ہوئی جو شَے | وہ تیرے لئے اب دلِ ناکام بہت ہے

"نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں!
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے"

اپنی بھتیجی کی کدخدائی کے موقع پر!

(۱)

چناں بر زمیں زہرہ آمد ز چرخ، | خمید و چمید و دمید و رمید!
چو پرسیدم از وے حالت، چہ گفت | چرا من نہ رقصم بطرزِ جمید!
زبس منتظر بودم ایں روز را، | ز الطاف حق آخر آمد پدید

(۲)

آج نقیب گل عذار، دیکھ رہا ہے بار بار | اس پہ کروں گا ناشئیں، شیخ حرم ہو ہوشیار،
توبہ شکن ہوئے فروش، چار طرف ہے ناؤ نوش | شرع ہیں کا کس کو ہوش کیوں نہ ہوں میں بھی میگسار
گرچہ رہا میں غم بدوش، آہ نہ کی رہا خموش | کعبۂ دل سیاہ پوش، جاں حزیں سوگوار
آج مگر وہ آگیا، خانۂ دل بسا گیا | رُوح پہ میری چھا گیا، آج میں ہوں بختیار
مجھ کو خوشی ایک اور ہے، لانا تو ایک جام مے | بخت کیاں و تاج کے، اس خوشی پہ سب نثار
بنت نصیر نکتہ داں، صاحب علم بے کراں | مایۂ نازِ دختراں، علم و حیا کی تاجدار

ملک وفا کا تخت و تاج اس کو ملا بہ ایں قرار
اس کا نصیب کامگار، اس کا زمانہ سازگار!

نذر خواجگان!

(خواجہ منظور حسین اور خواجہ غلام السیدین کے اساتذۂ جامع علی گڑھ مقرر ہونے پر)

دو عزیزوں کو مرے آخر ملا ہے ان کا حق | کل تھے جن رتبوں پہ وہ آج ان سے بہتر ہو گئے
ایک منظور حسین اور اک غلام السیدین | اس لئے دنیا میں وہ محبوب دلبر ہو گئے
مرحبا ذوق طلب صد مرحبا ذوق عمل! | دونوں بحر علم کے کیسے شناور ہو گئے

طالبانِ علم! دیکھو طالبانِ علم کو
علم کی خدمت سے سردار و سرور ہو گئے!

ایک بُت پرست محمود

(نظم بہ تقریب شادی خانہ آبادی جناب خواجہ غلام السیدین)

آج تو مائل مقصود ہُوا خوب ہُوا
اپنے ہم چشموں کا محسود ہُوا خوب ہُوا

ثروت و علم کا ہے آج قران السعدین
علم ثروت پہ جوا فزود ہُوا خوب ہُوا

مائل عشق ہے جو آج پروفیسر ہے
علم کا عشق جو مقصود ہُوا خوب ہُوا

آجتک کوئی بھی کیوپڈ سے بھلا جیتا ہے
اس سے لڑنا ترا بے سود ہُوا خوب ہُوا

زاہد خشک ہُوا معتکف بیت صنم
بت پرست آج جو محمود ہُوا خوب ہُوا

سچ تو یہ ہے کہ یہی کیوں نہ کہے اب سجاد
قصر ساجد ترا مسجود ہُوا خوب ہُوا!

دیکھا نظارا ہم نے تمہارا

(ٹرین میں ایک ہم سفر عائلہ (فیملی) کی مسرّت دیکھ کر)

دیکھا نظارہ ہم نے تمہارا

دل کی محبت آہ یہی ہے
عشق کی جنّت آہ یہی ہے

اصلی ثروت آہ یہی ہے
حق کی رحمت آہ یہی ہے

دیکھا نظارہ ہم نے تمہارا

دیکھا نظارہ ہم نے تمہارا

پریم کے پھل دو تین تمہارے
چنچل، میٹھے، مدبھرے سارے

بھولے بھالے، شکل میں پیارے
جن و ملک سب جن پر وارے

دیکھا نظارہ ہم نے تمہارا

دیکھا نظارہ ہم نے تمہارا

لہریں ہے کیا مہر کا دریا جوش میں آیا، اچھلا امڈا!
عشق و محبت ان کا حصّا گر نہیں دولت کچھ نہیں پروا
دیکھا نظارہ ہم نے تمہارا

دیکھا نظارہ ہم نے تمہارا

رشک کروں اور ان کو دیکھوں ہائے یہ جنت کیسے پاؤں!
ساتھ ہے جنت لیکن میں ہوں بادلِ محزوں اس سے بیروں
دیکھا نظارہ ہم نے تمہارا

ترانۂ شوق

خوئے کافر، اور دین اسلام ہو، پروا نہیں، مے گُساری اس کا شغل عام ہو، پروا نہیں
سنگدل ہو، گرچہ گل اندام ہو، پروا نہیں وہ پری رو جس طرح ہو رام ہو، پروا نہیں
گر سویرے کو نہ ہو، تو شام ہو، پروا نہیں!

کیوں لبادوں جا کے میں، جنت میں اب صحرا و راغ کلبۂ تاریک جب روشن کرے وہ شب چراغ
سیرِ سنبل کے لئے کیوں ہو ہوائے سیر باغ! مو پریشاں، سینہ عریاں آئے جب وہ بد دماغ
گر نہیں صحن چمن حمام ہو، پروا نہیں!

غنچۂ نازک نہیں ہے لعلِ نسریں کی طرح نغمۂ بلبل ہے کب گفتارِ شیریں کی طرح!
سنبل و ریحاں کہاں اس زلفِ پُرچیں کی طرح اے بتِ عطار، تیرے حالِ مشکیں کی طرح!
عنبرِ سارا تو ہو، کچھ خام ہو، پروا نہیں

تیرا سینہ صاف اور شفاف ہے آئینہ دار ہائے! ہے کس کے لئے اس جسمِ عریاں کی بہار
کیوں رہے باقی، مرے اور تیرے پیرہن کا تار بھر کے پیالے، پی تو لے دو چار لے مستِ خمار
تیرا ملنا تشنۂ ابرام ہو، پروا نہیں

یہ نہیں کافی کہ ہو وہ لعلِ شکر بار نرم! مثلِ طوطی شیوۂ دلکش ہو اور گفتار نرم
ہو طبیعت نرم، چاہے ہو نہ ہو رخسار نرم خونِ دلبر گرم ہو، اطوار اور رفتار نرم!

مُبتلائے جام و مئے آشام ہو پروا نہیں

خواب تیرے عاشقِ شیدا کو اب نایاب ہے　　شوق میں آغوش وا ہے، کس قدر بیتاب ہے

رائیگاں جانے نہ دے، یہ رات کیا مہتاب ہے　　عید گزری آج ہی آہ تو تو عالم تاب ہے

صبح گر آنا نہ ہو، تو شام ہو، پروا نہیں

بُلبُل از ترکی

نہالِ گل میں جو تیرا مکان ہے، اے بُلبل!　　تو پھر یہ کس لئے شور و فغاں ہے اے بُلبل!

خروشِ جوئے بہاری ہے، یا ہے خندۂ گُل　　تو کس کے واسطے نالہ کناں ہے اے بلبل!

تو تازہ برگ ہے اور غنچہ جلد بکھرے گا　　ترے نصیب میں عیشِ جہاں ہے اے بلبل!

خطیبِ منبرِ عرفاں ہے تو حقیقت میں،　　تری نوائے سحر اک اذاں ہے اے بلبل!

روا ہے گر کہیں تیری نوا کو سحرِ حلال　　جو دل میں گھر کرے تیرا بیاں ہے اے بلبل!

عجب نہیں جو یہ پوچھیں کہ تجھ سے غنچۂ دہن　　بتا کہ کیا ترا دردِ نہاں ہے، اے بلبل!

کسی کو عشق کی تیرے خبر نہیں افسوس!

مرا قلم ہی ترا ترجماں ہے، اے بلبل!

لکھنؤ ٹریننگ کالج کے مشاعرہ کی صدارتی نظم

کیوں مجھ کو کیا ہے صدرِ مجلس؟　　کیوں مجھ کو عطا ہوئی یہ جاگیر؟

جب دیکھئے تخت پر ہوں بیٹھا!　　منبر پہ ہو جیسے واعظِ پیر!

مانا کہ ہے میرا نالہ دل کش!　　ہے دل میں تڑپ زباں میں تاثیر!

رنگینی بھی ہے سخن میں ایسی،　　ہوتا ہے جوان عالمِ پیر!

ہے توسنِ طبع شوخ و طرار　　چال اس کی کڑی کمان کا تیر!

لیکن نہیں شاعری کا دعویٰ　　ہاں نثر میں کچھ کیا ہے تحریر!

[illegible]　　کیا ہیچ مداں کی ہیچ تحریر!

ہوں شاہدِ شعر کا مَیں شیدا
بس اس لئے ہے میری یہ توقیر

صد شکر ز سعیٔ نوجواناں،
یک قصرِ ادب شدست تعمیر

اس بزم میں ایک ادیبِ کہنہ
کیوں لائے ہیں آپ بہرِ تشہیر

تھا گوشۂ انزوا میں مخفی!
کیوں کھینچ کے لائے پا بہ زنجیر

ممنونِ کرم ہوں لیکن اب تو
ہے تیسری مرتبہ یہ تعزیر

رسم است کہ شائقینِ تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر!

غزل

بنے ہیں ہونٹ مرے نالہ و فغاں کے لئے
ہے سینہ وقف مرا سوزشِ نہاں کے لئے

کوئی زمانہ کا شاکی، کوئی فلک کا ہے
ہمارے سارے گلے اپنے مہرباں کے لئے

ہلاک کرکے رہے گا مجھے تغافلِ دوست
ہے اک نگاہ کا اغماض نیم جاں کے لئے

ہو ڈھونڈ ڈھونڈ کے سب مجھ پہ مشق اے احباب
رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

ہوئے جو طعنۂ اعدا کبھی ذرا کو بند
زباں سے کام اعزا نے خود سناں کے لئے

کڑک چمک تو اے برق اس سے کیا حاصل!
شرارہ ایک تھا کافی اس آشیاں کے لئے

مرا جو حصّہ ہے وہ مجھ کو اے مصیبت دے
ہوا کرے، ہے اگر عیش کل جہاں کے لئے

چمن میں بلبلِ مہجور کی نہیں کچھ یاد،
تڑپ رہی ہے قفس میں بوستاں کے لئے

بھلا دے یادِ وطن جب میں جانوں اے غربت
وطن کا عشق ہے اک روگ میری جاں کے لئے

عزمِ حجاز

وحشت کو میری دیکھنا ہمدمو ذرا!
صحرا کو چل دیا درِ جاناں نہ چھوڑ کر!

افسوں تخیلات کا مجھ پر رہا مدام،
دیکھا نہ اصل کو کبھی افسانہ چھوڑ کر!

تھا میں اسیرِ حلقۂ زلفِ بتانِ ہند — لیلیٰ سے منہ کو موڑ کے ریحانہ چھوڑ کر
لیکن ہُوا ہوں جب سے کرمِ عازمِ حجاز — احباب کا وہ لطف کریمانہ چھوڑ کر
سب عزّ و جاہ و راحت کا شانہ چھوڑ کر — سب حرصِ زر پہ ہمتِ مردانہ چھوڑ کر
تو سُن رہا ہوں چاروں طرف سے یہی صدا — "دیکھو تو گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر!
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ"!

کعبے کے سامنے

آوارہ گرد آج ترے در پہ ہے کھڑا — اللہ کیا کشش ہے ترے آستانے میں
تشکیکِ شبۂ دشمنِ ایماں ہی رہے — سُنتا ہوں دل کا چین ہی تیرے خزانے میں
صحرائے بے گیاہ ہی اور کوہ ہائے خشک — کیا رمز تھا یہاں چمنِ دیں کھلانے میں!
دل کو نہ جب خشوع و خضوع ہی ہُوا نصیب — کیا فائدہ ہِلا مجھے سر کے جھکانے میں!
احرام و طوف سارے ظواہر تو مِل گئے — اے کاش اور کچھ بھی ملے اس ٹھکانے میں!
مسلم کو جس طرح سے ستاتے ہیں اہلِ دیر — ہے پاسبانِ حرم کا بھی ماہر ستانے میں!
رنگینِ حجاز ترک عرب کے لہو سے تھا — کوشاں ہے بخدا اور اسے رنگیں بنانے میں!
یہ سب تو ہے مگر مرے اللہ یہ نہ ہو! — اغیار دخل پائیں ترے آستانے میں!
واقف ہے تو کہ درد بھرا ہے ہمارا حال — کیا تیرے آگے درد بھروں اس فسانے میں!

طیارہ کامران پہ ہے جدّہ پہ ہے جہاز
تو اپنے گھر کو خود ہی بچا اس زمانے میں!

شہیدانِ سیاست

کوئی میری تعریف کرتا نہیں — کروں میں تو خود آپ اپنی کروں
مرے دل میں ہے شوقِ جنگ و ستیز — نہیں مجھ کو پروائے صلح و سکوں

نہیں منطق و فلسفہ سے غرض　　نہیں جانتا ہیں بہت چند و چوں

"زِ نقارہ آواز آمد بروں!
کہ دوں بست دوں ست و دوں بست دوں"

علی گڈھ مُسلم یونیورسٹی

لڑکے کو فکر صبح و مسا امتحاں کی ہے　　بیوی کو سوچ یہ میری لڑکی کہاں کی ہے
پڑھنے سے کچھ غرض نہ پڑھانے سے واسطہ　　استاد جامعہ کو ہوس عز و شاں کی ہے
بھائی کو ٹھونس دوں کہ بھتیجے کو ٹھونس دوں　　اب اپنے بعد فکر انہیں خانداں کی ہے
ہو جامعہ میں روز نیا معرکہ تو کیا　　ہم کو تو ^فکر^ فصل گل و گلستاں کی ہے
اے کاش لالہ زار ہو پھر صحن بوستاں　　حسرت یہی بس ایک دل خونچکاں کی ہے

"شاید مرا فسانہ انہیں لطف دے گیا
سُنتا ہوں اب تو روز طلب قصہ خواں کی ہے"!

نوجوان سے

میدان جد و جہد میں اے نوجوان اُٹھ　　کب تک پڑے رہو گے یونہی کوئے یار میں
کب تک قتیل دلبری شاہد سخن　　مانا کشش بلا کی ہے اس سحر کار میں
میں جانتا ہوں تشنہء ذوق سخن ہے کیا　　مدہوش رہ چکا ہوں اسی کے خمار میں
دنیائے حسن و عشق ہی پیش نظر رہے　　داخل ہوا نہ زیست کے میدانِ کارزار میں
آہ و فغاں و نالہ تھا سرمایۂ حیات　　حسرت ہی جاں گزیں تھی دل داغدار میں
میں انقلاب چرخ کا قائل رہا مگر　　منکر کہ انقلاب بھی ہے مگر روزگار میں

جاگا تو دیکھا زیست ہے اہل عمل کی زیست
شاعر ہے کوئے یار میں وہ کارزار میں

ثروت آراء (مرحومہ)

(ہمشیرۂ نذر سجاد صاحبہ کی یاد میں)

دل سے جاتا ہی نہیں آہ خیالِ ثروت! — کیا جوانی میں ہُوا خشک نہالِ ثروت!
اس نے راحت کبھی دُنیا میں نہ دیکھی آکر — اشک افشاں رہا ہر شخص بہ حالِ ثروت!
عمر بھر وہ رہی تسلیم و رضا کی تصویر — فاطمہؓ سے تھا ضیا گیر جمالِ ثروت!
اس کی شیریں سخنی اور تواضع اس کی، — دل نشیں، دلبر و دل کش تھی خصالِ ثروت
دل میں ارمانوں کے تھے دفن خزانے کیا کیا — ساتھ ثروت کے گیا مال و منالِ ثروت

حورِ عین بن کے الٰہی وہ رہے جنّت میں
اور باقی رہے دُنیا میں مثالِ ثروت!

ہم دمِ دیرینہ!

(سر محمد یعقوب کی یاد میں)

اے دوست دیا ساتھ نہ احباب کا تم نے — یہ شرطِ رفاقت تھی ہمیں چھوڑ گئے تم!
مضبوط پکڑتے تھے سرِ رشتۂ اُلفت — یہ کیا کہ جھٹک کر اسے خود توڑ گئے تم!

اے عالمِ فانی سے نظر پھیرنے والے!
ہے کوئی کشش تجھ کو یہاں پھیر جو لائے!

وُہ ڈوب گیا جس نے ہزاروں کو اُبھارا — کس کس کو دیا ہمت عالی سے سہارا!
یعقوب سا اب کوئی نہ آئے گا دوبارا — شیریں سخن و دوست نواز، انجمن آرا!

وہ جو کہ لُٹا دیتا تھا احباب پہ دولت
وہ پیکرِ اخلاص و تمثالِ محبّت!

[illegible] تھے — احباب فراموشی کو شرماؤ تو آکر!

یعقوب بھی احباب فراموش ہی نکلا! اس طعنۂ دل دوز کو جھٹلاؤ تو آ کر!

آرام سے کیوں زیر لحد جا کے ہو بیٹھے
اپنے کو بچاتے ہوئے دامن کو سمیٹے

بے کار ہے، بے کار ہے اخلاص و محبت اب کوئی نہ ہو گام زن جادۂ الفت!

وہ مدعیٔ رہبریٔ راہ محبت؛ کہتا تھا زمانہ کہ وفا اس کی ہے خصلت

یوں چھوڑ چلا جیسے شناسا ہی نہ تھا وہ
اس طرح گیا جیسے کہ آیا ہی نہ تھا وہ!

ایک غم زدہ دوست کے نام

نہ مرنے کی کرنا کبھی آرزو! شکستہ نہ کر اپنا جام و سبو
بچاتا ہے جاں کو ہر اک جاں دار وہ بدبخت ہو یا ہو کام گار
وہ بلبل کہ جو ہے اسیر قفس، اسے بھی ہے جینے کی از بس ہوس
اِدھر دیکھو ہر ایک شیر ژیاں وہ سلطان صحرائے وحشت نشاں!
اُدھر ہے اک آہوئے چالاک و تیز وہ آنکھیں رسیلی ہوا میں وہ خیز!
جھپٹتا ہے آہو پہ شیر ژیاں وہ آہو چلا جیسے تیر از کماں
یہ کیا؟ یہ ہے آرزوئے زیست کی اسی سے ہے آہ و ہوئے زیست کی
وہ شہباز جنگ آور تیز پر— اُدھر آسماں کی ہے جس کا گذر
کبوتر کو پنجے میں اس نے لیا، کبوتر جیا بھی تو کے دن جیا!
مگر کس قدر پھڑپھڑاتا ہے وہ اور اپنے کو آخر چھڑاتا ہے وہ
ہے آغشتہ خوں سے تن نازنیں مگر خواہش زیست دل میں مکیں
اگرچہ امید رہائی نہیں قفس میں بھی ہے نغمۂ دل نشیں
غرض زاہدی یہ نصیحت سنو! جیو گرچہ جینے میں غم ہی سہو!
مگر کر رہا ہے جو یہ وعظ و پند نہیں خود نصیحت پہ وہ کاربند
وہ دنیا سے نومید و بے زار ہے غم و رنج کا اس پہ انبار ہے
وہ قلب حزیں و دل دردمند وہ سوز درون و فغاں بلند

شب و روز صبح و مسا تلخ کام
چہ خوش دادہ ام زندگی را نظام!

عقدۂ لاینحل

کوئی اب شامل ارباب وفا ہوتا ہے
آج وہ مائل انداز جفا ہوتا ہے!

کوئی اب داخل زنداں بلا ہوتا ہے
کوئی اب عیش و تنعم سے جدا ہوتا ہے!

"کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق"
ہوس جاں پہ اب کون فدا ہوتا ہے!

میری گستاخی پہ کیوں کوئی خفا ہوتا ہے
شوق پابوسی میں کیا اس کے سوا ہوتا ہے!

چارہ سازِ غم و ہم راز سے کہنا اٹھو!
مجھ سے پوچھے کوئی کیا اس میں مزا ہوتا ہے

چھوڑ کر کعبہ کو اب جائیں کہاں لات و منات
ان پہ کیوں ظلم یہ اے میرے خدا ہوتا ہے

آسماں پہ شفق سرخ زمیں پر لالہ،
رائگاں یونہی تو خون شہدا ہوتا ہے

سن کہ فرمایا کہ یہ ہے اسی آشفتہ کا رنگ،
میرے اشعار کا انداز جدا ہوتا ہے

قیس عامر سا، وہ مجنوں بھی ہے لاغر بھی ہے
نام سجاد ہے اور تم پہ فدا ہوتا ہے!

نواب صاحب چھتاری کے نام

(دولت آصفیہ کی وزارت سے سرفراز ہونے پر)

وہ فاتح قلوب دلوں کا وہ حکمراں
پرچم ظفر کا کھول کے ہوتا ہے پھر رواں

ہندوستاں کے بعد ہے فتح دکن کا عزم
نصرت تمہیں نصیب ہو احمد سعید خاں!

اللہ نے کیا ہے تمہیں صاحب نفوذ!
اور شاہ نے کیا ہے، رعایا کا پاسباں!

کوشش یہ ہو کہ خلق خدا کا رہے خیال!
اور یہ نہ ہو، تمہاری جبیں شہ کا آستاں!

سونپے گئے ہیں تم کو دکن کی مقدرات
اب اس کو خارزار بناؤ کہ گلستاں!

ہو معدلت، اساسِ سیاست مدار کا نصفت مآب بن کے کرو سحر کاریاں
لازم ہے قلع قمع کرو اہلِ جور کا اوروں کے واسطے ہو خطا بخش و مہرباں
دلدار و دلنواز و کرم گستر و جواد، زر پاش و سیم پاش و گہر بار گل فشاں
ہو غلغلہ دکن میں کہ یاں آگیا وزیر!
حق کوش، حق شناس، بہی خواہ، قدرداں

فردیات

تمہیں خبر بھی ہے کچھ کیسا بدنصیب ہوں میں
سفر میں تم ہو مگر اصل میں غریب ہوں میں!

واہ کس کے واسطے تو ہو گیا عشرت کدہ
انڈمن کیوں ہند کے واسطے منحوس زنداں ہو گیا

سیدین و سرور و قدوائی کا ذکر و خیال
درد بھی یہ ہو گیا اور یہ ہی درماں ہو گیا!

اِنتظاریہ

۱- خدا حافظ سجاد (نظم)

۲- سیاح کی بیوی

۳- الوداع (نظم)

۴- یلدرم کی شاعری

۵- تصویر سجاد دیکھ کر

۶- مضامین یلدرم

۷- کلام یلدرم

سجاد حیدر یلدرم پر لکھے ہوئے مضامین اور ان کی بعض تحریروں کو "پگڈنڈی" کے 'یلدرم نمبر' کی صورت میں ترتیب دے کر انہیں امرت سر بھیج چکا تھا کہ جناب محمد طفیل صاحب مدیر نقوش لاہور کی عنایت سے مجھے محترمہ قرۃ العین حیدر کا پتہ مل گیا۔ میری درخواست پر محترمہ قرۃ العین نے نہ صرف اپنے مضامین کو بعد نظرثانی دوبارہ چھاپنے کی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ اپنے پدر بزرگوار کی تصویریں اور ان کی بہت سی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کی نقل بھی مجھے بھیج دی۔ ان عنایتوں کے سوا انہوں نے ایک بڑی عنایت یہ کی کہ مجھے یلدرم مرحوم کی عزیز بھتیجی محترمہ زہرا حیدر (علی گڑھ) کا پتہ بھی لکھ بھیجا۔ محترمہ زہرا حیدر نے بھی میری توقع سے کہیں زیادہ اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا اور اپنے عم محترم کے بعض مضامین، نظمیں اور خود ان پر لکھے ہوئے کئی مضامین اور نظموں کی نقلیں مجھے عنایت فرمائیں۔ ان بے پایاں عنایتوں اور مہربانیوں کے لئے میں ان دونوں محترم خواتین کا دل سے سپاس گزار ہوں

محترمہ قرۃ العین حیدر کی درخواست پر یلدرم کے ایک عزیز دوست اور ہمارے ملک کے مشہور ماہر تعلیم جناب خواجہ غلام السیدین صاحب نے پگڈنڈی کے یلدرم نمبر کے لئے "ایک دل کش شخصیت" کے عنوان سے ایک نہایت دل کش مضمون لکھا ہے۔ اس کرمفرمائی کے لئے میں خواجہ صاحب کا انتہائی ممنون ہوں۔

سجاد یلدرم پر سر عبد القادر مرحوم نے کبھی لاہور ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کی تھی۔ افسوس ہے انتہائی تلاش و جستجو کے باوجود یہ تقریر کہیں بھی نہ مل سکی۔ خود ریڈیو اسٹیشن لاہور میں اس کا مسودہ نہ مل سکا۔ اس کے جو کچھ اقتباسات مل سکے —— اسے محترمہ قرۃ العین حیدر 'نقوش' کے شخصیات نمبر والے مضمون میں درج کر چکی ہیں۔

اپنے جمع کئے ہوئے مضامین کی ترتیب میں ردو بدل اس منزل پر میرے لئے بہت دشوار ہو گئی تھی —— اس لئے محترمہ قرۃ العین حیدر اور محترمہ زہرا حیدر کے فراہم کردہ مضامین اور نظموں کو "انتظاریہ" کے عنوان کے تحت اسی ترتیب سے جمع کر دیا گیا ہے جس ترتیب سے پہلے مضامین درج کئے گئے ہیں۔

جلیل قدوائی

خدا حافظ سجاد

سید سجاد حیدر یلدرم نے یکم فروری ۱۹۲۹ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی رجسٹراری کا جائزہ دیا اور اس خدمت سے سبک دوش ہو کر علی گڑھ سے چلے گئے۔ یہ نظم اسی موقع پر لکھی گئی تھی۔

خدا حافظ ترا اے یارِ جانی! تجھی سے تھی بہارِ زندگانی!
برابر دل کو یاد آتی رہے گی' تیری رحمت وہ تیری مہربانی!
وہ اہلِ دل سے تیرا لطف و اخلاص
ادب اور علم کی وہ قدردانی

ق

مَیں کیا تھا؛ اک گدائے بےنوا تھا مگر کی تو نے ایسی قدردانی!
کہ تیری صحبتوں کے دم سے مَیں نے
غمِ ہستی کی صورت بھی نہ جانی

خیال و خواب ہیں اب اگلے قصے زباں پر ہے فقط ان کی کہانی!
نہ ہو جب تو علی گڑھ میں تو پھر کیا تیرے دم سے تھا لطفِ زندگانی!
نہ دل میں کام کا اب حوصلہ ہے نہ سر میں ہے وہ سودائے جوانی!
یہ پہلو میں ہے جوابِ داغِ حسرت
ہے اگلی صحبتوں کی یہ نشانی!!!

(۱۹۲۹ء)

نذر سجاد حیدر

سیاح کی بیوی

جب ہمارا بچپن تھا، سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ جس وقت چند سہیلیاں بیٹھ کر آپس میں شادی کے تذکرے کرتیں تو اکثر کی یہی آرزو ظاہر ہوتی کہ "مجھے سیروں کا شوق ہے"۔ کوئی کہتی "ولایت جانا چاہتی ہوں، والدین کی اس قدر ہمت نہیں۔ شادی خدا کرے ایسے شخص سے ہو جو انگلینڈ دکھلا لائے"۔ کوئی کہتی "میری نسبت بھی امیر گھرانے میں ٹھہری ہے۔ میرے دولھا ضرور سیر کرائیں گے"۔

مجھ کو ازل سے ٹرکی سے لگاؤ تھا۔ خدا جانے کیوں؟ ذرا ہوش سنبھالتے ہی اخبارات میں ٹرکی کے حالات دلچسپی سے پڑھنے شروع کئے۔ وہاں کی تعلیم نسواں، آزادی، روشن خیالی وغیرہ پڑھ پڑھ کر دل بے اختیار تڑپ جاتا کہ کاش بجائے ہندوستان کے میں نے وہیں جنم لیا ہوتا۔ ایسا ہونا تو اب ناممکن ہے۔ خدا کوئی ایسی صورت کر دے کہ جانا، دیکھنا اور رہنا نصیب ہو جائے۔" یہ میری دلی آرزو تھی عمر کے دسویں سال سے۔ میرے والد کو بارہا ممالک غیر میں جانے کا اتفاق ہوا، مگر ترکستان نہیں، چین، جاپان، فرانس وغیرہ۔ وہ جنگ پر۔ ٹرکی کا کبھی موقعہ نہ ملا۔ لیکن قسمت میں ایک ایسے ہی دل والے سے وابستگی لکھی تھی جو مجھ سے زیادہ فدائے ترکستان نکلے۔ ٹرکی کا عشق ان کو ایک عورت کے عشق سے دوچند تھا۔ پھر کیا تھا، دلی مراد بر آتی ہوئی نظر آئی۔ مگر بدقسمتی سے اس وقت تک بھی قسطنطنیہ کی زیارت نصیب نہ ہو سکی، یہاں تک کہ میرا شیدائے ترکستان میری موجودگی میں بھی ایک بار وہاں ہو آیا۔ مگر میں نہ جا سکی۔ اس دن سے "سیاح کی بیوی" ہونا بجائے خوش قسمتی کے بدقسمتی خیال کرنے لگی۔ اگرچہ میری دیگر سہیلیاں اب بھی خوش نصیب ہی سمجھتی ہیں۔ لیکن جس وقت بیوی کو ہمراہ جانے کا کبھی موقعہ نہ ملے اور وہ تنہا پیچھے رہ جائے۔ اس سے زیادہ بدنصیبی میرے خیال میں اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

مدت ہوئی میں نے ایک اخبار میں بعنوان "ایڈیٹر کی بیوی" ایک دل جلی دردمند بیوی کی فریاد پڑھی تھی۔ اب اس کا اندازہ طبیعت کر سکتی ہے کہ بیشک "سیاح کی بیوی" "اڈیٹر کی بیوی" سے زیادہ مصیبت زدہ ہے۔ وہ اپنے مصروف شوہر کو آفس میں جا کر تو دیکھ سکتی ہے، خواہ وہ بات نہ کر سکے مگر سیاح کی حسرت زدہ بیوی کیا کرے جس کا رفیق حیات ہزاروں کوس دور سمندر پار چلا جائے۔ جس کا خط بھی مہینے بھر میں ملے اور پھر جس کی کہ صحت بھی نادرست ہو۔ اُف! اس پریشان حال بیوی کی دلی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ بے شک "سیاح کی بیوی" ہونا خوش بختی ہے، مگر اسی وقت تک جب کہ وہ اپنے سیاح کے ہم سفر ہو۔ ہم رکاب ہو۔ ریل ہو کہ جہاز ہو، سیاہ اور پُر تلاطم سمندر کی طوفانی رات ہو، یہاں تک کہ خطرے کی گھنٹی بجتی ہو، جہاز میں ہل چل ہو، لوگ موت کو سر پر خیال کر کے پریشان حال ہوں، مگر بیوی اپنے سیاح شوہر کے ساتھ ہو۔ وہ بھی اس کے لئے جنت ہے، راحت ہے۔

سفر بھی ولایت کا نہیں کالے پانی (انڈیمان) ہی کا کیوں نہ ہو۔ جب وہ ساتھ ہو تو بہشت ہے۔ گزشتہ سمندری سفروں میں جب کہ موسم بھی خوش گوار ہوتا تھا۔ جہاز کی دلربا شام اور پُر فضا صبح اس قدر دلکش معلوم ہوتی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ اب یہیں رہا کریں جہاز سے خشکی پہ نہ اُتریں۔ اس وقت ضرور اپنی خوش نصیبی پر ناز ہوتا تھا۔ کیبن ہی سے نکلنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اور جس وقت باہر کی دل فریبیوں پر نظر جاتی تو ۱۲ بجے شب تک کیبن میں جانے کو جی نہ چاہے۔ وہاں شام ہوتی۔ ایک عجیب دل نشین منظر ہوتا ہے۔ دیوالی سے زیادہ اس پر شان وشوکت "محل عظیم" (جہاز) کا جگمگانا۔ خوش نما سازوسامان۔ پریوں کے مجمعے۔ ڈنر کے لئے تیاریاں۔ کیبن سے خوش بو کی لپٹیں۔ پھر سب کا سج سجاکر ڈائننگ روم میں جمع ہونا۔ مگر تب ہی نا کہ دونوں ساتھ ہوں اور جب سنگ دل سیاح کسی کو تنہا، ملول و پریشان حال چھوڑ کر بجائے ٹرکی کے جج کو چلا جائے۔ اس کے دن رات کیسے کٹیں، پہاڑ نہیں بہشت ہو، تب بھی دوزخ ہے۔ اس وقت زندگی ایک خوش نما وادی میں گزر رہی ہے۔ موسم بہار ہے۔ چاروں طرف پھول ہی پھول ہیں، پہاڑ بھی ہے جس کی لوگ آرزو کرتے ہیں۔ مگر آہ! تنہائی، تنہائی! فکر اپنے جانے والے کی، فکر سفر حجاز کی۔ بس اللہ اپنی حفاظت میں رکھے۔ دل ویران ہے، خود حیران ہوں۔ یا خدا یہ دن کس طرح گزریں گے؟ اور کون دن آئے گا — جب میرا "سیاح" "اب" حاجی" بخیریت واپس آئے گا۔ ۱۹۱۱ء میں ان کی ٹرکی کی سیاحت سے واپسی پر ان کے ایک دوست قاری صاحب نے لکھا تھا ؎

آ گئے سجاد حیدر آ گئے!   آ گئے قند مکرر آ گئے!

نے بنے "حاجی" نہ "حاجی جی" بنے   بن کے وہ لولو جھندر آ گئے!

اب قاری صاحب خوش ہو جائیں، اب جلد ہی وہ حاجی جی بن کر آئیں گے۔

خاکسار

اپریل ۱۹۳۴ء

حاجی کی بیوی

صادق علی صادق

الوداع

{ سید سجاد حیدر یلدرم کی جزائر انڈمان کو روانگی کے موقع پر ان کے ایک دوست جناب صادق کی وداعی نظم جو اس سے پہلے کہیں نہیں چھپی۔ }

عندلیب طبع کو گل ریز کر دے ساقیا　　کند ہے فکرِ معانی، تیز کر دے ساقیا
توسن مضموں کو مہمیز کر دے ساقیا　　الوداعی جام سے لبریز کر دے ساقیا

دُور ہو جائے خمار، آنکھوں میں رنگینی بڑھے
سامنے ہو صحنِ گلشن، شوق گل چینی بڑھے

اس لئے ہے آج مے خانے کے در پر جمگھٹا　　ایک بڑی بھٹی کے میکش ہو گئے سب ایک جا
جن میں ہر ایک پیر میخانہ کا منت کش رہا!　　نام اس دوکان کا ہر ایک نے روشن کر دیا

جو فضیلت جس کے حصہ میں تھی قدرت سے ملی
شان و شوکت، آبرو، دریائے رحمت سے ملی

کیسے یہ مے خوار ہیں تجھ کو خبر ہے ساقیا!　　ان میں ہر ایک صاحب فضل و ہنر ہے ساقیا!
اہل دل، اہل کمال، اہل نظر ہے ساقیا!　　چشم بد بیں دُور ہو، خوفِ نظر ہے ساقیا!

کچھ جہاں دیدہ شرابی ہیں، تو کچھ نو خوار ہیں،
کچھ پُرانے پینے والے، کچھ نئے مے خوار ہیں

یہ وہ مے کش ہیں کہ جن پر ناز میخانے کو تھا　　مے کدہ ان کا، علی گڑھ ایک مدت تک رہا!
گو کہ اب اس سے جُدا ہیں اک زمانہ ہو گیا　　ہے مگر اب تک اسی کا نشہ آنکھوں میں بھرا

یہ وہی بادہ ہے اب تک جس کے متوالے ہیں سب
اور یہ کالج ہی کی آغوش کے پالے ہیں سب!

اس ضرورت سے ہوئے ہیں آج یہ میکش بہم　　ان میں کا مے خوار ایک سجاد حیدر یلدرم
حامی اُردو، ادیب فاضل و اہل قلم!　　ذوق سیاحی میں تھکتا ہی نہیں جن کا قدم!

ترک فارس کی تھی سیاحی جوانی کے لئے!
اب بڑھاپے میں ہوس ہے کالے پانی کے لئے

خیریت یہ ہے کہ ہے محدود مدت تین سال　　سخت ہوتا ورنہ اس فرقت کا رندوں پر ملال
عاقبت سے یہ بھی گزریگی بہ فضل ذوالجلال　　پھر ہم ہونگے یہ میکش اور یہ ہوگا مقال
"واپسی پر ہو گئے گھر کے یہ تھے جو گھاٹ کے
بھائی سجاد آ گئے ہیں کالا پانی کاٹ کے"!

اب خدائے پاک سے اپنے ہی صادق التجا　　دور مہجوری الٰہی جلد ہو جائے فنا!
ساحل مقصود پر لائے انہیں واپس خدا　　پھر ملیں ہم ایسی ہی صورت میں با صدق و صفا
پھر بہار آئے خزاں کا دُور افسانہ رہے!
پھر یہی بزم طرب اور دَورِ رندانہ رہے!

احفاد حسین

یلدرم کی شاعری

سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بحیثیت ملک کے بہترین نثر نگار کے محتاج تعارف نہیں - ادبی دُنیا اُن کے جواہر ریزوں
اپنے دامانِ تہی کو مالا مال کر چکی ہے۔ "خیالستان" عالمِ خیال میں ایک محشرِ انقلاب برپا کر چکی ہے۔ "زہرا" کی طلعت ریزیاں ناول بین
طبقے کے دماغوں کو منور کر چکی ہیں۔ "ثالث بالخیر" کے جادو کار کیرکٹر اور سلاستِ زبان کی شیرینی سے ہزاروں کام و دہن لذت یاب
چکے ہیں لیکن آج کتنوں کو علم ہوگا کہ جس ادب نگار کی گُل کاریاں صفحاتِ جمیل کو نگار خانۂ چین بنا چکی ہیں، وہ مملکتِ نظم میں بھی ایک
تک حکومت کر چکا ہے - اب جب کہ اس شہسوار نے، اس چلبلے سپاہی نے اپنی زرہ اور نیزۂ قلم اپنی ڈرائنگ روم کی آرائش کے لئے وقف
کر دیا ہے، کسے معلوم ہے کہ وہ کارزارِ نثر میں بے محابا رعنائی کے ساتھ فرس رانی کے ساتھ ساتھ نظم کے مرقعِ ایوان میں ایک لا دی
پیکرِ نزاکت ا لطاف کی صورت میں اپنے وجود کو پیش کر چکا ہے۔

سید صاحب کو شہرت طلبی اور نمود ظاہر داری سے جو بُغض ہے اور اس کے ساتھ عامۃ الناس جس بد مذاقی میں مبتلا ہیں - اس کا
تقاضا تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ادبِ لطیف کے وہ لعلِ بدخشانی جو "خیالستان" وغیرہ کی صورت میں جلوہ پاش ہیں، قصرِ گمنامی میں روپوش ہو
چکے ہوتے - لیکن مالکانِ مطابع کی قدر دانی اور اس سے زیادہ کسبِ زر اور جلبِ منفعت نے ان نغموں کو خاموش نہ ہونے دیا - اوراقِ پریشان
بیانی کے نقاب سے پرتو نگن نہ ہو سکے اور اب ۱۹۲۲ء میں نوجوان رسائل بین حضرات کو یہ بھی علم نہیں کہ اس تصور کے دو رُخ ہیں اور یہ
وہ قلم جو نثر کے کھلے ہوئے میدان میں عشوہ طرازیاں کر سکتا ہے وہ نظم کی محدود زمین میں بھی گُل کھلا سکتا ہے۔

یہی نہیں کہ سجاد حیدر صاحب نے خود کبھی اس طرف توجہ نہیں فرمائی بلکہ ستم تو یہ ہے کہ دوسروں پر بھی یہ تاکید "کہنا کیس
ہے"! اگر اس تہدید آمیز گفتگو کو نظر انداز کر دینے کی جسارت مجھ میں بھی نہ ہوتی جو ابھی پچھلے دنوں جناب نصیر الدین حیدر صاحب
کے دولت کدے پر سید صاحب سے ہوئی تھی تو شاید میں بھی ملک کے اُس طبقے کو سجاد صاحب کی اس حیثیت سے روشناس نہ کر
سکتا جو ان علمی ذخائر کے یکجا نہ ہونے سے روشن نہیں ہے -

عہدِ طفولیت کے متعلق مبالغہ آمیز حکایات و روایات جو وثوق کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں، ہر شاعر یا ادیب کی سیر
کا سرمایہ ہوتی ہیں - لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سوائے غیر معمولی عقیدت رکھنے والوں کے عام لوگوں کے لئے وہ مطول داستان بے
و بے مزہ ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس حصۂ مضمون سے جلد جلد گزر کر اُس مقام پر پہنچ جائیں جہاں نقد و تبصرہ شروع ہو
ہے - لہٰذا میں بھی اس حصے کو قلم انداز کرتا ہوں - شاعر کا ذوق سب کو تسلیم ہے کہ فطری ہوتا ہے - اسی طرح سجاد حیدر صاحب
جن کو قسامِ ازل کے دربار سے حیاتِ لطیف دلِ دردمند اور چشمِ بصیرت کے عطیاتِ گرانمایہ نصیب ہوئے ہیں "فطری شاعر" ہو

...اہ اُن کے خیال آفرینی کا جولانگاہ نثر کا میدان ہو یا زمینِ نظم
اسکول کا حال نہیں معلوم - مگر جب کالج میں پہنچے تو سید حسرت موہانی، مولانا محمد علی، سید محفوظ علی ایسے رفقاء اور علامہ شبلی ایسے اُستاد کی صحبت میسر آئی - جوہرِ قابل کو چار چاند لگ گئے - رفتہ رفتہ کالج کے ممتاز شعراء میں شمار ہونے لگا جب ...ئی کالج یا ملک سے عارضی یا دائمی طور پر رخصت ہوتا تو سجاد حیدر صاحب کا دلِ دردمند نوحہ خوانی کرتا - خود روتا اور دوسروں ...رُلاتا - جب کبھی "دارالسرور" علی گڑھ میں کوئی سادہ لوح "نئے لطیف" سے عاری داخل ہوتا تو وہی سجاد حیدر کشمیرِ علی گڑھ کو ...شتِ زعفران زار بنا دیتا اور ایک شوخ و شنگ انداز میں اس عجیب و غریب ہستی کا خیر مقدم کرکے اُس کی یاد کو آنیوالی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیتا - تھوڑے دنوں میں وہ پیغام آگیا جو تعلیم سے فراغت کے بعد اکثروں کو "رہینِ ستم ہائے روزگار" اور چند کو ...حریفِ عیش کر دیتا ہے یعنی آپ سفارت خانۂ بغداد سے متعلق ہو کر ہندوستان سے باہر تشریف لے گئے مگر اتنی دور ہونے کے ...وجود اس غریب الدیار سے ہندوستان کی یاد فراموش نہ ہو سکی - داغ کے انتقال پر نالۂ دل دوز وہیں سے کھینچا - اور کشمیر کی ...ل آویزی کی پُر سرور داد بھی اسی جگہ سے دی گئی -

اب تمہیدی فقرات سے رخصت ہو کر میں سجاد حیدر صاحب کے اُس کارنامے کی یاد تازہ کراتا ہوں جس کی اشاعت سے ...پ نہ صرف اب تک محترز رہے ہیں بلکہ اُس کی طرف توجہ کرنے والے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے سے بھی دریغ نہیں فرمایا - چنانچہ باوجود اصرارِ شدید آج تک اپنے کلامِ منظوم کا پتہ آپ نے نہ بتایا - مجبوراً اتنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں جو میری تگ و دو ...ور ایک دوستِ عزیز کی خوش مذاقی کی بدولت مہیا ہو گیا -

زمانۂ طالب علمی میں ایک صاحبزادے پہلے پہل اپنے گھر سے رخصت ہو کر علی گڑھ پہنچتے ہیں - خیر سے صاحبِ اہل و عیال ...ہیں مگر ماں باپ کے سایے اور ناز و نعم میں پرورش پائی ہے - دنیا اور اُس کے مکروہات سے بالکل بے خبر ہیں - کالج میں پہنچے تو ...گویا "بیضہ آسا تنگ بال و پر کنج قفس" سے رہائی پا کر "از سرِ نو زندگی" حاصل کی - حرکات و سکنات سے حیرانی اور توحش ٹپکی پڑتی ...ہے - علی گڑھ میں ان صاحبزادے کے نزولِ اجلال نے "مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں" کی ادبی پھلجھڑی فروزاں کی - اس آتشبازی ...کے ٹوٹے ہوئے ستارے نذرِ ناظرین ہیں:-

ہو وطن سے کبھی جدا نہ کوئی   گھر سے بے گھر ہو لے خدا نہ کوئی
دردِ غربت سہا نہیں جاتا   رنجِ فرقت کہا نہیں جاتا!
یاد احباب کی جو آتی ہے   دل میں اک درد سا اُٹھاتی ہے
بی بی بچوں کا آگیا گر دھیان،   سینہ کوبی سے ہو گئے ہلکان!

ان تمہیدی اشعار کے بعد مرزا پھویا کو روشناس کرایا جاتا ہے

ایک صاحب اودھ میں رہتے تھے   مرزا پھویا سب اُن کو کہتے تھے
گھر سے نکلے نہ تھے تمامی عمر   ساری بھنورے ہی میں گذاری عمر

رات دن کھیلتے مگن پھرتے سارے گھر والے "بچہ" کہتے تھے

اس طرح ان کے اوائلِ عمر کے حالات کا نقشہ کھینچنے کے بعد اصل واقعہ کی طرف کس بے ساختگی سے آتے ہیں

چین تھا دن کو، لطف راتوں میں وقت کٹتا تھا یونہی باتوں میں!
کہ فلک ہو گیا خلل انداز! تجھ سے سمجھے خدا ارے دم باز

نواب محسن الملک کا زمانہ تھا۔ وہ اکثر دورے پر نکلتے اور کالج کے چندے کے ساتھ ساتھ امرا و شرفا کو ترغیب تعلیم بھی دیتے تھے۔مرزا پھویا کی شامت کہ اُن کے والدِ ماجد جو "مشرقی تمدن کے آخری نمونہ" تھے نئی تہذیب اور انگریزی تعلیم کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے، اسی لکچر میں جا پہنچے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ دوسرے روز مرزا کو علی گڈھ کی تیاری کا حکم دے دیا مگر

اس ارادے کو جب کہا گھر میں، پڑ گیا رونا پیٹنا گھر میں

یہاں پر وہ کیفیت دکھائی ہے جو کسی بچے کو پہلے پہل گھر سے بلکہ اپنے سائے سے جدا کرتے وقت بالخصوص اپنی ماں سے اور عموماً صنفِ نازک کے دیگر رشتہ داروں پر طاری ہوتی ہے۔اب وہ منظر ملاحظہ کیجئے جبکہ مرزا صاحب کالج کی راہ لینے اور اپنے مولا و منشا کو خیر و خبردار کھنے کے لئے آخری رسومات ادا کرتے ہیں یعنی ؎

شور و شیون تمام کرنے کو! گھر میں آئے سلام کرنے کو!
اُن کے آتے ہی مچ گیا کہرام روتا تھا ایک ایک دل کو تھام
خالہ اماں، ممانی، بھابی جان، اپنے مرزا پہ سب ہوئیں قربان
آپا جانی نے بھی بلائیں لیں سب نے مل مل کے یہ دعائیں دیں
یا الٰہی! یہ خیریت سے پھرے اور دشمن پہ اس کے بجلی گرے

اب مرزا علی گڈھ پہنچتے ہیں اور ایک ہفتہ رہنے کے باوجود اُن کی یہ حالت ہے کہ ع آہ برلب درونِ سینہ فغاں! چنانچہ آخرکار ؎

اک عریضے کی یوں بنا ڈالی قبلہ ام، مدّ ظلہٗ العالی!

بھنوٹے میں تمام عمر گذارنے کے بعد علی گڈھ کی دنیا میں قدم رکھا تو انہیں ہر چیز اجنبی اور عجیب معلوم ہوتی ہے۔حتیٰ کہ

جنس ہر اک نئی، دکان نئی، اور تو اور ہے زبان نئی!
"ایک دال، ایک گوشت" کہتے ہیں جانے کس دیس میں یہ رہتے ہیں"

اس "ایک دال ایک گوشت" کا لطف صرف علی گڈھ والے ہی اٹھا سکتے ہیں۔جہاں ایک طرف خلوئے معدہ کی شکایت اور بھوک کی شدت ہوتی ہے اور دوسری جانب ڈائننگ ہال کا وہ استغنا

کورنش، مجرا، بندگی، آداب سب کی یاں ہو گئی ہے مٹی خراب
ان کے بدلے ہے بس سلام علیک گویا ڈھیلا سا کھینچ مارا ایک!

خدا کی شان ہے۔وہی حضرات جو علی گڈھ والوں کو نیچری، مرتد اور ایک حد تک دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے۔تسبیح کرنے والے تھے اور اُن کی سخت سخت انگلیاں جبینِ نیاز اور جائے نماز کو ہمیشہ یک جا رکھتے تھے۔وہی شعارِ اسلامی کے اس عالمگیر اصول کو

تقریباً ترک کر چکے ہیں۔ علی گڈھ، سید احمد خانی علی گڈھ، نیچری علی گڈھ، انگریزیت پناہ علی گڈھ نے دوبارہ اس کی احیار کی اور "السلام علیکم" کو بجائے ان مستعمل بے روح رسمیات کے نئے سرے سے رواج دیا۔ اس کے علاوہ پرانے تمدن کے دلدادہ حضرات نے یہاں تک گوشہ نشینی اختیار کی کہ اپنی تمام تفنن اور تفریح کی جولانگاہ کو قالین و گاؤ تکیئے کی سرحد تک محدود کر دیا۔ علی گڈھ جسمانی ورزش اور دماغی تربیت کو لازم و ملزوم قرار دیا۔ چنانچہ مرزا پھویا کا نرم و نازک بدن اس ریاضت جسمانی کی تاب نہ لاسکا اور مرزا چیخ اُٹھے کہ

گیند، بلّا، سواری اور فٹ بال، یہ یہاں کے ہیں کھیل، یہ اشغال!
صبح تڑکے ڈرل کراتے ہیں، ایسے بے رحم ہیں تھکاتے ہیں
جو قواعد کراتے ہیں سب کو، کیا دعا دوں میں ایسے بے ڈھب کو

لطفِ زبان، تسلسلِ خیال اور اس پر دونوں تہذیبوں کی کس قدر میز تفریق کی ہے کہ ان نو گرفتارِ مصیبت کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ مثنوی کے آخر میں خاتمۂ کلام مرزا صاحب کی نئی ضروریات کی فہرست پر ہوتا ہے۔

یاں کی آزادی ہے بہت محدود شہر جانا بھی ہو گیا مسدود
اس لئے عرض ہے کہ یہ چیزیں لکھنؤ سے روانہ آپ کریں!
ایک ڈبیا دیا سلائی کی پُڑیا اک نیلی روشنائی کی!
اک بُرش جُوتا صاف کرنے، اور...... ساتھ ساتھ تھوڑا سا
بوٹ کی لیس کی ضرورت ہے، اور موزے بھی چند اچھے سے
دو گھڑے، اک صراحی، پیالے چار اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار

ضروریاتِ زندگی کی یہ مختصر فہرست دعا و سلام پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس مثنوی میں غیر متعلق پند و نصائح کا اعادہ ہے ان خود ساختہ غیر ضروری قیود کی پابندی اور تعجیل کاری سے اصولی اور روایتی تنفر جو "طعام کا سنکھ" پھونکنے نہیں دیتا۔ اس وقت کا نظارہ صرف محسوس کرنے اور یہ نہیں تو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بیان سے اس کی مناسبت نہیں۔ اس سے آگے چل کر کہتے ہیں ؎ بُو تنعّم کی ہو ذرا سی بھی، اس کو کہتے ہیں یاں پہ عیاشی

ابھی حضرت یلدرم کا زمانۂ طالب علمی ختم نہ ہوا تھا اور ہندوستان کا مایۂ ناز ادیب اُس وقت تک "انجمن اُردوئے معلّیٰ" کا صرف ناظمِ اعزازی تھا کہ بلبلِ ہندوستان کا ہمصفیر، خلد آشیاں والئی رامپور نواب کلب علی خاں کا اُستاد یعنی منشی امیر احمد امیرؔ مینائی اس دُنیا سے چل بسا اور اپنے مداحوں کے دلوں پر ایسا کاری زخم لگایا کہ ہر طرف سے نوحہ خوانی کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور وہ علی گڈھ جسے اُردو کے حق خدمت سے غافل اور علمی و عملی جمود کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں اس حادثۂ جانکاہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک مرثیہ مولانا حسرت موہانی نے لکھا اور دوسرا سید سجاد حیدر نے!

وہ تقدس مآب ہم میں نہیں! مرجعِ شیخ و شاب ہم میں نہیں

رابطہ جس کو رُوحِ قدس سے تھا　　　وہ ملائک مآب ہم میں نہیں
جو سپہرِ سخن پہ تھا تاباں !　　　آج وہ آفتاب ہم میں نہیں!
جس کے نشے سے مست تھا ہر ایک　　　وہ مئے تند و ناب ہم میں نہیں!

ہر ایک مصرع بلکہ ہر ہر حرف اثر میں ڈوبا ہوا ہے - اور "ز دل خیزد بہ دل ریزد" کی تصویر ہے۔ دوسرے بند میں ایک دوسری شان کا ظہور ہے۔

لوگ کہتے ہیں کون شاعر ہے !　　　آج ہم کس کا نام بتلائیں!
ہم کو تحقیقِ لفظ ہے منظور!　　　کس طرف اس کے واسطے جائیں!
دل یہ کہتا ہے مر گئی اُردو !　　　کس طریقے سے دل کو سمجھائیں!

ان پُر حسرت استفہامیہ اشعار کے بعد کس قیامت اور بھولے پن میں کہتے ہیں۔

ہم نہیں مانتے ہمارا امیر　　　حیدر آباد والے لے جائیں

چوتھے بند میں اس سانحۂ عظیم سے جو تباہ کُن نتائج مرتب ہوئے ہیں پیش کئے جاتے ہیں۔

ساتھ اُس کے گیا تخیّل بھی !　　　اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
سردِ بازارِ خوب رویاں ہے　　　اب وہ تعریفِ خد و خال کہاں

ان نقصانات کو گنانے کے بعد کس پُر درد طریقے سے فرماتے ہیں۔

گوش کن اے خدا فغانِ سخن!　　　دل خراش است داستانِ سخن

پانچواں بند اس قابل ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ پُورا نقل کر دوں - اس سے یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ ایک ہی بحث پر اور ایک ہی سلسلۂ تخیّل میں دس شعر بھی اگر سید صاحب نکالتے ہیں تب بھی اپنی خصوصیاتِ شعر کو برقرار رکھتے ہیں۔

کون کہتا ہے، ہے سخن باقی　　　ہے زبان بند اور دہن باقی!
آج بے جاں پڑا ہے جسمِ کلام　　　سر نہیں، گو ابھی ہے تن باقی!
جب وہ ساقی نہیں رہا ہم میں　　　کیوں ہے رندوں کی انجمن باقی!
جب نواسنج عندلیب نہیں،　　　کیوں ہے آرائشِ چمن باقی !
اک سلیمانِ ملکِ شعر نہیں،　　　ہے بھی کوئی تو اہرمن باقی!
اُس کے دم تک تھا شعر کا چرچا　　　اب کہاں ذوقِ علم و فن باقی!
کس پہ اہلِ وطن کریں گے ناز !　　　اب نہیں نازشِ وطن باقی!
کیسا مہماں نواز ہے تو، بھی !　　　زندہ رکھا نہ لے دکن باقی!
اُس کے مرتے ہی ہو گئے سب گنگ　　　کیوں ہے سجاد نعرہ زن باقی!

اُس کا مرنا جہاں کا مرنا ہے　　　اور اُردو زباں کا مرنا ہے!

تم نے دیکھا! ان چند سیدھے سادے بندوں میں سید صاحب نے جن کی حیثیت دُنیائے شاعری میں محض ایک طفلِ ابجدخواں کی ہے، صرف اپنے ذوقِ سلیم اور دلِ درد آشنا کی استعانت سے اپنے پرسوز جذبات کے کیسے پاکیزہ نمونے پیش کئے۔

امیر کا غم ابھی تازہ تھا کہ خاکِ پاکِ دہلی کا آخری چشم و چراغ بھی دکن کی بادِ صرصر سے بجھ گیا۔ وہ کون سلیم المذاق ادیب یا شاعر ہوگا جو اس سانحۂ روح فرسا سے تلملا نہ اُٹھا ہوگا۔ مگر دیکھیئے کہ ارضِ عراق کا ایک (ہنگامی و عارضی) بادیہ نشین شاہِ دکن کے استاد کی موت پر کس سوز و گداز سے آنسو بہاتا ہے۔

مجھ کو مسرت نہیں گرہے ہوا مشک بار | مجھ کو غرض ہے کیا اگر چار طرف ہے لالہ زار
پاس نہ آئے مرے اب نہیں اس کا دماغ | پھیلی ہے پھیلا کرے نکہتِ مشکِ تتار!
میں تو سمجھتا ہوں ہے خندۂ گُل زہرخند | سوگ میں ہے سبز پوش باغ کے سب برگ و بار
آنسوؤں کی وہ جھڑی آنکھ سے جب کہ لگی | واسطہ مجھ کو ہے گر دہر میں ابرِ بہار!
تم کو بتاؤں میں کیا روتا ہوں کیونکر اس طرح | دل سے نکلتی ہے کیوں آہِ حزیں بار بار!

بغداد میں اپنی غربت اور کسی ہم زباں و ہم نوا کے نہ ہونے کی شکایت یوں فرماتے ہیں ؎

کس کو سناؤں یہاں اپنی حزیں داستاں | کوئی نہیں ہمنوا، کوئی نہیں ہم زباں!

درد سے ناآشنا، عیش سے بآرام لوگ ایک دُور افتادہ وطن کو حزین و ملول دیکھ کر ازراہِ غمخواری ع

"پُوچھتے ہیں تیری کیوں آنکھیں ہیں یوں خوں چکاں"!

غریب الوطن اس "پرسشِ احوال" کا "منت پذیر" ہے۔ لیکن اپنے نالۂ دل خراش اور آہِ نارپاش کی توجیہ اس سے زیادہ تفصیل کرنے سے معذوری ظاہر کرتا ہے کہ ع

"ہو گیا خاموش آہ بُلبُلِ ہندوستاں"!

اور کہے بھی تو کیا؟ ؎

نغمۂ بُلبُل بہت، مینا کی قلقل بہت | غیر کی بزم انجمن، غیر ہی کا بوستاں!

الغرض اس مرثیے میں کم و بیش ۲۵ اشعار ہیں جن سے اس خلوص و محبت کا پتہ لگتا ہے جو سید صاحب کو داغ سے تھی۔

سجاد صاحب کی نہ تو شبیرؓ کی مداحی میں ساتویں پشت گذری اور نہ شاعری ذریعۂ عزت ہے بلکہ ؎

نہ اس کے لئے ہے نہ اُس کے لئے | نہ اشعار ہیں یہ صلے کے لئے! (اکبر)

بلکہ ایامِ جوانی میں جب ولولہ انگیز ملکی و قومی اور نیز قلبی جذبات، مردہ نہیں ہوئے تھے، کبھی کبھی جب دل عمیق تاثرات سے مہیّج ہوتا یا مستقل منوّر نظر آتے تو کبھی مرثیے کی شکل، کبھی رجز خوانی کی حیثیت سے اور گاہ ترجمانی جذبات و مترجم حیات کا فرض پُورا کرنے سکے لئے ان کے طوفانِ قلبی اور طبعِ موزوں میں تصادم ہو جاتا اور جنگِ زرگری کا ماحصل کچھ جگر پارے (گویا ہر ریزے) شیخ عبدالقادر کے "مخزن" میں جمع ہو جاتے۔ ہندوستان کے دو مایۂ ناز اور سرمایۂ صد افتخار شعراء امیر و داغ کے ماتم میں آپ نے سجاد حیدر کی سوگوار دیکھ لیا۔ آیئے اب آپ کو دکھلائیں کہ جب سید صاحب کا دلِ زندہ ع "زندگی عبارت ہے جس کے جینے سے"

مُردہ نہ ہُوا تھا اس وقت دور دراز جاپان کی فتح اور روسیہ (روس) کی ناکامی سے اس ایشیائیت کے شیدائی اس مشرقیت کے فدائی پر کیف و سرور کا عالم طاری ہُوا تھا جس وقت کہ جاپان اور روس میں جنگ ٹھنی تھی تو "ارباب بصیرت" کا یہی خیال تھا کہ "مور و فیل" کا مقابلہ ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی فلسفہ اور وسط ایشیا کے تصوف کی رُو نے جو جذبات کی پامالی کر دی تھی اور یورپ کی مادیت نے جو قلوب پر اپنا سکہ جما لیا تھا۔ اس کے بعد کوئی ہندوستانی بلکہ ایشیائی ایک لمحے کے لئے بھی خیال نہ کر سکتا تھا کہ اشوک و بابر، بھیم و خالد اور دارا و کیخسرو کے براعظم کا ستارہ پھر چمکے گا اور وہ چاول خور، کریہہ المنظر، ذرا سے جزیرے میں رہنے والے مٹھی بھر آدمیوں کی وساطت سے جب اپنوں میں اسقدر بے اعتمادی تھی تو اغیار سے کیا شکایت! اگر وہ ناکارہ و ہیچمداں خیال، مگر اسٹیج کا پردہ اُٹھتا ہے اور مفتوح فاتح اور مغلوب غالب بن جاتا ہے اس موقع پر سجاد حیدر صاحب "بزی جاپان بزی" کے عنوان سے ایک نظم لکھتے ہیں ؎

ہاں ترقی نہ رُکے مُلکِ طلوعِ خاور ساری دُنیا کی ہے تعریف کا سہرا تیرے سر

مشرقی عزت و حرمت کو سنبھالا تو نے سارے عالم کو تحیر میں ہے ڈالا تو نے

اس قسم کے چند اشعار کے بعد جن سے عزمی رجز کی شان پیدا ہوتی ہے، دشمن کے مطاعن کو خوبی سے نظم کیا ہے۔ ؎

کہتے تھے کچھ نہیں اب ان میں لیاقت باقی اب تنازع البقا کی نہیں طاقت باقی!

صفحۂ ہستی سے ناپید ہُوا چاہتے ہیں، قعرِ گمنامی میں یہ جلد گرا چاہتے ہیں!

یہ طعن ہائے دلخراش تھے اور ایشیائیوں کے جگر جراحت آشنا! ایک طرف تو اپنی تہی مائگی کا یہ عالم تھا اور اس پر اغیار کا زہر خند یہی نہیں کہ وہ پامال و بیکس مشرقیوں کو استعاروں اور تشبیہوں میں بُرا بھلا کہتے ہوں۔ نہیں! اب تو وہ صاف صاف کہتے تھے (سجاد صاحب کی زبان سے سُنیئے کہ کیا کہتے تھے)۔

اب نہ جہد اور مجاہد کی تمنا رکھو! اب نہ عالم کی نہ زاہد کی تمنا رکھو!

اب نہ محمود نہ چنگیز نہ اکبر ہوں گے! ہوں گے گر اب تو نپولین و سکندر ہونگے

اب نہ کنفیوشس سکیا کا زمانا ہو گا! اب نہ فارابی و سینا کا زمانا ہو گا!

ان مطاعن سے شاعر تلملا اُٹھتا ہے ؎

ہاں مگر طعنے نہ تھے برچھیوں سے کچھ کم، یہ مطاعن! یہ شماتت! یہ ستم اور یہ غم!

پانسہ پلٹتا ہے اور دُنیا میں ان نحیف الجثہ، ضعیف الدماغ، مفلس اور بے علم لوگوں کی شجاعت، جرأت، فوجی نقل و حرکت، دانشوری اور سیاست کے ڈنکے بجنے لگتے ہیں۔ شاعر فخر اور انبساط کے مارے پھُولا نہیں سماتا اور وجد میں آکر کہتا ہے ؎

دھوم ہے دھوم ہے مشرق کا دُلارا اُٹھا پہلوان ایشیا کا سب سے پیالا اُٹھا!

اس کے بعد معرکۂ جنگ کو قیامت کے زور اور غضب کی چستی کے ساتھ نظم کیا ہے ؎

مائل جنگ ہے بے جان ہُوا جاتا ہے شرق کے نام پہ قربان ہُوا جاتا ہے

ایک بچہ ہے اِدھر اور اُدھر خرسِ عظیم ایک ٹلے کے مقابل میں ہے شیطانِ رجیم

ایک بجلی ہے کہ خیرہ ہے نظر عالم کی مدعی نے ابھی تدقیقِ نظر کم کم کی!

بحر و بر کانپ رہے ہیں کہ کیا ہوتا ہے — کہتے ہیں یوں کوئی مصروف دعا ہوتا ہے

زبان بھی مرثیے کی ہے اور ہر شعر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسے بند کی ٹیپ سے لیا گیا ہے جو تمام حضارِ مجلس کو گرما دیتی ہے اور خراجِ تحسین از خود وصول کر لیتی ہے۔ آخر میں تمام اہلِ مشرق کی ترجمانی کی جاتی ہے ؎

قالبِ مردۂ مشرق میں پھر آتی ہے جاں — حاسد افسردہ ہیں، دشمن کے خطا ہیں اوساں

...... اے سببِ فخر و مباہاتِ عظیم — ...... تو نے ہی خاموش کئے سارے لئیم

اس سلسلے میں ایک بات البتہ اور کہہ دینی چاہیئے اور وہ یہ کہ آزادی و حب الوطنی کی لہریں گنگا جمنا میں نہیں آئیں۔ یہ سعادت دجلہ و فرات کو نصیب ہوئی۔ حریت اور دیش بھگتی کی یہ بلند منصبی ہمالیہ کی جیون چوٹیوں کے حصے میں نہ تھی بلکہ عراق کے کسی ٹیکرے یا عرب کے ریگستان کی سنہری ریت کی قسمت میں تھی۔ وہیں سے یہ راگ الاپے گئے تھے اور اسی سرزمین سے پُرجوش کلمات نکلے تھے جہاں وہ پیغمبرِ برحق پیدا ہوا۔ ع :— "عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی"

یعنی ان تمام منظومات اور وارداتِ قلبی کو لفظی جامہ اُس زمانے میں پہنایا گیا جب کہ سجاد صاحب "یلدرم از بغداد" لکھا کرتے تھے دل کا تڑپنا دیکھ لیا، جگر کی سوزش بھی دیکھی، حب الوطنی کے راگ بھی سُنے۔ یعنی فردوسِ گوش کی سیر کر چکے۔ اب چلیئے جنتِ نگاہ اور لطفِ نظر کی کرشمہ سازیاں بھی ملاحظہ کیجئے۔

کشمیر کے بصارت افروز لیکن بصیرت سوز مناظر کے متعلق ہر ایک نے کچھ نہ کچھ دیکھا یا سُنا ہے۔ ارباب نظر جاتے ہیں اور وہاں کے آبِ شفاف میں اپنی نظر کو غسل دیکر چلے آتے ہیں۔ گلچیں اس طرف توجہ کرتے ہیں تو پھولوں پر حسنِ گلو سوز سے بقول اکبر "آنکھوں کا مزہ حاصل کرتے ہیں"! خوشبوؤں اور رنگینیوں سے مشامِ جان معطر کرتے ہیں اور اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ فرطِ انبساط سے دل تو دل اُن کا دماغ بھی قوتِ متخیلہ کو معطل کر دیتا ہے اور تمام توجہات کسی ایک نقطے پہ مرکوز ہو جاتی ہیں۔ میں نے کشمیر جنت نظیر کے سیاحوں میں سے (قریشی صاحب کے سوا) جس کسی کے متعلق یا جس کسی کی زبانی سُنا تو یہی سُنا کہ اُنہوں نے وہاں ایسے ایسے نظر فریب اور تقویٰ شکن مناظر دیکھے ہیں کہ اب اُن کا جی چاہتا ہے کہ وہیں کے ہو رہیں مگر وہاں کے مسلمانوں کی عُسرت، اخلاقی پستی اور تعلیمی افلاس سے شاذ ہی متاثر ہوتے ہیں۔ قدرت کی وہ فیاضی جو وہاں کے شجر و حجر اور کوہ و وادی کو دل آویز بنانے میں اپنی پوری مشاطگی صرف کرتی نظر آتی ہے۔ اُن کی نظروں کو خیرہ کر دیتی ہے مگر فلکِ کجرفتار کے وہ مظالم، نفس پرست انسانوں کے وہ ستم جو وہاں کی دوشیزگانِ معصوم کی عصمتوں پر توڑے جاتے ہیں، اُس کی انھیں مطلق خبر نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو اسے وہ وہاں کی دلفریبی کی افزائش کا ایک مرصع ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ شعراء نے نظمیں لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ مگر وہاں کے مناظر کی رنگینی اور بوقلمونی نے ایک کے بھی دل و دماغ کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ ان بے کس لڑکیوں کے [illegible] پر بھی چند قطراتِ اشک بہا سکیں جو محض قوتِ لایموت کی خاطر عصمت کی سی گراں مایہ متاع اور انمول جوہر سیاحوں کی ہوس کی قربان گاہ کی نذر کر دیتی ہیں۔ ان کا جسم ان چار کپڑوں کی قسمت پر رشک کرتا رہتا ہے جو اُن کے زیادہ خوش قسمت ہمسایوں کو نصیب ہے کیونکہ وہ پوشش کی گراں باریوں سے کم و بیش ہمیشہ ناآشنا رہا۔ سجاد صاحب اول انھیں عبرت انگیز مناظر سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنی نظم "کشمیر و حسنِ کشمیر" کی ابتدا یوں کرتے ہیں ؎

یا اُنہیں فخرِ حسیناں نہ بنایا ہوتا!　　یا اُنہیں جامۂ شاہانہ پنہایا ہوتا!

مملکت یہ جو ہے پریوں کی سلیمانوں کی　　اہرمن نے تو یہاں دخل نہ پایا ہوتا!

تونے جنت جو یہ دنیا میں بنا رکھی ہے　　کاش شیطان کبھی اس میں نہ آیا ہوتا!

اس وادی کے عفت سوز و عصمت شکن رُخ پر چار آنسو بہا لینے کے بعد کشمیر کے کسی چشمۂ رواں سے آنکھیں تر و تازہ کرتے ہیں اور پھر اس قدر اپنے حسین گرد و پیش میں محو ہو جاتے ہیں کہ بے اختیار زبان پر یہ شوخ التجا جاری ہو جاتی ہے ؎

حوضِ کوثر کے عوض "چشمۂ شاہی" ہی ملے　　یہ نہیں ہوگا تو منعم سے ہیں ہونگے گلے

آگے بڑھتے ہیں۔ فضائے کشمیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُنہیں دُنیا میں جنت نظر آتی ہے اور ظاہر ہے موجودہ مسرت ہر اعتبار سے موعودہ حصولِ مسرت سے زیادہ دل آویزی اور جاذبیت اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔ چنانچہ سید صاحب فرماتے ہیں ؎

مَیں نہ جاؤں گا، نہ جاؤں گا جو کشمیر نہیں　　لاکھ جنت ہو، یہ ایسی تو وہ تعمیر نہیں

کیا حسنِ تکرار ہے اور پھر کس قدر بے ساختہ!

خطۂ کشمیر وہ جگہ ہے جو ہر انسان کو شاعر بنا دیتا ہے اور پھر شاعر خدا معلوم کیا ہو جاتا ہے۔ سجاد صاحب کشمیریوں کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ان کو بُزدل نہ سمجھنا، ہیں بلا کے سفاک　　پاس گو کہنے کو شمشیر نہیں، تیر نہیں

پہلی نظر کے بعد ہر شخص (بشرطیکہ وہ رشید صاحب کے ۴۰ سال سے متجاوز یا پھر منطقی شاعر نہ ہو) پکار اُٹھتا ہے کہ ع "عجب تیر بے کماں زدئی"

(میرے ایک ظریف طبع دوست نے خوب کہا تھا کہ اگر وہاں کی گورنمنٹ سر ولیم ولسٹ یا مہاتما گاندھی کا کہا مانتی ہوتی تو اب تک یا قانونِ اسلحہ کے ذریعے یا رضاکارانہ طور پر ان اسلحہ کا استعمال بھی ممنوع یا غیر مشروع قرار دے دیا جاتا)

کیا عجب گر ہوئے بے پیر بتانِ کشمیر!　　ہیں یہاں سب ہی جواں، نام کو بھی پیر نہیں

اس شعر میں ایک پُر لطف مبالغہ بھی ہے اور وہاں کی آب و ہوا کی تر و تازگی اور صحت بخشی سے کچھ دُور بھی نہیں کہ مدت سے انسان کو اپنی ضعیفی اور پیرانہ سالی کا احساس نہ ہوتا ہو۔ اس بے نظیر ملک کی عدیم المثال شگفتگی و عشوری کے بعد شاعر کی نظر وہاں کی کثرتِ اموات پر پڑتی ہے تو ان جلوہ ریزیوں اور قدرت کی فیاضانہ مہمان نوازیوں کے باوجود اُس کا قلب بے چین ہو جاتا ہے۔

یہ غضب ہے کہ یہاں موت چلی آتی ہے　　غربت امراض کو بھی ساتھ لگا لاتی ہے

اس کشاکشِ ذہنی و نظری کے بعد حسنِ کشمیر کا جادو اپنا کام پورا کر دیتا ہے۔ انسان (بشرطیکہ اُس کے پہلو میں مضغۂ گوشت (دل) کی بجائے برف کی قاش نہ ہو) مسحور ہو جاتا ہے۔ سید صاحب بھی اپنی قوتِ متخیلہ کی ولولہ خیز و طرب انگیز ہیجان کی تاب نہ لا سکے اور ایک عالمِ بے خودی میں منہ سے نکل ہی گیا ؎

ہم کو اس عالمِ بالا کی خبر ہے معلوم؛　　جس کی مدت سے ہے دنیا میں پڑی ایسی دھوم

بیش ازیں نیست کہ کشمیر کی ہوگی اک نقل، وہ بھی دھندلی سی، پریشان سی، مثالِ موہوم

تھے جو لایعنی صنم ان کی پرستش ہوئی منع نہیں کشمیر میں اصنام پرستی مذموم

کیا حسنِ تعلیل ہے! شعرا ممنوعاتِ شرطیہ کا جواز ثابت کر دینا اعجاز خیال کرتے ہیں۔ اس شعر میں کس خوبصورتی سے وہی سنت ادا کی ہے۔

پاؤں پر دخترِ دہقاں کے وہ سر رکھ دیتا کبھی کشمیر میں آ جاتے اگر قیصرِ روم!

اس حکایتِ لذیذ کو اس قدر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ شاعر خود اپنی بہترین آرزو اور جانِ تمنا سے خیال کرتا ہے۔ ؎

جب میں سمجھوں کہ بر آئی ہے تمنائے دلی ایک کشمیری ہو، خنجر ہو، مرا ہو حلقوم

میں بھی ملے کاش کسی وادی میں کھو جاؤں یا کسی حسن کی دیوی پہ فدا ہو جاؤں!

مگر ع :۔ یہ قصہ ہے جب کا، کہ آتش جواں تھا۔ اب تو چہل سالگی سے متجاوز والا مضمون ہے۔ اس لئے کہ ؎

نشۂ عمر، باشد تا بہ سی سال چہل آمد، خرد ریزد پر و بال۔!

یہ سب کچھ صحیح سہی، مگر ناظرینِ کرام! آپ نے اندازہ فرمایا کہ ان نظموں میں ایک شان ہے جو صرف پیدائشی اور فطری شاعروں کے کلام کا حصہ ہوتی ہے۔ ایک ایک حرف سے بے ساختگی اور جذبات کی صحیح ترجمانی ٹپکتی ہے۔ افسوس کہ زمانے کی گوناگوں مشکلات اور پیچیدگیوں نے مہلت نہ دی ورنہ وہ تارا جو آج نثر کی سرزمین پر طلعت آمیز ہے، اقلیم نظم پر بھی بہت ممکن تھا کہ آفتابِ کمال بن کر ضوفشاں ہوتا۔

قبل اس کے کہ میں اپنے اس سرسری مضمون کو ختم کروں، ایک کمی کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میں نے صرف محاسن دکھلانے کی کوشش کی ہے اور اس طرح تمام مضمون سجاد صاحب کی شاعری پر ایک قصیدہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ کمی سہو کی وجہ سے نہیں، دانستہ ہے حرف گیری اور نکتہ چینی کا حقیقی مقصد صرف اس قدر ہوتا ہے کہ آئندہ را احتیاط! مگر اب سجاد صاحبؒ! اب دنیا کے سامنے بحیثیت شاعر کے کبھی نہ آئیں گے۔ لہٰذا اصلاح اور مشورے کا اب موقع نہیں، نہ کلام میں تعقید ثابت کرنے سے کوئی ممکن فائدہ ہو سکتا ہے نہ زبان کی خامیاں دور کرنے سے نتیجہ! مقصود صرف اس قدر تھا کہ اُن کے بے شمار احباب اور صدہا پُرخلوص مداحوں کو جو اُن کی شعریت کی قدر کرتے ہیں۔ یہ دفترِ پارینہ بھی دکھلا دیا جائے۔ اُن کے تفننِ طبع کا سامان مہیا کر دیا جائے اور سید صاحب کی خدمت میں ان کے ایامِ گرمجوشی، سرگرمی اور عہدِ عمل کی ایک تصویر پیش کر دی جائے جو انہیں بھولا ہوا خواب شائد یاد دلا دے۔ اور وہ اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں سے ادبِ لطیف اور شعر کو یہ کہتے سُن لیں کہ ع :۔

”کبھی ہم بھی تم سے تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!“

اور شائد پھر اُن کے دماغ میں ہیجان اور قلم میں جنبش پیدا ہو اور ادبیات کا ستارہ چمک جائے!

سید نظام الدین شاہ دلگیر اکبر آبادی

تصویر سجاد کو دیکھ کر

سجاد! سجاد! کون سجاد؟ وہی فطرت شناس سجاد، آزاد سجاد، ظرافت پسند سجاد، جس کی تصویر، ہنستی بولتی تصویر اکتوبر کے مخزن میں شائع ہوئی ہے۔ دلوں کو، مٹے ہوئے دلوں کو اپنی طرف بے طرح کھینچتی ہے۔ وُہی روشن خیال سجاد، جس کے مضامین کی نسبت بجا طور سے کہا جا سکتا ہے ؎

عطا کیا طبع نکتہ رس نے ترے قلم کو سخنوری میں

خیال انوکھا، بیاں اچھوتا، زمیں نئی اور روش نرالی!

مخزن کا علمی دسترخواں بے نمک ہے۔ اگر سجاد کی ظرافت طبعی کی چاشنی اس میں نہ دی جائے۔ اس پیارے رنگ کے، ہنسانے رلانے والے رنگ کے، آج کل بے حد قدر دان ہیں، جس کو سجاد، اپنے رنگ کا مالک سجاد قلم برداشتہ لکھتا چلا جاتا ہے۔

تعجب، سخت تعجب ہے کہ اس کے قلم معجز رقم نے "حکایۂ لیلیٰ و مجنوں" کو اب تک کیوں نامکمل چھوڑا، اسے پورا کرنا چاہیئے اور جلد پُورا کرنا چاہیئے۔

مخزن فروری ۱۹۰۸ء — دلگیر

مضامین یلدرم

اُردو لٹریچر اور تعلیم یافتہ مسلمان

نشہ کی پہلی ترنگ

اے مادرِ وطن!

سرسری انصاف (ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

سفرِ حجاز

فطرت جواں مردی

سنجر و غزالی

اُردو لٹریچر اور تعلیم یافتہ مسلمان

ایسے وقت میں جب کہ اُردو کے ساتھ خاص احسانات کئے جا رہے ہیں، جب کہ اُردو کا مقابلہ، فارسی سے نہیں، انگریزی سے نہیں، بلکہ یا دش بخیر، ہندی سے ہو رہا ہے اور زمانہ اپنا دست شفقت اس نامراد حرماں نصیب اردو کے سر سے اُٹھا کر ہندی کے سر پر رکھ رہا ہے۔ غرض کہ ایسے نازک زمانے میں اُردو لٹریچر کی ترقی کے متعلق کچھ لکھنا، جھونپڑے میں محلوں کے خواب دیکھنا ہے۔ لیکن اس نازک وقت میں ہمارا طرزِ عمل دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہی جس پر ہم اب تک نہایت کوشش سے کار بند رہے ہیں یعنی یہ کہ کچھ نہ کرنا۔ دوسرا یہ کہ مردانہ وار کوشش، اپنی مادری زبان کا ساتھ دینا اور اُردو سے عہد کرنا ع " پھروں جو تجھ سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے"!

یہ دو طریقے ہمارے سامنے ہیں اور میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ دوسرا طریقہ ہم کو اختیار کرنا چاہئے۔ اس سے ہم اُردو کو زیر بار احسان ہی نہ کریں گے بلکہ خود ہمارا ہی فائدہ ہے۔ مَیں نے یہ عرض کیا کہ مردانہ وار کوشش کرنے سے ہم اُردو کو اپنا حلقہ بگوش نہ بنائیں گے، بلکہ ہم خود ہی نفع میں رہیں گے۔ بظاہر یہ امر خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ جو مَیں عرض کرتا ہوں صحیح ہے۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ ہم مسلمان نہیں بلکہ اور بڑے پائے کے انگریز کہتے تھے کہ ایک نہ ایک دن اُردو کُل ہندوستان کی زبان ہو کر رہے گی۔ وہ فرماتے تھے کہ اس زبان کی اندرونی ساخت، اس کی اپنے میں ہر موقع کے مطابق کر لینے کی قابلیت بتا رہی ہے کہ اس کا تسلط بہت جلد عالمگیر ہوگا۔ تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے کہ ایک انگریز مصنف نے تاریخ ہند میں اس اُردو کو ہندوستان کی لنگوا فرانکا قرار دیا تھا۔ چنانچہ اس مطلب کو کہ خود انگریز اُردو کو کُل ہندوستان کی زبان کرنا چاہتے تھے، پروفیسر محمد حسین آزادؔ اس طرح ادا کرتے ہیں :-

" ادھر تو یہ چونچال لڑکا شعراء کے جلسوں اور امراء کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا۔ ادھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعے پہ دوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا۔ نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے"۔

ایک تو یہ زمانہ تھا۔ "یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا"۔ اب یہ زمانہ ہے کہ جس زبان کو ایسی کوششوں سے ترقی سے بانی دیا گیا تھا۔ اب اس کے لئے اگر یہ حکم ناطق صادر نہ ہوا کہ وہ اُکھاڑ پھینکا جائے تو اتنا ضرور ہوا ہے کہ اس کی خاص غور و پرداخت بند کر دی گئی ہے۔ بہر حال وقت کے تیور بدلے نظر آتے ہیں اور ہم کو کسی قسم کی مراعات کی امید رکھنے کا کوئی حق

نہیں اور یہ تمنا بھی چھوڑ دینا چاہیئے کہ اُردو کسی دن کل ہندوستان کی زبان ہو جائے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُردو ناپید ہو جائے گی؟ اس مقام پر مَیں پیغمبری کا دعویٰ کر سکتا ہوں — اور پیشین گوئی کر سکتا ہوں کہ کبھی نہیں۔ جب تک ہندوستان میں مسلمان ہیں اس وقت تک اُردو مٹ نہیں سکتی۔ اسے اُردو کی بد قسمتی سمجھیئے کہ مسلمانوں نے اس زبان سے خاص اُلفت ظاہر کی، کیونکہ وہ ہر حالت میں اس کی ترقی کے درپے ہوتے ہیں۔ مگر جو کچھ ہو۔ اب تو مسلمان ہیں اور اردو ان کی مادری زبان سمجھیئے تو، ملکی زبان سمجھیئے تو، اور قومی زبان سمجھیئے تو سب صحیح ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ صرف ممالک مغربی اور شمالی کے مسلمان اُردو بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں، نہیں، کُل ہندوستان کے مسلمان اس زبان کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس میں ادائے مطلب کرتے ہیں۔ بنگال میں بنگالی بولی جاتی ہے اور وہاں کے مسلمان بھی بنگالی جانتے ہیں اور بولتے ہیں مگر ساتھ ہی اس کے ہر مسلمان کی یہ خواہش ہے کہ مَیں اُردو میں فصاحت سے گفتگو کر سکوں اور وہ اس بنگالی کو رشک اور وقعت کی نظر سے دیکھتا ہے جسے اُردو پر قدرت حاصل ہو۔ گزشتہ کانفرنس میں مسٹر جسٹس سید امیر علی نے ارشاد فرمایا تھا کہ بنگالی کے سرکاری مدارس میں یہ بڑی خرابی ہے کہ وہاں مثل بنگالی کے اردو زبان بطور ورنیکلر زبان کے نہیں مانی گئی اور انہوں نے اس امر پر زور بھی دیا تھا کہ ایسا ہونا چاہیئے۔ اس کانفرنس میں بمبئی کے نواب زادہ نصر اللہ خاں صاحب نے اسی قسم کی شکایت بمبئی کے متعلق کی تھی۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ مسلمانوں نے اسے اپنی زبان قرار دے لیا ہے ان کے دلوں سے یہ خیال نکالنا مشکل ہے۔ اور جب ہم یہ خیال دلوں سے نہیں نکال سکتے ہیں تو بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنی زبان کو درست کریں۔ اسی بنا پر مَیں نے عرض کیا ہے کہ اردو کو ترقی دینے سے ہم خود فائدے میں رہیں گے۔

اُردو میں ہم ترقی کس طرح سے کریں؟ یہ نہیں ہوگا کہ ہر روز نئے محاورے تراشے جائیں، نئے الفاظ ایجاد کئے جائیں اور پھر کہا جائے کہ اُردو ترقی کر رہی ہے۔ حاشا یہ نہ ہوگا کہ تقریر اور تحریر میں موقع بے موقع محاورات کی بھرمار کی جائے اور بغیر محاورہ اور شعر کے کوئی فقرہ بھی نہ لکھا جائے اور نہ اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ ضلع جگت بولنے کی مشق بڑھائی جائے نہیں، یہ ہرگز نہ ہوگا۔ ہم کو محاورات نہیں چاہئیں، ضلع جگت کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم کو ضرورت اس عمل کی ہے کہ اپنی زبان کے عمدہ لٹریچر کو ترقی دیں۔ طبیعت میں ذوق سلیم پیدا ہو، اپنی زبان سے وہ بے اعتنائی بلکہ نفرت نہ ہو جو آج کل کے انگریزی تعلیم یافتوں کا خاصہ ہے۔ انگریزی تعلیم یافتوں کا نام مَیں نے غلطی سے لیا۔ مجھ کو انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان کہنا چاہیئے تھا کیونکہ یہ ان ہی کا خاصہ ہے کہ اپنی زبان سے نفرت ظاہر کریں اور اپنے لٹریچر کی ہنسی اُڑائیں۔ ہمارے مقاصد میرے نزدیک یہ ہونے چاہئیں :-

(۱) اُردو لٹریچر کو ترقی دیں۔

(۲) عمدہ اُردو لٹریچر سے واقفیت پیدا کریں۔ کہا جائے گا کہ اُردو میں لٹریچر ہی کہاں ہے جس سے واقفیت پیدا کی جائے۔ مَیں افسوس کے ساتھ مانتا ہوں کہ ہمارا لٹریچر وسیع نہیں کہ کسی بڑی زبان کا مقابلہ کر سکے۔ مگر مَیں پوچھتا ہوں کہ ہم میں سے تھوڑے ایسے ہیں جو ایمانداری سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اُردو لٹریچر تھوڑا بہت جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے، وہ دیکھ لیا ہے اور ہم کیا کریں۔

دوسرا مقصد سہل الحصول نہیں، یعنی اُردو لٹریچر کو ترقی دینا۔ یہ کہدینا تو آسان ہے، لیکن اس کو کر دکھانا مشکل ہے۔ تاہم مَیں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم کو بہت کسر نفسی بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ ہم میں سے بہت سوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم جو ہندوستان دے سکتا ہے

ملی ہے۔ ہمارے سامنے دُنیا کے اعلیٰ لٹریچر کے نمونے موجود ہیں، اسلئے اگر ہم کوشش کریں تو کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتے ہیں۔

اُردو لٹریچر کو ترقی دینے کی طرف متوجہ کرنے والا صرف مَیں ہی نہیں ہوں۔ مجھ سے لائق تر اور بزرگ تر لوگ اپنی عمدہ رائے اس بات میں ظاہر کر چکے ہیں۔ ایک ایسے جلسے (ایجوکیشنل کانفرنس) میں جہاں کل ہندوستان کے اہل الرائے مسلمان اپنی قوم کی بھلائی کی تدبیریں سوچنے کے لئے جمع ہوتے ہیں، یہ امر طے پا چکا ہے اور یہ رائے پاس ہو چکی ہے[1] اور اس کا ایسا کافی اعلان ہو چکا ہے کہ کوئی شخص اس سے اپنی لاعلمی کا عذر پیش نہیں کر سکتا اور اگر پیش بھی کرے تو مقبول نہ ہوگا۔ تاہم ہم کو افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس رائے پر کچھ بھی عمل نہیں ہُوا۔ اگر یہ خیال درمیان میں حائل نہ ہوتا کہ مسلمان سہارے کے خوگر ہیں اور جب تک ان کو سہارے کا آسرا رہے کوئی کام نہیں کرتے تو ہم اس مجرمانہ بے پروائی کو دیکھ کر جو اُردو لٹریچر کی نسبت انہوں نے ظاہر کی، بالکل مایوس ہو چکے تھے مگر مسلمانوں کی کاہلی ضرب المثل ہے اور جب ان کاہلوں کو یہ بہانہ ہاتھ آگیا کہ اُردو کے سرپرستوں کا میلان خود اس زبان کی ترقی کی طرف سے ہٹ گیا ہے۔ ہمیں کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے، تو ان میں جوش پیدا کرنا طاقتِ بشری سے باہر تھا۔ "وہ دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے"! اردو کو اب اپنے ہی پاؤں پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ اس کو سہارا دینے والا اب کوئی نظر نہیں آتا۔ اسی لئے اب بمقابلہ پہلے کے بہت زیادہ ضرورت ہے کہ اس میں اپنے آپ چلنے کی طاقت پیدا کی جائے جو حیرت انگیز کوشش حامیانِ ہندی، ہندی کی ترقی میں کر رہے ہیں، کاش وہی ہمارے لئے تازیانے کا کام دے!

مجھ کو خوشی ہے کہ اُردو کے حقوق کی حفاظت میں اور اس کی فریاد گورنمنٹ کے کان تک پہنچانے میں مسلمانوں نے ایک غیر متوقع جوش دکھایا ہے اور دکھا رہے ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کو اس زبان سے کتنی محبت ہے۔ بایں ہمہ ہمیں اسی واویلا میں منہمک نہ ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے لئے ایک دوسرا کام بھی ہے اور وہ ہماری توجہ کا ایسا ہی مستحق ہے جیسا کہ حقوق اردو کی حفاظت کا کام، اور وہ یہ ہے کہ اُردو لٹریچر اور اُردو زبان کو ہر ممکنہ طریقے سے ترقی دی جائے تاکہ جو حق اُردو کا آج ہے کل اس سے زیادہ ہو جو دعویٰ وہ آج پیش کرتی ہے، کل اس سے بڑھ کر پیش کر سکے۔ اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ ہمیں اس امر سے غافل نہ رہنا چاہیئے اور ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں، مصنفوں اور علمی رسالوں اور اخباروں کو نڈھال ہو کر کوشش نہیں کرنی چاہیئے بلکہ بہ نسبت پہلے کے زیادہ دلیری سے کمر ہمت چست باندھنی چاہیئے۔

غرض کہ میری تمنا ہے کہ یہ افسردگی اور اضمحلال جو ہم پر اپنی مادری زبان کے متعلق طاری ہے نہ رہے۔ ایک تحریک ہو، ایک جنبش ہو، جو مجھے، آپ کو اور سب کو آگے لے جا کے موجودہ اہم مہمات پر قادر کر سکے

یا طلب وصل ہو یا ہو طرب وصل
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا!

(حالیؔ)

---

[1] شاہجہان پور کے اجلاس میں ایک ریزولیوشن پاس ہُوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو علمی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا چاہیئے۔

نشّے کی پہلی ترنگ

(ترکی زبان کے ادیب خلیل رشدی کے ایک افسانے کا ترجمہ[1])

جوان! بیس[2] سال کا جوان ہے - وہ گردبادِ حیات، تاثراتِ روحانیہ، حرارتِ وجدان، کنگو کہتے ہیں، اس سے بالکل بے خبر ہے۔ حظوظاتِ نفسانیہ میں شدت سے منہمک اور ہوا و ہوس سے مغلوب! جہاں بزم عیش دیکھی، اُدھر ہی کو دوڑنا۔ کہیں آہنگِ طرب سُنا، اُس میں شریک ہوتا۔ جہاں معلوم ہُوا کہ مجلسِ مستانہ ہے وہیں کے ہو لیئے۔ مگر شراب نہیں پیتا اور اُسے آبِ زہرناک تصوّر کرتا ہے۔ صرف سوسائٹی اور یارانِ جلسہ میں رہنے کا بہت شوق ہے اور کھانے کا تو دشمن ہے۔ رکابی میں کسی چیز کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ہر دل عزیز ہونے کی بہت خواہش کرتا ہے اور ہر شخص کے ساتھ ملاطفت سے پیش آنا چاہتا ہے۔ غرضکہ بزم آرا و شوق افزا ہے .... ناتجربہ کاری اور بے فکری کے خیالات رات دن اُس کی خدمت میں فخر کے ساتھ حاضر رہتے ہیں۔ اس میں تعجب کیا ہے؟ جوانوں کے لیئے دل لگی چاہیئے! وہ بھی اپنا دل بہلاتا ہے۔ وہ بھی روایت پرورد افکار کا محکوم ہے، کچہری ہفتے میں صرف دو تین دن جاتا ہے باقی تمام وقت لایعنی اشغال میں صرف کرتا ہے۔ دن بھر سُو سُو محلّوں کے چکّر لگاتا ہے اور ہر جگہ ایک محبوبہ سودا انتمار رکھتا ہے۔ اندیشہ و اضطراب کے اسبابِ مہالک سے بَری ہے۔ مستقبلِ زمانہ کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا۔ حال میں اپنی عمر کو ایک آہنگِ عاشقانہ کے ساتھ گزارتا ہے۔ کھاتا ہے، پیتا ہے اور پہنتا ہے۔ معشیت نے اس آوارہ مزاج پر اپنا دستِ تغلّب نہیں ڈالا۔ اپنے خیال میں وہ گویا اسی سوچ میں ہے کہ حیاتِ مسعودانہ کب اور کس طرح منظم کرے!

محاکماتِ فکریہ اور منافشاتِ وجدانیہ کو محکومِ تعب اور آرا سوز سمجھ کر اُن سے کلیتاً مُجتنب ہے۔ ہفتے یکے بعد دیگرے گذر جاتے ہیں اور وہ گھر میں نہیں آتا۔ گھر والے اس غیر حاضری پر کس اندیشہ و خلجان میں مبتلا ہوں گے۔ اس سے اپنے دماغ کو تکلیف نہیں دیتا۔ اگر وہ پریشان ہیں تو مَیں کیا کروں؟ مَیں بچّہ نہیں ہوں۔ اگر غیر حاضر رہتا ہوں، رہنے دیں۔

وہ شفقت پناہ عورت، جسے ماں کہتے ہیں، آنکھوں میں آنسو بھر کر اُس کی خوشامد کرتی رہتی ہے۔ وہ بھی تین منٹ کے لیئے متاثر ہو کر اپنی حالت پر افسوس کرتا ہے۔ مگر پرانی ہوائے محبت اس نقش کو بہت جلد زائل کر دیتی ہے۔ وہی مکر، وہی مشرب اپنی فرماں روائی پھر شروع کر دیتے ہیں۔

جو شخص کہ چند ساعت پہلے اپنی والدہ کے حضور میں محجوبیت اور ندامت کے ساتھ حاضر تھا، اب وہی اپنے پرانے شبانہ اشغال میں شریک ہونے کے لیے موجود ہے۔ شام کو دستر خوان کے گرد جمع شدہ خاندان میں ایک شخص کی عدم موجودگی کیسی عمیق سکوت کا باعث ہوتی ہے۔ والدہ پریشان اور اندیشہ ناک نظروں سے اپنے جگر پاروں کو دیکھتی ہے۔ بڑے بھائی کی غیر حاضری

---

[1] ترکی زبان کے نامور رسالہ "ثروت فنون" سے ترجمہ کیا گیا۔ حتی الوسع ترکی زبان کی طرز بیان اور ترکیب عبارت کا خیال رکھا گیا۔ (یلدرم)

کی وجہ سے دلگیر ہو کر چھوٹے چھوٹے بچے تھال کو معصومانہ سے کہتے ہیں (اماں ہم کھائیں ؟ بھائی تو آئے نہیں) بغیر کسی لطف اور لذت کے کھانا پیٹ میں ڈال کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

سب پڑوسی نوجوان کے انجام سے ڈرتے ہیں۔ اُس کی اصلاح کے متعلق اُس کی ماں سے سوال کرتے ہیں مگر افسوس ماں بے چاری کیا کرے ؟ وہ نصیحت سُنتا ہی نہیں۔ ہم کہہ نہیں چکے کہ وہ ہوا و ہوس سے مغلوب ہے۔ اُس کو اُس کے مشاغل سے باز رکھنا سخت مشکل ہے۔ ہوس نے اپنا سکہ جما رکھا ہے۔ بُرائیاں حکمرانی کر رہی ہیں اور طالع مساعد ہیں اور موافقت زیادہ۔ جوان کو ماں نے ایک تقریب سے دوسرے شہر میں بھیجا یا کہ شاید اسی ذریعے اُس کی آشفتہ مزاجی میں کمی ہو۔ وہ چلا گیا مگر اُسکے حرکاتِ مجنونانہ میں کوئی کمی ہوئی ؟ غلط غلط تخفیف نہیں ہوئی، بلکہ صرف عارضی سکون نے اُس کے دماغ کو فعالیتِ شہوانیہ سے سکتے میں ڈال دیا اولاً امورِ معشیت کیا چیز ہیں اور حیاتِ ساعیانہ کسے کہتے ہیں ؟ یہ اُسے بتانا شروع کیا۔ اُس کی خواہشیں زائل نہیں ہوئیں۔ صرف ذرائع مفقود تھے۔ حیاتِ ماضی اُس کے تخیئل سے وابستہ تھی۔ ہاں کبھی کبھی یہ بھی خیال دل میں جاگزیں ہو جاتا تھا کہ سیآت کسقدر آرام سوز اور طاقت فرسا ہیں۔ ان خیالات سے اُس کی پریشانی اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ مسائل مہمہ حیات پر غور کرنے سے اُس کی حالت بحران تک پہنچ جاتی تھی اور اُس زمانے میں بلا کسی کے پاس بھیجنے کے ارادے سے وہ عجیب خط لکھتا تھا جن میں لذتِ اشتغال کا محظوظیتِ خدمت، نشوۂ آرام سے بحث ہُوا کرتی تھی۔

انسانی طبیعت کا مختلف زمانے میں ہونا کیا کیا تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ آج جو غضب و تکدر اور اندیشوں میں ڈوبا ہُوا ہے، وہی کل نشوہ و خندۂ و بہجت سے ہم آغوش ہے۔ جو شخص ابھی ابھی حیاتِ سفیلانہ سے متنفر ہے، تھوڑی دیر بعد سفالت کے درجے سے بھی نیچے پڑا ہوتا ہے۔ ابھی جو اصلاح نفس سے بحث کر رہا ہے، کچھ تعجب بھی نہیں جو کچھ عرصے کے بعد وہی قعرِ معاصی میں گرا ہُوا ہے یہ محقق ہے ـــــ جوان کا بھی یہی حال ہُوا۔ اُس کی اُلجھن رفع کرنے کے لئے اُس کے چند دوست نما دشمنوں نے صلاح دی کہ شراب پیو! نوجوان اس کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ سرخوش لوگوں کے احوالِ رذیلانہ دیکھ کر اُسے شراب سے نفرت دائمی ہو گئی۔ اب کس طرح پی سکتا ہے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

افسوس اس ارادے پر ثابت قدم نہ رہ سکا اور اُن دوستوں کے اصرار کو رد نہ کر سکا۔ اُن کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور یہ سب لوگ سیدھے قہوہ خانے کے سامنے والے میخانے میں گئے۔ پہنچتے ہی اُس کے دماغ میں ایک کریہہ بُو داخل ہوئی۔ یہ میخانہ نہ تھا بلکہ مزبلہ گاہ معلوم ہوتا تھا۔ چھت بغیر چمنی کے لیمپ سے بالکل کالی ہو گئی تھی۔ ہر کونے میں مکڑے کا بڑا جالا بنا ہُوا تھا۔ زمین ایک بالشت کیچڑ میں دھنسی ہوئی تھی۔ میز کی جگہ پر ایک پرانا مستعمل مٹی کے تیل کا ایک صندوق رکھا ہُوا تھا جو تختے کے کوچ کا کام دے رہا تھا۔ اُس پر ایک متعفن، کریہہ المنظر ٹاٹ (جس نے نہ معلوم کس وقت سے پانی کا منہ نہ دیکھا تھا) پڑا تھا۔ شیشے، برتن، پیالے، مَیل کی وجہ سے نظر نہیں آتے تھے۔ تین چار عیاش میز کے گرد احاطہ کئے ہوئے پے در پے پی رہے تھے۔ یہ بھی اس زمرۂ بدمستی میں شامل ہو گئے اور جا کر بیٹھ گئے۔

جوان نے ایک مدید اور اسرار انگیز نظر سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر ایک معنی دار نظر اپنے ساتھیوں پر ڈالی اور کانپ کر پوچھا۔ "یہاں کیا ہوگا ؟" جواب ملا "عیش و طرب"! جوان نے ایک قہقہہ لگایا اور اُسکی آنکھوں میں برقِ تہور چمکی۔

اُس نے پوچھا "پھر؟" جواب دیا گیا۔ "پئیں گے"۔

"یہاں؟"

"ہاں!"

کانپ اُٹھا۔ محتشم مکلف عشرت جگہوں میں جب ایک قطرہ منہ میں نہیں ڈالا تو اس مُردار و نفرت انگیز مقام میں کیونکر پی سکے گا؟ اس آبِ زہرناک کو جو گہری کائی میں دبے ہوئے پیپے سے نکل رہی تھی کیونکر اپنے معدے میں اُتار سکتا تھا؟ غرضیکہ جوان کی حالت ایسی ہوگئی کہ گویا وہ ہرگز نہ پئے گا۔ لیکن بات دے چکا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ اپنی بات کی سچائی پر اُس نے کبھی تکرار کی تھی! اب اس کے خلاف اُس کے امکان سے خارج تھا۔ خیر! خیر نہ پئے گا۔ اس آبِ پُر اضطرار کو منہ میں نہ ڈالیگا۔

خدمت گاروں نے اُن کے ناپاک ہاتھوں سے اُن کے بیچ میں قدح اور شیشے رکھنے شروع کئے۔ اس بیت القسوہ، اس دارِ خباثت میں پینے سے مزہ کیونکر آ سکتا تھا۔ جوان نے پھر سب کی طرف دیکھا۔ اتنے میں ایک تیز آواز نے کہا "پانی لاؤ!"

"یہاں پانی کہاں؟ یہاں پانی سے مراد لوازمِ نوشانوش ہیں۔ جوان کسی طرح اپنے رفیقوں میں شریک نہ ہو سکتا تھا۔ وہ "آپکی صحت"۔ "آپکا شرف" کہہ کہکر اصرار کر رہے تھے مگر وہ پیالہ ہاتھ میں نہ لیتا تھا۔ چہرے پر تموجاتِ عصبیہ اور حسیاتِ نفرت ظاہر ہوتے تھے مگر افسوس! زبان سے نہ کہتا تھا۔

تردد، خلجان اور پریشانی کے ساتھ ہاتھ میں پیالہ لیا گیا۔ ایک لرزشِ خفی تمام جسم میں دوڑ گئی، جیسے بڑی سردی معلوم ہوتی ہو۔ اس طرح کہ اُس کے دانت بجنے لگے۔ بڑھایا ہوا ہاتھ بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ اصرار اور رجا نے اس دستِ متردد کو پھر بڑھایا مگر منہ تک لے جانے کی حالت میں یکایک پھر ٹھہر گیا۔ اختلاجاتِ وجدانیہ کی تاب نہ لا سکا اور کہا:۔

"نہ پی سکوں گا!" مگر ابھی پیالہ ہاتھ میں ہے۔

کیا جانئے کیا ہو؟ دو معنی دار نظروں نے اُسے گھور کے دیکھا اور پیالہ خالی کر دیا۔ اُس کے جسم میں ایک حرارت آئی اور اُسے اپنے پر اختیار نہ رہا۔ دُوسرے پیالے نے حرارت میں تخفیف کی۔ شیشہ خالی کیا گیا اور اب اسے نشوۂ بدمستی کا احساس ہوا۔

کیا تم یقین کرو گے؟ متاسف ہے۔ آیا پینے سے؟ اور شاید اسی وجہ سے کہ اچھی جگہوں میں نہ پی اور پی تو یہاں!!

نشوۂ خمار نے فریفتہ کر دیا۔ میدان پاکر پینا شروع کر دیا۔ یہی ہوتا ہے۔ بات پہلے ہی مرتبے کے نہ پینے میں ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔ جوان اُس وقت سے اپنی زندگی زہریلی کر رہا ہے ——!!

اے مادرِ وطن

(ایک تُرک کا خطاب اپنے وطن سے)

تیرے بچے مصیبت و فلاکت کے سمندر کی سب سے زیادہ تاریک گہرائیوں میں ڈوب رہے ہیں۔ ان کے سینوں سے خون کے فوارے نکل رہے ہیں اور وہ دل خوں اور سینہ چاک تیرے ہم نگر بزم قلب میں جمع ہوگئے ہیں۔ اپنے سینے کو کھول، اے تیرہ خاک! اور اپنے شہیدوں کے لئے جنہوں نے تیرے چھوٹے سے روڑے کی خاطر، لمبے لمبے زخم کھائے مگر دشمن کو تجھ سے دُور رکھا۔ ہمارے بہادر آباو اجداد کے پہلو میں جگہ تیار کر!

تیری متروک، تیری خشک، تیری فراموش شدہ پتھریلی وادیوں کو سفید ریش بڈھوں سے لے کر معصوم ترک بچوں تک کا اپنے آنسوؤں سے تر کرنا کیا کافی نہیں ہے؟

کیا تو ہم سے ناراض ہوگئی ہے اے مادرِ وطن! اس بے گناہ، اس مرد قوم سے نہ پوچھ کہ کن قزاقوں نے، کن خائنوں نے اپنے پاؤں سے تجھے پامال کیا، تیری ہڈیاں توڑیں، کن درندوں نے اپنے ناخنوں سے تجھے مجروح کیا۔

اے مادرِ وطن! تو جو نیلی موجوں کی آغوش میں سو رہی ہے۔ جس کی سحر لطیف، جس کے بادلوں کی رفتار دلبر وحشی آور ہے۔ تو ہمیں یتیم چھوڑ کر کن بے گانہ آرزوؤں کے تعاقب میں جا رہی ہے!

سُن! تجھے نہ محتشم قدیم روما، نہ فیلسوف قدیم یونان نے ایسے وفا کار، ایسے پُرآتشیں، ایسے نفس واپسیں کے جذبے سے چاہا ہے جیسا ہم چاہتے ہیں، اور نہ کوئی قوم مستقبل میں چاہ سکتی ہے۔ ترکوں کی سب سے زیادہ دل دوز خشوع تفرع، ترکوں کے منزہ مجرد امید و استغراغ تیرے لئے ہیں۔ ترک، تیرے لئے زندہ رہتا ہے، تیرے لئے مرتا ہے، تیرے لئے برباد ہوتا ہے، تیرے لئے آہ وزاری کرتا ہے۔ سب تیرے لئے!

کسے معلوم ہے کہ تیرے خمیر میں کتنے ترک شہدا کا خون ہے جنہوں نے اپنے قیمتی قطرہائے خون تیرے سینے پر گرائے۔ کتنے ترک سپاہیوں کی ہڈیاں ہیں جنہوں نے اپنی جان و شان تیرے قدموں پر فدا کر دی۔ تیرے سینے پر جان دینے کے لئے اور اپنی ہڈیاں تیرے سپرد کرنے کے لئے صدہا سال تک، غربت زدہ، آبلہ پا، رہ پیما۔ خستہ اور اس پر بے یار و مددگار ترک آئے گا۔

اس خطرناک زمانے میں، وہ باعظمت ترک فاتح جو تیرے لئے "شہید" ہوئے اور جنہوں نے تیرے لئے مرنا

ہی اپنی مکافات ابدی سمجھی' ان کی رُوحیں تیری لطیف ہوا میں، تیرے افق پر جہاں دشمن کے تاریک سائے پڑ رہے ہیں، پھر رہی ہیں۔ ماضی کی وسعت میں یہ خاموش مگر معظم رُوحیں آ رہی ہیں اور تیرے زندہ فدائیوں کی بلند پیشانیوں کو اپنے پرّاں بازوؤں سے مس کرتی ہیں۔

ہماری قسمت میں اگر جینا ہے تو تیرے لئے جینا ہے۔ لیکن اگر قسمت میں یہ ہے کہ ہمارے قلب کے نازک ترین احساسات کو دشمن اپنے ہاتھوں سے ٹھیس لگائے کہ بہتر یہی ہے کہ ہمیں مار ڈال اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اے تیرہ خاک! اپنے میں دفن کر لے!

اے مادرِ وطن! جو دن تیرے لئے خطرہ کا دن ہو، اس دن وہ معصوم سر، جو پالنے میں بلند ہو رہے ہیں' ان سب سے لیکر ان کہنہ کمروں تک جو مزاروں کی طرف جھک رہی ہیں، سب اپنا خون تیرے لئے بہانے کو تیار ہیں۔ اس دن وہ موت کے ڈراؤنے چہرے سے الفت کرتے ہیں۔

اے کمال کی، اے مدحت کی ماں! اے فاتح، اے سلیم کی آغوشِ خواب! اگر تیرے پاک گوشوں میں، تیری منزہ و صاف محرمیت میں کسی بے ادب کا قدم داخل ہو جائے تو ہم سب، ہمارا سرفروش انور، ہمارا بہادر نیازی، ہمارا مصطفیٰ کمال اعظم، ہماری شیر فوج کے ساتھ، مرد و عورت، یتیم بچے سب کے سب اس نجس اجنبی قدم کو تیرے پاک سینے سے ہٹا دیں گے۔ لیکن اگر نہ ہٹا سکیں تو ہم تیرے سب سے بڑے گڑھے میں گڑ جائیں۔ مگر اس وقت تو ہمیں ایسا گہرا گاڑ دو کہ تیرے نرم سینے میں دشمن کے ناخن پڑیں تو ہمیں احساس نہ ہو۔

نہیں، نہیں۔ اگر تو ہماری ماں ہونے سے گریز کرتی ہے، تو تو بھی ہماری طرح محو ہو جا۔ اپنے شاندار محلوں، اپنے اُونچے گنبدوں، اپنے پُر اسرار جنگلوں، اپنے شاداب مرغزاروں سمیت محو ہو جا!

تعرِ دُنیا کی سب سے تاریک سب سے دُور تنہائی میں جا سو۔ نہ انسانوں کے حافظے میں، نہ کتابوں کی سیاہ تحریر میں تیرا نام و نشاں باقی رہے!

ہم سب کے ساتھ، تو بھی ان معموروں کو لے کے جو راکھ ہو چکے ہوں، کتمِ عدم میں چھپ جا!

(خالدہ ادیب خانم)

سرسری انصاف

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

افراد ڈرامہ

جج - ملزمین - گواہ - وغیرہ وغیرہ

عدالت کا کمرہ

(حاضرین:- علاوہ اشخاص بالا کے چند طالب علم اور چند پروفیسر)

وکیل سرکار:- حضور والا، ملزم نمبرا پر یہ الزام ہے کہ وہ باوجودیکہ ایک درس گاہ کا پروفیسر ہے۔ شراب پیتا ہے۔ میں گواہ پیش کروں گا۔

جج:- یہ پرائیویٹ معاملہ ہے، اور قابل مواخذہ نہیں۔ ملزم بری کیا گیا۔

وکیل سرکار:- ملزم نمبر۲ پر الزام ہے کہ اکثر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں۔ گواہ پیش کروں گا۔

گواہ نمبرا:- میں نے اسٹاف کلب میں اسے وجود باری تعالیٰ کی تائید میں گفتگو کرتے سُنا۔

گواہ نمبر۲:- میں نے ایک موقع پر اسے ایک منکر خدا پروفیسر سے بحث کرتے دیکھا، دوسرے موقع پر وہ طلباء کے ایک مجمع میں طلبا کو تلقین مذہب کر رہا تھا۔

جج:- الزام سنگین ہے اور ثابت ہے۔ ملزم کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ جس طرح گاندھی جی، ہفتے میں ایک دن خاموش رہتے ہیں، وہ برابر سال بھر بالکل خاموش رہے۔ ظاہر ہے کہ اس سزا کی وجہ سے وہ کلاس میں لکچر بھی نہ دے سکے گا۔ تنخواہ اس کو برابر ملتی رہے گی

وکیل سرکار:- ملزم نمبر۳ پر یہ الزام ہے کہ اس نے ایک لڑکی سے شادی کرنی چاہی۔ اور جب اس لڑکی نے یہ شرط کی کہ وہ اپنی بیوی کو اوّل طلاق دے دے تو ملزم نے اپنی بیوی کو بلا قصور محض اس لڑکی سے شادی کرنے کے لئے طلاق دے دی۔

جج :- فعل جائز ہے اور آج کل کے زمانے میں ممدوح - ملزم بری کیا جاتا ہے۔

وکیل سرکار :- ملزم نمبر ۴ پر یہ الزام ہے کہ اس نے پہلی بیوی کی موجودگی میں جس کی وفاداری اور ایثار ضرب المثل ہے اور جو اس کی عسرت و تنگی کے زمانے کی ساتھی ہے، مگر بدقسمتی سے ملزم کے قریب قریب ہم سن ہے۔ محض یہ بہانہ ڈھونڈ کر، ایک کمسن لڑکی سے نکاح کیا ہے کہ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں اور وہ اوہام میں مبتلا ہے - گواہ حاضر ہیں۔

جج :- ملزم نے ایک مباح کام کیا ہے - تعجب ہے کہ ایک ایسے الزام پر ملزم کا چالان کیا گیا - ملزم باعزت طریقے سے رہا کیا جاتا ہے، اور عدالت حکام متعلقہ سے سفارش کرتی ہے کہ چونکہ ملزم کے مصارف میں اس نکاح سے اضافہ ہو گیا ہے اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ کیا جائے - اور "ہنی مون" کے لئے ایک معتد بہ رقم یک مشت منظور کی جائے۔

وکیل سرکار :- ملزم نمبر ۵ پر یہ الزام ہے کہ وہ اخبار "واقعات" کو پڑھتا دیکھا گیا۔

جج :- شہادت موجود ہے؟

وکیل سرکار :- حضور جتنے گواہ مانگیں حاضر کئے جا سکتے ہیں - فی الحال دو گواہ حاضر ہیں۔

جج :- پیش کرو۔

گواہ نمبر ۱ :- میں نے ملزم کو اخبار "واقعات" پڑھتے اپنی آنکھ سے دیکھا - ملزم پڑھتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا خوب لکھا ہے۔

گواہ نمبر ۲ :- میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ملزم ایک خاتون کی ایک نظم جو حال ہی میں اخبار "واقعات" میں شائع ہوئی ہے، بہت سے لوگوں کو سنا رہا تھا - نظم کی داد دے رہا تھا اور بعض بعض اشعار پر اس کی آنکھ پُرنم بھی تھی۔

جج :- جرم سخت ہے اور عبرت انگیز سزا کے قابل ہے - لہٰذا عدالت یہ سزا تجویز کرتی ہے کہ مجرم اخبار "جمود" کو خریدے اور از اول تا آخر اسے پڑھا کرے۔

وکیل سرکار :- ملزم نمبر ۶ پر یہ الزام ہے کہ موجودہ نظم و نسق پر نکتہ چینی کرتا تھا اور جب اسے روکا گیا تو اس نے کہا کہ میرا مقصد اصلاح ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ حالات حکام وقت کے کانوں تک پہنچ جائیں۔

جج :- کسی گواہ کی ضرورت نہیں - ملزم کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ شہر بدر کر دیا جائے۔

وکیل سرکار :- ملزم نمبر ۷ پر یہ الزام ہے کہ وہ سوتے میں بڑبڑا رہا تھا کہ الٰہی اس درس گاہ کی حالت بہتر ہو۔

ملزم :- حضور! میں تو سوتے جاگتے حکام درس گاہ کا بہی خواہ ہوں۔

وکیل سرکار :- جرم اسی لئے تو شدید ہے کہ جاگتے میں خیر خواہی کا دم بھرتا ہے، مگر سوتے میں دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے - جاگتے میں حضور رس اور عمدہ جاسوس رہا ہے اور اس لئے نہایت دھوکے سے اس نے اعتماد حاصل کر لیا ہے — گواہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

جج :- پیش کرو۔

گواہ :- میں ملزم کے کمرے میں رہتا ہوں - سونے سے قبل ملزم بڑے جوش سے حکام برسر اقتدار کی تائید و مدح

میں تقریر کر رہا تھا اور کہتا تھا کہ جو میرے مخالف ہیں ان کی مخالفت کا مزہ چکھاؤں گا۔ پھر ہم دونوں سو گئے۔ کچھ دیر بعد اتفاقاً میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ملزم جو تقریر سوتے وقت کر رہا تھا، اس کے برخلاف بڑبڑا رہا ہے۔ کہہ رہا تھا۔ ہوں! ابھی مطلب نکالنا چاہیئے۔ خُر، خُر، کچھ پروا نہیں، اگر طالب علم مجھے بُرا سمجھتے ہیں۔ امتحان، خُر، خُر، پاس کروں۔ حکام درس گاہ بڑی، خُر، خُر، نوکری مجھے دلوا دیں گے۔

جج:۔ دوسرے گواہ کی ضرورت نہیں۔ جرم ثابت ہے۔ ایک ہفتے تک مجرم کو سونے نہ دیا جائے۔

وکیل سرکار:۔ ملزم نمبر ۸ پر الزام ہے کہ وہ حکام وقت کی تائید کر رہا تھا مگر خندۂ زیر لب کے ساتھ جس کا اثر سُننے والوں پر اُلٹا پڑ رہا تھا۔ گواہ پیش کرتا ہوں۔

گواہ:۔ جی حضور، اس کی گفتگو تائید میں تھی، مگر اس کے چہرے سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ طنزاً یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔

جج:۔ یہ تمہیں کیسے معلوم ہُوا؟

گواہ:۔ حضور، میں نے علم قیافہ ملزم ہی سے پڑھا ہے۔

جج:۔ صحیح، کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد، اچھا، ملزم کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ تا عمر برقع پوش رہے۔

وکیل سرکار:۔ ملزم نمبر ۹ پر یہ الزام ہے کہ اس کے نام ظفر احمد کا پہلا جُز ایک معتوب آدمی کے نام کے پہلے جُز کے مطابق ہے۔ ملزم نمبر ۱۰ کو بھی میں باجازت حضور، اسی وقت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ اس کی نوعیت جرم بھی یکساں ہے۔

وکیل سرکار:۔ ملزم نمبر ۱۰ کا نام محمد فاروق ہے۔ ملزم کے نام کا جُز ثانی اس معتوب آدمی کے جُز ثانی کے ہم معنی ہے۔

دونوں ملزم:۔ (یک زباں ہو کر) حضور، یہ ہمارے والدین کا قصور ہے، ہمارا نہیں۔

جج:۔ خاموش، اس عدالت کا اصول ہے۔ کرے کوئی بھرے کوئی۔ خیر یہ تو اس عدالت کا اصول ہے، مگر فطرت کا قانون بھی یہی ہے کہ وہ والدین کے گناہوں کی پاداش، اولاد کو بھگتتی ہے۔ مگر یہ عدالت، نوعیت جرم کا خیال کر کے، اور یہ خیال کر کے کہ اس جرم کے بانی تم لوگ نہیں ہو، ہلکی سی سزا تجویز کرتی ہے اور وہ یہ کہ تم دونوں ظفر اور فاروق کو اپنے نام سے نکال دو۔ ظفر احمد کا نام آیندہ سے امیر احمد ہوگا اور محمد فاروق کا نام محمد حسن۔

تمام ملزمین، وکیل سرکار اور حاضرین (یک زباں ہو کر) زندہ باد عدالت، پایندہ باد عدالت!

جج تعظیماً و متشکراً ملزمین و حاضرین کی طرف سر خم کر کے اپنے ریٹائرنگ روم کی طرف چلا جاتا ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

(غیر مطبوعہ)

سفر حجاز

اعرابی ترکستان جا رہا تھا، خدا اسے کعبہ پہنچا رہا ہے۔ میں انگورہ اور قسطنطنیہ کا ارادہ لے کر دل میں اٹھا مگر اب کعبہ نے کعبہ کی طرف منہ پھیر دیا۔

اعزہ و اقربا، میرے شوق سفر کے ہمیشہ مخالف رہے۔ کسی کے نزدیک یہ اسراف میں داخل، کسی کے خیال میں میری صحت اس کی اجازت نہیں دیتی، مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب میرے عزم حجاز پر بھی مخالفت کی آوازیں میرے کان میں پڑیں۔

بیوی منہ پھلائے ہوئے ہے، بھائی کہہ رہے ہیں "اس سن و سال میں صعوبات سفر برداشت کرنے کی تم میں طاقت نہیں"۔

دہرہ دون نے، اہل وطن نے سرد مہری کے ساتھ، مگر تعلقات دیرینہ کو نبھا کر، افغان سرداروں نے گرمجوشی سے رخصت کیا، اور عادت قدیم کے مطابق، آخری سلسلہ کے لئے میں آستانۂ علی گڑھ پر حاضر ہوا۔ سر راس مسعود نے مسافر نوازی کی۔ ۲ فروری کو میں علی گڑھ سے روانہ ہوا۔ لکھنؤ کے اسٹیشن پر عزیزی عثمان حیدر، اور عزیزہ محمودہ سلطانہ (مسز عثمان حیدر) جو بلاد اسلامیہ کی سیاحت سے حال ہی میں واپس آئے ہیں، خدا حافظی کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ اور ان کا صمیم قلب سے کہا ہوا "بسفر رفتنت مبارک باد" اب تک کانوں میں گونج رہا ہے۔

بمبئی کے وکٹوریہ ٹرمنس پر عازمان حجاز کے لئے مطوفین موجود تھے۔ مگر ایک انگریزی ہیٹ پہنے ہوئے مسافر کو، وہ عازم حجاز کب تصور کر سکتے تھے۔ میری طرف کوئی متوجہ بھی نہ ہوا۔ میں اپنے دوست محی الدین خان آزاد بیرسٹر کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ آزاد کا گھر، حج کو جانے والے مسافر کے لئے شاید موزوں نہ خیال کیا جائے۔ مگر بے ریا دوست کی چھیڑ "آپ کو دیکھئے، حج کو جا رہے ہیں! میرے گھر کو حاجیوں سے کیا تعلق؟" بہت سی پُر تفنن خوش آمدید سے زیادہ خوش آئند تھی۔ قیام بمبئی کا تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ میرے پیر میں سخت موچ آگئی، جس سے پاؤں ورم کر آیا اور چلنا دشوار ہو گیا۔ آزاد کا فلیٹ تیسری منزل پر ہے جس پر چڑھنا اترنا تکلیف مالا یطاق تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ایک عزیز بزرگ جو حج کو جا رہے ہیں، جہاں ٹھہرے ہیں میں بھی وہیں جا ٹھہروں۔ اس طرح جعفر سلیمان کے مسافر خانہ میں پہنچا اور اس کی پہلی منزل میں مقیم ہوا۔ یہاں فضا ایک دم بدل گئی، ہر طرف عمامہ پوش، نورانی چہرے نظر آ رہے تھے۔ مسافر، مسافر کہہ کر نہیں پکارا جاتا تھا، بلکہ حاجی کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ سینما اخبار، تھیٹر کا یہاں ذکر نہیں۔ مسجد کے مختصر مگر خوش نما صحن میں سب میں سب مسافر جمع ہوتے ہیں۔ یہ سب مسافر ایک ہی شہر کو جا رہے ہیں۔ ان سب کی منزل مقصود ایک ہے ارض حجاز۔ کوئی کسی سے یہ نہیں پوچھتا کہ آپ کہاں جائیں گے، صرف یہ پوچھتے ہیں کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ میرے عزیز دوست عبد الرحیم صاحب دستکار جو ہر اسلامی کام میں شوق سے

حصہ لیتے ہیں، انجمن اسلام کے وہ سیکرٹری، حج کمیٹی کے وہ ممبر مجھ سے ملتے ہی ایک تہیہ کر بیٹھے ہیں۔ وہ اور حاجی حسین علی صاحب وائس پریذیڈنٹ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں اور بالآخر پریذیڈنٹ حج کمیٹی کی طرف سے مجھے اطلاع ملتی ہے کہ جہاز "رحمانی" جو عازمان حج کو ۲ مارچ کو لے کر بمبئی سے روانہ ہوگا، تم اس کے امیر الحج مقرر کئے گئے۔ تم کو لازم ہے کہ مسافروں کے آرام اور آسائش کی کوشش کرو اور ان کی شکایت کپتان جہاز سے بیان کرو۔"

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند!

۲ مارچ ۱۹۳۵ء :- مسافران جہاز کا آج طبی معائنہ ہے یعنی جن صعوبات کے لئے عازم حجاز کو تیار رہنا چاہیئے یہ ان کا پیش خیمہ ہے۔ فرسٹ کلاس، سیکنڈ کلاس، تھرڈ کلاس، ہر کلاس کے مسافر حاجی جمع ہیں۔ کشمکش ہے۔ سب ایک بڑے پوسٹ ہال میں جمع کئے گئے۔ سو دو سو کے بیٹھنے کے لئے بنچیں اور باقی چھ سات سو زمین پر اکڑوں بٹھائے جا رہے ہیں۔ پولیس کمشنر، متعدد ڈاکٹر، محکمۂ محافظ حجاج کا تمام اسٹاف، خود محافظ صاحب اور تمام ممبران حج کمیٹی جمع ہیں ....

ممبران حج کمیٹی کا اس موقع پر موجود ہونا، حجاج کی بہت سی تکلیفوں کو دور کر دیتا ہے مگر دو۔ دو تین تین جگہ مسافروں کا روکا جانا اور پھاٹک سے ایک ایک کر کے داخل ہونے دینا بہت تکلیف کا باعث ہے۔

مجھے مسز شفیع طیب جی کو جو حج کمیٹی کی رکن ہیں، یہاں موجود پا کر بہت خوشی ہوئی۔ خاتون موصوف مصروف انتظام تھیں اور ان عورتوں کو جو حج کو جا رہی تھیں، خاص طور پر نگرانی کر رہی تھیں۔

۳-۴ مارچ ۱۹۳۵ء :- جہاز کل دس بجے رات کو بمبئی سے روانہ ہوگیا۔ صبح کو میں نے جہاز کا جائزہ لیا۔ اور ہوا اس سفر میں تو چند مقتدر ہستیوں کا ساتھ ہے۔ سر نظامت جنگ بہادر، اور بمبئی کے قونصل جنرل افغانستان اور مسعود علی صاحب ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج (یہ حضرت حیدر آباد کے حجاج کے قافلہ سالار ہو کر جا رہے ہیں) ہم سفر ہیں۔

اس جہاز اور دوسرے جہازوں میں جن پر اس سے قبل سفر کرنے کا مجھے اتفاق ہوا، کس قدر فرق ہے۔ جو جہاز سوئز کو جاتے ہیں۔ اُن کی آراستگی، صفائی اور انتظام اور جہاز کی بے ترتیبی، چپقلش اور عدم نظافت دیکھ کر یہ گمان ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ کسی انگریزی کمپنی کا جہاز ہے۔

میں اپنے کیبن میں جس وقت داخل ہوا، ایک سفید ریش بزرگ نے پوچھا :-

"آپ بھی اس کیبن میں ہیں؟"
"جی ہاں!" اور آپ بھی اس کیبن میں ہیں
"جی ہو"
"جی ہو" سے مجھے دلچسپی پیدا ہو گئی۔
"جی ہو" نے مجھ سے سوال کیا :-
"آپ کیا معاملہ کرتے ہیں"؟
میں نے اس سوال کو نہ سمجھا۔

انہوں نے میری صورت سے سمجھ کر کہ سوال اس کی سمجھ سے بالاتر ہے، توضیح فرمائی :-

"آپ کا کیا بیوپار ہے؟

میں نے بتایا کہ غلامی یعنی نوکری۔

"جی ہو" ایک بڑے سیٹھ ہیں۔ ایک بی بی پچھلے جہاز سے جدہ بھی جا چکی ہیں، ایک ساتھ ہیں۔

"آپ کا قائم مقام کہاں ہے؟"

تھوڑے سے تردد کے بعد میں سمجھا کہ "قائم مقام" کا مطلب ہے وطن۔

اس برانڈہ پر شام کو ڈنر سوٹ پہنے ہوئے مرد، دلربا ٹوائلٹ (تزئینات) کے ساتھ لیڈیز نظر نہیں آئیں۔ پیانو کی، وائلن کی آواز سنائی نہیں دیتی، اِدھر اُدھر لحن عربی میں قراتِ قرآن ہو رہی ہے۔

یہ سب کچھ ہے مگر سات سو، آٹھ سو آدمی کس ابتری میں فریضۂ نماز ادا کر رہے ہیں۔ کھڑے ہونے تک کو جگہ نہیں۔ ان عبادت گزار مسلمانوں کو، نصرانی ادارہ، نصرانی کپتان، نصرانی اور ہندو خدام ارض موعود کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کی ٹرینوں میں جہاں سو میں سے نوے مسافر غیر مسلم ہیں، مسافرانِ حجاز جس حالت میں آتے ہیں....... مگر بمبئی سے جو جہاز زائرین کو لے کر چلتے ہیں۔ کیا ان کی بھی یہی کیفیت ہونی چاہیئے؟

دل میں بے اختیار آرزو پیدا ہوتی ہے، کاش مسلمانوں کی کمپنی ہو۔ اردو مسلمان ہو، عملہ مسلمان ہو، کپتان مسلمان ہو۔ ڈیک پر ایک جگہ مخصوص ہو جہاں جا سے نمازیں پڑھی ہوں۔ جہاں سے پانچ وقت صدائے اذان بلند ہوتی ہو۔

تو کس دھوم سے چل کے مکہ میں رج ہو

فطرت جواں مردی!

(ترکی ادیب مفاخر بے کے ایک افسانے کا ترجمہ)

بیرام (عید) چھوٹے بچوں کے لئے روز فیروز مسرت ہوتا ہے اور نورسیدگان بشر کے واسطے فخر ومباہات کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بچے کس سرور بے اندازہ سے اس دن کا استقبال کرتے ہیں۔

الغرض یہ یوم مسعود پہلی بہار ہے۔ اس دن کی کشاکش اور لطافت ننھے ننھے دلوں میں طرح طرح کے نامتناہی حیاتِ شادمانی بھر دیتی ہے اور بچے ایک طفلانہ رغبت کے ساتھ اس صبح سعادت کو لباسِ فاخرہ پہن کر، جو معصومانہ مگر ایک دوسرے سے جُدا رنگ کے ہوتے ہیں، غرور کے انداز سے گلی کوچوں میں پھرتے نظر آتے ہیں۔

جا بجا بازاروں اور میدانوں میں یہ رنگین جماعتیں، یہ الواحِ لطیف ایک عجب نظر رُبا لالہ زار معلوم ہوتے ہیں جو آنکھ کے ذریعہ سے دل میں حسِ فرحت و بہجت پہنچاتے ہیں۔

مگر کیا ان بچوں میں تم سب کو خوش، سب کو کامگار خیال کرتے ہو؟ آہ! اگر تحقیقات کرو تو ان ننھے ننھے دلوں میں بعض ایسے ہوں گے جن میں وہ دریائے خون موجزن ہوگا کہ جس کی گہرائی دیکھ کر تم بھی خوفزدہ ہو جاؤ۔

بہ اعتبارِ عام یہ دن مسرت کا دن تھا اور لڑکے خوشی میں اُچھل رہے تھے۔ لیکن ان میں ایک پانچ برس کی لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی کا سر اوروں کی مانند مزین و رنگین نہیں کیونکہ بیچاری یتیم ہے۔ چھ مہینے ہوئے کہ بیچاری کا شفقت کرنے والا باپ مرگیا، جو اُسے اُس کی ہم عمروں کی طرح اچھے اچھے کپڑے پہناتا۔ صرف ماں کی آغوشِ مرحمت اور وہی اُس لڑکی کی التجاگاہ ہے۔ مگر وہ بدبخت بھی اپنے نوجوان خاوند کی دائمی جدائی اور حیات فرسا ہجران اور اُس کی وجہ سے احتیاج و تنگیٔ معاش سے بسترِ الم و اضطراب میں پڑی رہتی تھی۔ اس عورت نے جو تھوڑے ہی دن ہوئے کہ حسین و دلربا تھی، عید سے ماقبل شام کو، جب کہ صدائے توپ نے اعلانِ عید کیا، چھوٹے بچے کو گود میں لیکر بوسوں کی بھرمار کردی۔ کون جانے۔ کتا ہے کہ بیچاری عورت کو کیا حیات پر ناامیدی تھی جس کی وجہ سے لڑکی کے رخسار پر گرم بوسوں کے ساتھ گرم آنسوؤں کا تار بندھ گیا تھا۔ بچی نے پوچھا۔ "اماں کیوں روتی ہو"؟

"کچھ نہیں میری بچی! یونہی دل بھر آتا ہے"!

"نہیں! ہمارے ابا کو روتی ہو! کیا نہیں اماں؟ آفندی بابا ــــ بہت دن سے گھر میں نہیں آئے۔ اُس دن خاموش ایک جگہ گئے تھے۔ تم نے کہا تھا گڑیا لائیں گے۔ جب سے اب تک نہیں آئے۔ تم نے کہا تھا: دور گئے ہیں"!

لڑکی کی ان معصومانہ باتوں نے دل دکھی ہوئی ماں پر ایسا فوق العادت اثر کیا کہ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ مایوس والدہ کی بکائے حزن دیکھ کر لڑکی بھی رو دی۔ اس نے ماں کے رونے پر وہ کام کیا جو آگ پر تیل کرتا ہے۔ جب ماں اپنے آنسوؤں کا تمام ذخیرہ ختم کر چکی تو نوازش مادرانہ کے ساتھ اپنے جگر پارے کو سینے سے دبا کر خاموش کرنا چاہا۔

لڑکی پر ماں کی گود میں جاکر تاثرات الم سے ایک قسم کی بے ہوشی کی طاری ہو گئی اور تھوڑی دیر میں وہ سو گئی۔ تمام رات اس ننھے دل کے غم نے سینے کو ایک بے جان کی حالت میں رکھا۔

صبح سویرے جب بچی زمرۂ اطفال میں جاکر شامل ہوئی تو انہوں نے اسے دیکھ کر کہنا شروع کیا۔ "دیکھو دیکھو عصمت نے آج اچھے کپڑے نہیں پہنے اور صرف اسی قدر نہیں کہا بلکہ سب نے خوش خوش اور کود کود کے اپنی رنگین جاکٹیں اور چمکتے ہوئے بوٹ عصمت کو اس طرح دکھائے کہ بے چاری معصوم کے قلب رقیق پر حسن نومیدی ایک عجیب جگر سوز منظر میں منتج ہوئی اور اس نے ایک حد درجہ الم انگیز تبسم مایوسانہ سے گردن پھیر پھیر کر اپنے ساتھیوں کی قیمتی دل ربا جاکٹوں کو رشک کی نظر سے دیکھا۔

عصمت اپنی ماں کے پاس آئی اور ٹھنک ٹھنک کر شکایت کرنے لگی اور کہا "مجھے اور جاکٹ پہناؤ"! ماں نے ایک اطلسی جاکٹ، جو عصمت کے باپ کے زمانۂ حیات میں بنائی گئی تھی اور سینکڑوں مرتبہ پہنائی جا چکی تھی، ناچار اپنے نور عین کو اسی صورت سے خوش کرنے کے لئے پہنا دی اور اس کے ننھے ننھے خوبصورت پاؤں ایک پرانے بوٹ کے بورتے میں ڈال دیئے اور عصمت یہ کپڑے پہن کر باہر گئی مگر ہر شخص ایک نظر میں سمجھ لیتا تھا کہ یہ بے چاری بے کس و یتیم ہے۔

اچھی لڑکی اپنی ہمجولیوں سے الگ ایک گھر کی دیوار کے نیچے جا بیٹھی اور ٹکٹکی باندھ کے سامنے اس طرح دیکھنے لگی گویا اسے باپ کی صورت نظر آ رہی ہے۔

اسی درمیان میں ادھر سے گذرنے والے ذکی بے نے ننھی عصمت کے احوال پریشان کو دل سوزی کی نظر سے دیکھا اور نہایت شفیق اور نوازش کارانہ آواز سے پوچھا:-

"چھوٹی چھوٹی خانم! اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کیوں نہیں کھیلتیں؟"

"میرے پاس اچھے کپڑے نہیں ہیں، سب کہتی ہیں۔ دیکھو عصمت کے پاس کپڑے ہی نہیں۔ میرے بوٹ پرانے ہونے کی وجہ سے سب مجھ پر ہنستی ہیں!"

"اچھی بچی! انہوں نے ایسے نامناسب طور پر تمہیں ناراض کیا؟ میری بچی! کیا تمہارے ماں باپ نہیں ہیں؟"

"آفندی بابا تو گڑیاں لینے گئے ہیں۔ اماں کہتی ہیں بہت دور گئے ہیں۔ اتنی دور گئے ہیں کہ بہت دنوں میں آئیں گے۔ یہ کہکر روتی ہیں۔ بابا گھر میں آتے ہی نہیں!"

"ننھے فرشتے! اپنا گھر مجھے دکھا سکتی ہو؟"

عصمت نے اپنے چھوٹے ہاتھ ایک معصومانہ دلفریب طریقہ سے اٹھا کر سامنے کی طرف اشارہ کرکے کہا "یہ ہے"!

"اچھا! تمہاری اماں وہیں ہیں؟"

"ہاں! مگر بیمار ہیں۔ بستر پر پڑی ہیں"!

اس مکالمے کے بعد ذکی بے نے بچی کے تمام احوال متاثرہ سے واقفیت حاصل کر کے اپنے پاس نوکر کو بلایا۔ اور اُس سے چند باتیں آہستہ آہستہ کیں۔

دو گھنٹے بعد عصمت نہایت لطیف کپڑے پہنے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر خوش خوش آغوشِ مادر میں واپس آئی۔

اُس دن کے بعد سے ذکی بے کی اولادِ معنوی ہو کر عصمت نے اپنی ماں کے ساتھ زیر حمایت ذکی بے حیاتِ مسعودانہ گذارنا شروع کی۔ بارہ برس بعد عصمت صنعتِ قدرت کا عجب حسین نمونہ اور ایک گھر پر حکمرانی کرنے کے قابل ہو کر ایک جوان کے دستِ ازدواج میں سپرد و بختیار و کامران ہوئی۔

سنجر و غزالی[1]

عباسیوں میں مامون ہی وہ خلیفہ تھا جو محبت و حرمتِ علماء کے لئے خاص شہرت رکھتا تھا۔ علم و علماء کی دنیا میں جس مستثنیٰ موقع پر مامون متمکن تھا، اگر کوئی بادشاہ وہاں پہنچا ہے تو وہ سلطان سنجر ہے۔ سنجر قریب ساٹھ برس کے سریر آرائے سلطنت رہا۔ اس مدت میں وہ ایک مکمل کتب خانہ مہیا کرتا ہے[2]۔ یہی نہیں کہ علم و اربابِ علم کی عزت و حمایت اپنا خاص مسلک قرار دیتا ہے، بلکہ خود تحصیلِ علم حدیث کرتا ہے اور اس علم میں اس پایہ کو پہنچتا ہے کہ تاج الاسلام ابو السعد المعانی جیسا محدث اس کے تحدیثِ حدیث کرتا ہے۔ ابو سعد[3] وہ شخص ہے جسے ذہبی نے "محدث المشرق" کا لقب دیا ہے۔ محدث المشرق کا اس سے درسِ حدیث لینا سنجر کے قلم کی رفعت کو ظاہر کرتا ہے۔

سنجر نے ساری عمر ایک وقت کی نماز عمداً ترک نہیں کی اور اس طرح اپنے ہم عصر صاحبِ اتقا لوگوں میں بھی اس کا رتبہ بلند تھا[4]

---

[1] یہ مضمون استنبول یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے لئے ماہواری رسالہ "دار الفنون الٰہیات فاکولتہ سی مجموعہ سی" سے ترجمہ کیا ہے۔ صاحبِ مضمون شرف الدین بک استنبول یونیورسٹی میں تاریخ علم کلام کے پروفیسر ہیں۔

[2] و خزانہ کتب بادشاہِ عالم از کتب ہائے کہ تصانیفِ دیگراں است معمور است (مقدمہ السنجریہ فی الکائنات العنصریہ" مصنفہ عمر بن سہلان، کتاب نمبر ۲۶ ۵۴ - کتب خانہ فاتح)

[3] امام رافعی نے اپنی کتاب "التدوین فی اخبار قزوین" میں تاریخ قزوین کے سلسلے میں ابو سعد حمدانی کی تاریخ بغداد بغدادسے نقلاً سنجر کو زمرۂ محدثین میں درج کیا ہے اور سنجر کے مختصر ترجمہ حال کے بعد ابو سعد حمدانی نے سنجر سے جو حدیث روایت کی ہے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے - احمد بن الحسن بن محمد بن داؤد یہ بر بنائے اس تذکرہ کے لئے جو تاج الاسلام ابو سعد سمعانی نے سلطان سنجر بن ملک شاہ بن الپ الاسلام بن جغری - یہ القاب ہیں اور نامہ ابن میکائیل ابن مجوق ابو الحارث ہے - جزیرے کے شہروں میں شہر کلار میں اس وقت پیدا ہوا جب اُسکے باپ نے روم سے جنگ کی ہے اور یہ اپنے آباؤ اجداد کے ملک کا وارث ہوا ہے اور قریب ساٹھ برس کے اُس میں رہا۔ مستقل سکونت خراساں میں رکھتا تھا۔ عراق میں متعدد بار آیا ہے اور قزوین میں بھی اُترا - ابو سعد سمعانی اس سے حدیث روایت کی ہے وہ یہ ہے - ابو سعد نے کہا کہ ہم سے سلطان سنجر بن ملک شاہ نے حدیث بیان کی کہ اُن سے علی بن احمد بن محمد مدینی نے بطور اجازہ کے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا مجھے عبد الرحمٰن سامی نے خبر دی اور اُن کو ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ صفار نے خبر دی - اُنکو سلمہ بن سہیل ابن قاسم بن عیسیٰ طائی نے خبر دی - اُن کو رحمتہ ابن موصل عروہ بن ثابت سے، اُنہوں نے ابو الزبیر، ذلفرن نے جابرؓ سے روایت کی کہ جنابِ رسولؐ نے فرمایا ہے کہ ہر پیغمبر کے لئے ایک دعا مقبول ہے جس کو خدا نے قبول کرلیا ہے اور میں نے اپنی دعا اپنی امت کے لئے روزِ قیامت کے واسطے رکھ چھوڑی ہے -

[4] در ۵۱۰ھ والدۂ سلطان سنجر فوت شدہ افاضل علما و اعاظم فضلا جہت ادائے نماز بجنازۂ عہد علیا حاضر گشتند سلطان باآں جماعت گفت باید کہ از شما پیش نمازی کند - مدت العمر ترکِ فریضہ نکردہ باشد تمامی آں طائفہ توقف نمودہ بسلطان سنجر بنفس نفیس پیش رفت و با تسارکانی پادشاہ و سعادت انتما اقتدا کردہ نماز کردند (حبیب السیر، جلد ۲ - جزء ۴ - طبع بمبئی)

اُس کی علما نوازی کا یہ نتیجہ ہُوا کہ اُس زمانے میں علما نے مختلف علوم میں مستند کتابیں تصنیف کیں اور ان تصانیف کو بطورِ نشانِ حرمت و تعظیم اپنے حامی اور مربی سنجر کے نام سے معنون کیا[1]۔

خلیفہ مامون و سلطان سنجر دونوں حامیِ علوم و معارف تھے مگر فرق اتنا تھا کہ مامون بادم سنت، سنجر خادم سنت تھا۔ سنجر دین میں کسی بدعت کو قبول نہ کرتا تھا اور اُس کا فکر و مسلک صلابتِ دین کی محافظت تھا۔ مذہب حنفی بالخصوص صاحبِ مذہب امام اعظم کے ساتھ اُس کو حد درجہ اعتقاد تھا۔ بایں ہمہ برخلاف مامون کے فکر و اجتہاد میں جو علما اُس کے مخالف تھے اُن کی تعظیم و تکریم میں وہ کبھی کمی نہ کرتا بلکہ ہر شخص کی شخصیتِ علمیہ کے مناسب توقیر و احترام کرتا تھا۔ حضرت امام غزالی اکابرِ شافعیہ میں سے تھے۔ سنجر سے بعض لوگوں نے کہا کہ غزالی نے مذہب اہلِ سنت کے خلاف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سنجر نے اس کی تحقیق کی غرض سے امام موصوف سے بردق کوس جو مشہد کے قریب ایک مقام ہے تو نے اور اُس سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت غزالی جس وقت تشریف لائے، سنجر اُن کی تعظیم کے لئے سرو قد کھڑا ہو گیا اور ان سے بغل گیر ہُوا اور تخت پر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس احترام و تکریم کے باوجود اُس نے استفسار اور تحقیق مطلب میں کمی نہ کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اہلِ سنت کا کس قدر طرفدار اپنے مذہب میں کس قدر ثابت قدم اور حضرت غزالی نے اُس کے پہلے دعوت نامے کو قبول نہیں فرمایا تھا بلکہ جواب میں ایک معذرت نامہ بھیجا تھا اور جیسا کہ اُن کا قاعدہ تھا اس خط میں وعظ و نصائح زمانے تھے اور اُس کے بعد حاضر ہونے کی معافی چاہی تھی۔

خط کے بعد وہ خود کسی ضرورت سے مشہد تک تشریف لائے تھے اور چونکہ سنجر کا قیام اُس زمانے میں بھی بردق کوس میں پڑا ہُوا تھا۔ بادشاہ نے اُنہیں دوبارہ طلب کیا اور اُن سے ملاقات کی۔ یہ خط اس وقت تک ہمارے خیال میں کہیں شائع نہیں ہُوا ہے۔ عہدِ سلجوقیہ کے حالات پر اس سے روشنی پڑتی ہے۔ خاص کر حضرت غزالی اور سنجر کی نسبت سے بہت سے نقاط خصوصی بے نقاب ہوتے ہیں۔ یہ خط ہمیں جامعہ سلطان محمد فاتح کے کتب خانے کی ۵۷۲۶ نمبر کی کتاب میں ملا ہے جسے ہم عیناً درج ذیل کرتے ہیں۔

"ایزد تعالیٰ ملک اسلام را از ملک اسلام برخوردار گرداند نگاہ در آخرت۔ ملکے دہد کہ پادشاہی روئے زمین در وے حقیر و مختصر گردد کہ کارِ پادشاہی آخرت دارد کہ مملکتِ دنیا از مشرق تا مغرب بیش نیست۔ عمرِ آدمی در دنیا صد سال در اغلب احوال بیش نیست و جملہ زمین بہ نسبتِ بادشاہی کہ ایزد تعالیٰ کسے باید در آخرت کلوخ است و ہما نتاہی روئے زمین گرد و غبار آں کلوخ است، کلوخی و گردِ کلوخی را قیمت باشد و صد سال عمر را درمیانِ ازل و ابد و بادشاہی جاوداں چہ قدر شد کہ بداں شاد باشد و صد سال عمر را درمیانِ ازل و ابد جاوداں قناعت مکن و ایں برہمہ جہاں دشوار است و بر ملک مشرق آساں کہ رسُول می گوید۔ "یک روز عدل از سلطانِ عادل فاضل تر از عبادتِ شصت سال" چوں ایزد تعالیٰ ایں ساز و آلت داد کہ آنچہ دیگرے شصت سال تواند کرد تو بہ یک روز جتوانی کرد، چہ اقبال و دولت باشد زیادت ازیں و حالِ دنیا بداں چناں کہ ہست تا در چشم تو مختصر گردد

---

[1] دکانِ تونر اعلا و مجب العلم و اہلہ ولذ کر باسمہ کتب فی کل فن (التدوین فی اخبار قزوین۔ کتب خانہ لالہ لی۔ کتاب نمبر ۲۰۱)

که بزرگاں گفتند که اگر دنیا کوزهٔ زرین بودے که بنماندی وه آخرت کوزه سفالین بودے که بماندی - عاقل کوزهٔ سفالین باقی اختیار کردے - کیف که دنیا کوزهٔ سفالیست که بنماند آخرت کوزهٔ زرین که هرگز نشکند - عاقل چه گونه بود کسے که دنیا اختیار کند - این شغل نیک در اندیشید و همیشه پیش چشم دارد - امروز بجائے رسیده است که عدل یک ساعت به از عبادت صد سال است - بر مردمانِ طوس رحمتے کن که ظلم بسیار کشیده اند و غله از سرما و بے آبی نیامده است و روستا را هیچ چیز نماند، مگر پوستینے و مشتے عیال گرسنه و برهنه با فرزندان در تنورے شوند رضا مده که پوستینے شان باز کنند و اگر از ایشاں چیزے خواهند همگنان بگریزند و در میان کوه ها هلاک شوند و این پوستینِ شاں باز کردن باشد و حال این داعی بداند که پنجاه و سه سال عمر بگذاشت، چهل سال در دریائے علوم دین غواصی کرد تا بجائے رسید که سخن وے از اندازه فهم بیشتر اهلِ روزگار درگذشت - بیست سال در ایام سلطان شهیدِ روزگار گذاشت و از وے با اصفهان و بغداد اقبالها دید و چند بار میان سلطان و امیر المومنین رسول بود، در کارهائے بزرگ و در علوم ایں هفت صد کتاب تصنیف کرد - پس دنیا را چناں که بود دید و بجملگی بینداخت و مدتے در بیت المقدس مقام کرد و به سر مشهد خلیل الله ابراهیمؑ عهد کرد که نیز پیش هیچ سلطان نرود، مال هیچ سلطان نگیرد، و مناظره و تعصب نکند - دوازده سال بریں عهد مقام کرد و امیر المومنین و همه سلاطین وے را معذور داشتند، شنیدم که از مجلس عالی اشارتے رفته است بحاضر آمدن امتثال فرمان را بمشهد موسیٰ رضا آمدم و نگاه داشت عهد خلیل الله را به لشکرگاه نیامدم و برسر این مشهد می گوئی که اے فرزند رسول شفیع باش که ایزد تعالیٰ ملک اسلام را در مملکت دنیا از درجه پدراں خویش بگذارد و در مملکت آخرت بدرجه سلیمان برساند و توفیقش دهد تا حرمت عهد خلیل الله نگاه دارد و دل کسے که روئے از خلق بگردانیده است و بتوجه خدا آورده شوریده نکند و چنین دانستم که این بمجلس عالی پسندیده تر و مقبول تر است از آمدن به کالبد که کارے رسمی بے فائده است که روئے در حق تعالیٰ دارد اگر پسندیده است مرحبا و اگر بخلاف این فرمانے بود در عهده عهد شکستن نباشم که فرمان سلطان به اضطرار لازم بود فرمان را به ضرورت منقاد باشم - ایزد تعالیٰ بزبان و دل عزیز وے آں راند که فردا در قیامت از آن خجل باشد و امروز اسلام را از آں ضعف و شکستگی نبود، والسلام"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط پاکر سنجر کی طبیعت امام غزالی کی طرف سے کچھ مکدر ہو گئی اور اس نے تہیہ کیا کہ اُن کو بلاکر ضرور پوچھا جائے۔ امام غزالی کے جو علماء خلاف تھے اُردوگاہ میں سنجر نے اُنھیں پہلے سے جمع کر لیا تھا تاکہ اُن سے مناظرہ کریں مگر اُنھوں نے بھی سنجر سے یہ کہا تھا کہ "غزالی ایک صاحب ناموس ہستی ہے۔ یہ بات حضور کو وقتِ مناظرہ ثابت ہو جائے گی"۔ سنجر نے اپنے ارادے کو ان الفاظ سے امام غزالی پر ظاہر کیا: "آپ چونکہ اب مشہد میں تشریف رکھتے ہیں اور ہماری اردوگاہ بردق کوس میں ہے۔ اس مختصر سے سفر کا اختیار کرنا آپ کے لئے مشکل نہ ہوگا"۔ اس امر و اشارہ پر غزالی اُردوگاہ تک آنے کے لئے مجبور ہو گئے اور حضور سلطانی میں حاضر ہوئے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ سلطان نے کھڑے ہو کر تعظیم دی اور معانقہ کر کے اپنے ساتھ تخت پر جگہ دی اس پر حجۃ الاسلام پر ایک طرح کا خوف و ہراس طاری ہوا۔ بادشاہ نے ایک کم سواد ملّا سے جو اس وقت دربار میں موجود تھا کہا "قرآنِ کریم کی چند آیتیں تلاوت کرو!" ملّا نے یہ آیت شروع کی: "الیس اللہ بکاف عبدہ"۔ حجۃ الاسلام نے

کہا "ہاں"! اور وہ خوف وہراس تماماً زائل ہوگئی۔ پھر امام نے اس طرح بادشاہ کو مخاطب کیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین ولا عدوان الا علی الظٰلمین۔ بقائے ملک، اسلام باد۔ عادتِ علما اسلام کہ بہ مجلس ملوک، اسلام رسند آنست کہ فصلی گویند مشتمل بر چہار چیز، دعا و ثنا، نصیحت و رفع حاجت، اما دعا مذہب، آنست کہ بہ شب تاریک در خلوت با حق تو الی دعا بہ مناجات کردن اولاتر از آنچہ بر ملا بود بریا آمیختہ بود و در حضرت حق تعالیٰ ہرچہ خالص نیست مقبول نیست و اما ثنا ایں ہم لحن است کہ آفتاب بے نیاز است ازاں کہ بہ بلندی و روشنی وے بانگشتِ لشکرت کند جمال چوں بغایتِ کمال برسد بازار مشاطہ بشکند و دست مشاطہ بیکار شوند و مقصود از ثنا بالا دادن کار باشد وچگونہ بالا دہند حضرتے را کہ درجہاں بالا بلندیست کہ کسے را آں خلعت است کہ از غلامانِ ایں حضرت یافتہ است، پس مہم ترین ہمہ نصیحت است خوض در حاجت۔ اما نصیحت ولا نیست کہ منشور آں از حضرت رسول نویسند و وے گفتہ است "ترکت فیکم واعظین صامتاً وناطقاً والصامت الموت والناطق القرآن"! نگاہ کن تا ایں نصیحت گر خاموش بہ زبانِ حال چہ می گوید و آں نصیحت گر گویا بہ زبان حال چہ می گوید۔ مرگ خاموش چنیں گوید کہ ہر کہ آفریدہ است من درکمین گاہ اویم و کمینِ خویش ناگاہ بکشایم و از پیش ہیچ رسول نہ فرستم و اگر خواہید کہ شنود از دستِ عمل من بانسبت باہمہ گفتہ ام کہ باہمہ چہ خواہم کردن ملوک باید کہ در ملوک گذشتہ نگرد و امرائے گذشتہ، سلطان ملک شاہ و الپ ارسلان وجغری از زیر خاک بزبانِ حال ندامی کنند کہ یا ملکے یا قرۃ العین زنہار و زنہار کہ اگر بدانی کہ فرا سد چہ کار رسیدیم وچہ کارہائے ہول دیدہ ہرگز یک شب نخسپی و در رعیتِ تو یک کس گرسنہ و بکامِ خویش ہیچ جامہ بنوش و در رعیت تو ہر کس برہنہ و در اثنائے وصیت می گوید کہ از من یک کلمہ قبول کن و کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہموارہ در زیر زبان دار چناں کہ کس نہ شود در حال کہ باشی چنانچہ از یں ہیچ خالی نہ باشی کہ ایمان را بیخ بدیں استوار شود کہ در خبر است ایمان آب از طاعت خورد و بیخ وے از عدل و دوام از ذکرِ حق تعالیٰ بُود و بایں کلمہ اگر از عذابِ آخرت خلاص یابے نزد سوالِ قیامت خلد نیابی "کلکم راع کلکم مسؤل عن رعیت۔ وحدیث عمر بن الخطاب رض انجا بدرازی یاد کردہ بود، اختصار کردیم[۱]

بعد ازاں گفت با ملک شکر نعمت حق تعالیٰ بر خویش بگذار کہ نعمت چہار است ایمان و اعتقاد درست و روئے نیکو و خلق و فعل نیکو۔ ایں یکے بہ اختیار نست و آں ہر سہ ہدیہ خدا است و چو خدا عز ہر سہ از تو دریغ نداشت[۲]۔ تو نیز ایں چہارم از خویش دریغ مدار

---

[۱] یہ حدیث حضرت عمرؓ سے نہیں بلکہ ابن عمر سے روایت ہے۔ حدیثِ شریف اقتباس کے بعد اس طرح ہے:۔ والامام راع ومسؤل رعیتہ والرجل راع فی اہلہ ومسؤل عن رعیتہ والعراق فی بیت ۔ والمراۃ راعیۃ مسؤلۃ عن رعیتہا والخادم فی مال سیدہ راع ومسؤل عن رعیتہ قال حسبت ان قال والرجل راع فی مال ابیہ۔ م۔ش (بخاری شریف ۔ کتاب الوصایا)

[۲] اس سے جس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ سنجر حسن اعتقاد اور حسن اخلاق کا مالک تھا اس کا حسن صورت سے بھی متصف ہونا پایا جاتا ہے نیز اس سے حضرت غزالی کا اخلاق کے متعلق نظریہ اساسی کیا تھا یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ فی الحقیقت سنجر کے خوبصورت چہرہ پر آثار وصحتِ اخلاق ہویدا و قوت عیاں تھے۔ حلیتہ او گندم گون بود و لشاہ آبلہ داشت و محاسن تمام طولانی۔ عرضانی و بعضے از موئے شوارب انداظم آبلہ رفتہ و پشت و بالی تمام دراز غستہ و تمام جمیل و نیکو صورت و آثار رحمت در چہرۂ او ظاہر و لایم و بدلہا مرغوب!

(مجموعہ حافظ آبرو وابراہیم ہاشلہ ۱۹۱۹ء)

کہ از ہر سہ بزبان آمد ہر تو ناسپاسی کردہ باشی دیا امیران دولت کہ بپائے الیستادہ اید اگر خواہید کہ دولت پائندہ ومبارک باشد باید کہ دولت ازلی دولتے باز شناسید و بدانید کہ شمارا ملک دیگر است جز ایں ملک خراسان وآں ملک زمین وآسمانست فردا ہمہ را در قیامت در مقام سیاست بدارد و باشمہ گوید حق نعمت من چوں گذارید کہ قلوب الملک وخزائن اللہ وایں دل ملوک خزانہ حق تعالیٰ است کہ ہرچہ در عالم خاک پدید آورد از رحمت وعقوبت بواسطہ دل ملوک بود گوید کہ خزانہ خود بشما سپردم وزبان شما کلید آں خزانہ کردم امانت نگاہ داشتید یا خیانت کردید وہر کہ حال یک مظلوم بریں ملک پوشیدہ دارد در خزینہ خیانت کردہ است آمدیم بعرضہ کردن حاجت وحاجت دواست یکے عام ویکے خاص۔ عام آنست کہ مردمان طوس سوختہ وکشتہ (بودا ندازہ ظلم وتہمت) وہر چہ بود از سرما وبے آبے تباہ شدہ است۔ بر ایشاں رحمتے بکن کہ حق تعالے برتو رحمت کند۔ پشت وگردن مومناں از بلاء ومحنت گرسنگی شکست، چہ باشد اگر گردن مستوبان تو از ساخت وزر نشکند و، آ، حاجت خاص آنست کہ من دوازدہ سال در زاویہ نشستم واز خلق اعراض کردم پس فخر الملک رحمتہ اللہ مرا الزام کرد کہ نیشاپور باید شد۔ گفتم ایں روزگار سخن من احتمال نہ کند کہ ہر کہ دریں وقت کلمۂ حق بگوید در ودیوار عیاذات او برخیزد۔ امروز کار بجاے رسید کہ سخن ہائے می بشنوم کہ اگر در خواب دیدمی گفتمے اضغاث واحلام ست۔

اما آنچہ بعلوم عقلی تعلق دارد اگر کسے را بر اں اعراضے عجب نیست، کہ در سخن من سخنہائی غریب ومشکل ہست کہ فہم ہر کس بداں نہ رسد بسیار است، لیکن من بی ام الشرح ہر چہ گفتہ باشم باہر کہ در جہانست درست می کنم وانہ عہدہ بیروں می آیم، ایں سہل است اما آنچہ حکایت کردہ اند کہ در امام ابوحنیفہؒ طعن کردہ است ایں را تحمل نتوانم کرد کہ باللہ الذی لا الہ الا اللہ ھو، کہ اعتقاد من آنست کہ ابوحنیفہ غواص ترین است امت مصطفیٰ علیہ السلام در حقائق ومعنی فقہ وہر کہ خبر ایں از عقیدت من یا از خط ولفظ من حکایت می کند۔ دروغ .... می گوید[1] وحاجت من آنست کہ مراد در تدریس بہ نیشاپور وطوس دبیہ شہرہا معاف دارد تا در زاویہ سلامت خویش شوم کہ ایں روزگار سخن را احتمال نکند والسلام!

حضرت غزالی کے موعظہ وخطاب کو سنجر نے تمام وکمال سُنا اور اس کے بعد یہ کہا: "آپکے ارشادات کی تدقیق اور حضرت امام اعظم کے حق میں آپکے حسنِ اعتقاد کو سمجھنے کی غرض سے یہ لازم ہے کہ میں تمام علمائے عراق وخراسان کو یہاں جمع کروں مگر فی الحال یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنی تقریر وارشادات کو ضبط تحریر میں لے آئیں تاکہ میں ان کی نشرواشاعت کروں اور اس طرح دُنیا کو دکھاؤں کہ علمائے عظام کے حق میں میرا سلوک واحترام کس درجہ ہے۔ رہا یہ سوال کہ تدریس سے آپ کو معاف رکھا جائے۔ ہم آپ کے نام پر مدرسے قائم کریں گے تاکہ وہاں خود علماء آئیں اور جو مسائل مکتوم ومستور ہیں وہ آپ سے سیکھیں اور اپنی مشکلیں حل کریں۔

---

[1] نقطے جہاں ہیں جو الفاظ ہیں وہ اصل کتاب میں اسی طرح درج ہیں۔ شاید صحیح یہ ہو بود انداز قلم رفت!

[2] غزالی، حضرت امام اعظم سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کی عزت وحرمت کرتے تھے لیکن اُن کے مذہب سے بعض اصول میں ان کو چونکہ اختلاف تھا لہٰذا یہ قدرتی امر ہے کہ اُن کے اجتہاد سے بھی بعض مقامات پر اُن کو اختلاف ہوگا۔ اس کی بدیہی مثال وہ مناقشہ ہے جو طبقات (سبکی) میں مناط حکم کی علت ہونے کے قاعدے میں امام غزالی کے تذکرے میں ہے۔

امام غزالی طوس میں اقامت گزیں تھے، جب وہ سنجر سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو اہالیٔ طوس اُن کی سلامتیٔ جان کے بارے میں بہت اندیشہ ناک و فکر مند رہے اور جب اُنھوں نے بخیریت مراجعت فرمائی تو سارا مشہد جوشِ مسرت سے استقبال کے لیے امنڈ آیا اور اُن کے اعزاز میں دعوتیں اور ضیافتیں دی گئیں۔ حجۃ الاسلام نے بعد از معاودت اپنے افادات و تقریر کو ایک کتاب کی شکل میں منضبط کیا اور اُس کا نام "نصیحت الملوک"[۱] قرار دیکر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔

---

[۱] "نصیحت الملوک" کا اصل فارسی نسخہ نہیں ملتا۔ اس کا معلوم و معروف نسخہ وہ ہے جو "التبر المسبوک فی نصیحت الملوک" کے نام سے عربی میں ترجمہ ہوکر کئی دفعہ چھپ چکا ہے اور اس کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ "نصیحت الملوک" اصل میں، محمد بن ملک شاہ کے لیے لکھی گئی تھی مگر کتب خانہ اسعد آفندی کی نمبر ۲۹۲۱ والی کتاب میں "نصیحت الملوک" کا ایک عربی ترجمہ جو کسی دوسرے شخص نے کیا ہے موجود ہے اور اُس میں یہ لکھا ہے کہ "نصیحت الملوک" محمد بن ملک شاہ کے لئے نہیں بلکہ سنجر کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس غیر معروف نسخہ و ترجمہ کے دیباچے میں یہ عبارت ہے:-

اما بعد دری او السلطان السعید السلطان سنجر لبث یوم الم مشور، اسعلا - الی - خدمت شیخ الاسلام حجۃ الاسلام درالامۃ، کاشف الغمہ محمد بن محمد بن الغزالی الطوسی رسکنہ اللّٰہ فی بحبوحۃ الجناں و قال طال ماجال فی روعی نزاع لقیاہ وسلبہ الاختیار منی اشتیاق محیاہ فارجو من کرم حضرت ان بشرنی بحجتہ وان یشطرکنی فی الطاعۃ فی ہذہ الساعۃ - فاجابہ الشیخ الاجل بان دعوۃ المطلوب الی الطالب غیر مناسب و مناف لدعوی الاشتیاق فرکب السلطان سنجر فی الحال مع خدمہ وحشمہ ووصل الی خدمت الشیخ الاجل وصحب معہ فی ذلک الیوم الی اللیل وشارکہ فی الطاعۃ والعبادۃ فلما ارادہ الانصراف قال الشیخ انصح لی حتی اکون علیہ مادمت حیاً فقال الشیخ ارکب الآن فاستوق الی دار العادۃ انشاء اللّٰہ یصل الیک ماینفعک فی الدنیا والآخرہ ان عملت بہ فارسل الیہ علی اثرہ من المواعظ والنعائم! (اما بعد)

کہا جاتا ہے کہ سلطان سعید سلطان سنجر نے دسویں محرم کو شیخ الاسلام، حجۃ الانام، مسلمانوں کے بڑے عالم، مشکلات کو حل کرنے محمد بن محمد بن محمد غزالی طوسی کے پاس ایک قاصد بھیجا (خدا اُن کو وسطِ جنت میں جگہ دے) اور پیام دیا کہ میرے دل میں آپ کی ملاقات کی خواہش بڑھ گئی ہے اور آپ کے دیدار کا اشتیاق مجھے بے اختیار کر رہا ہے۔ میں جناب کے کرم سے یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ اپنے شرفِ صحبت سے مجھے مشرف فرمائیں گے۔ اپنی عبادت میں مجھے بھی اتنی دیر شریک کرلیں گے۔ اِس کا جواب شیخ اجل امام غزالی نے اس طرح دیا کہ مطلوب کی طالب کی طرف بلانا نامناسب ہی نہیں بلکہ دعویٔ اشتیاق کے برعکس ہے۔ اس کے بعد فوراً سلطان سنجر مع اپنے حشم و خدم کے روانہ ہوگیا اور امام غزالی کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ دن سے رات تک اُن کی صحبت میں شریک رہا اور اُن کے ہمراہ اُن کی عبادت میں شریک رہا۔ جب سلطان نے واپسی کا ارادہ کیا تو یہ درخواست کی کہ آپ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں تاکہ میں اس پر تمام عمر قائم رہوں۔ شیخ (امام غزالی) نے فرمایا کہ اس وقت تو آپ سوار ہوکر اپنی جگہ تشریف لے جائیے۔ خدا نے چاہا تو آپ کے پاس ایک مفید خبر پہنچے گی۔ اگر آپ نے اس پر عمل کیا تو آپ کو دنیا اور آخرت دونوں میں فائدہ بخشے گی۔ پھر اس کے بعد ہی مختصر مجموعہ مواعظ و نصائح اُن کے پاس بھیج دیا (از نصیحت الملوک۔ کتب خانہ اسعد آفندی نمبر ۲۱۹۱)۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

یاقوت حموی، صاحب معجم البلدان کا درجہ مصنفینِ مشرق میں اظہر من الشمس ہے۔ علمائے مغرب اس کے معترف ہیں یاقوت تین برس تک مرو میں رہا تھا اور وہاں کے کتب خانوں سے اپنی تصانیف کے لئے استفادہ کیا۔ معجم البلدان کی فصل مرو الشاہجان میں نیز ارشاد الاولیا میں، جو معجم البلدان سے کچھ کم مشہور نہیں اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ تصانیف اُس کے سہ سالہ قیام مرو کا ثمرہ ہے۔ ان تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانے میں مرو میں خانقاہوں اور مدرسوں میں بیس سے زیادہ کتب خانے تھے جن میں سے قابل ذکر عمیدیہ، خاتونیہ ضمیریہ، عزیزیہ اور کمالیہ ہیں۔ عزیزیہ اور کمالیہ ان کتب خانوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے جن میں بارہ ہزار قیمتی اور نادر کتابیں موجود تھیں۔ عزیزیہ کا بانی سنجر کا شربت حی باشی عزیز الدین تھا۔ بالعموم خراسان و بالخصوص سنجر کا محبوب پایۂ تخت مرو اس زمانے میں مرکز علم و فن تھا۔ ان کتب خانوں کے علاوہ اُس کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جس کا ذکر عمر بن کہلانے والے المسنجریہ کے مقدمے میں آیا ہے۔ یاقوت حموی نے ۶۱۶ھ میں مرو چھوڑا۔ وہ سنجر کے کتب خانہ خصوصی کا ذکر نہیں کرتا۔

(بہ سلسلہ گزشتہ) التبر المسبوک کے مطبوعہ نسخے میں "اے بادشاہ" کے خطاب سے جو نصیحت شروع کی گئی ہے، مترجم نے اُس کا محمد بن ملک شاہ کے لئے لکھا جانا دکھایا ہے۔ اس نسخے میں بعض جزئی تصرف اور حکایات کے تقدم و تاخر کے سوا اور غیر مطبوعہ ترجمے میں جس کا نام اصلی کتاب کی طرح صرف "نصیحت الملوک" ہے اور کوئی فرق نہیں۔ اور صاف ظاہر ہے کہ دونوں ایک ہی اصل کے ترجمے ہیں، گو مترجم علیحدہ علیحدہ دو شخصیتیں ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ صاحب التبر المسبوک نے نصیحت الملوک کے اس کی تحقیق نہ کی۔ نصیحت الملوک ملک شاہ کے لئے نہیں بلکہ اُس کے بھائی سنجر کے لئے لکھی گئی تھی اور یہ غلطی تعمیم پیدا کرتی رہی۔

نصیحت الملوک کس موقعہ پر اور کس لئے لکھی گئی؟ ایک بیان تو وہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے یعنی ایک عاشورہ محرم کو سنجر خود آکر ان سے ملا اور سنجر کے طلب و خواہش پر نصیحت الملوک لکھی گئی اور بروق کوس کی ملاقات کے بعد امام غزالی نے سنجر کے حکم سے امام اعظم کے متعلق اپنی رائے اور خیالات کو لکھا۔ دوسرا بیان وہ ہے جو اس مجموعے میں ہے جو اس کا ماخذ ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بروق کوس کی ملاقات کے بعد غزالی نے اپنے اعتراضات لکھے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کتاب نصیحت الملوک لکھ کر سنجر کو بھیجی۔

"چوں این فصل بگفت سلطان سنجر این بود کہ گفت مارا چنیں می بایست کہ جملہ علمائے عراق و خراسان اینجا حاضر بودندی تا سخن تو بشنیدندے و اعتقاد تو بدانستندے۔ اکنوں درخواست آنست کہ این فصل کہ رفت بنویس تا بشنوند آں باطراف جہاں بفرستیم تا جہانیاں اعتقاد مادر علمائے اسلام بدانند۔ اما معاف کردن از تدریس ممکن نیست، کہ فخر الملک جاکہ بود ترا بنیشاپور می برد، جہت تو مدرسہ بنا فرمائیم و جملہ علمائے بیایند و آنچہ پوشیدہ بود بیاورند و اشکالہا حل کنند۔ چوں حجۃ الاسلام بازگشت، باعزازی ہرچہ تمام تر اہل طوس استقبال کردند و شادیہا نمودند و جشنی عظیم ساختند و حجۃ الاسلام این را بنوشت و کتابے تصنیف کرد و نصیحت الملوک و این کتابیست بلیغ در انواع نصیحت و پیش تخت فرستاد (فاتح کتب خانہ کتاب نمبر ۵۶۲۶ - عین مجموعہ)

لہ و خراسان در عہد او منشائے علوم و منبع فضائل و معدن فرہنگ و ہنر بود
(حافظ آبرو، مجموعہ سی داماد ابراہیم پاشاہ۔ کتب خانہ سی نمبر ۹۱۹)

مگر اُس سے تیرہ سال قبل یعنی ۵۴۶ھ میں خزانۃ السلطان سنجر کے نام سے ایک کتب خانے کا ذکر پایا جاتا ہے[1]۔ اس لئے یقیناً اُس زمانے میں اس کا ذاتی کتب خانہ بھی ہوگا۔ علاوہ بریں سنجر کی وفات کے تقریباً پچاس سال بعد تک اس کتب خانے کی خصوصیات باقی رہنا پایا جاتا ہے۔ کشف الظنون سے نقلاً بیان کیا گیا ہے کہ ابوبکر نام ایک شخص خاص اس کتب خانے کے دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو یاقوت کا اِس کا ذکر نہ کرنا شاید اس بنا پر ہو کہ اس کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا۔ علماء و افاضل جوق جوق اس کتب خانے سے استفادہ کرنے کے لئے مَرو پہنچتے تھے اور ان کتب خانوں کے حافظ (لائبریرین) بھی مشہور اور جید علماء ہوتے تھے۔ ان میں سے محمد بن سعد الدیباجی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ زمخشری نے ان سے ملاقات کی تھی۔ محمد بن سعد نے الموزج کی ایک مشہور شرحِ مفصل کے نام سے لکھا تھا۔ یہ جامعۂ اکبر کے کتب خانے کے مہتمم تھے[2]

اس مضمون کے ابتدا میں ہم نے تاج الاسلام ابوسعد سمعانی کا ذکر کیا ہے۔ سمعانی خاندان اُس وقت نہ صرف مَرو بلکہ بلادِ اسلامی میں علم و فضیلت، اصالت و نجابت میں امتیازِ خاص رکھتا تھا۔ ابوسعد بہ یک وقت مدرسہ عمیدیہ میں درس دیتے تھے۔ منجملہ ان کے انساب کے متعلق ایک کتاب ہے جس کی تالیف میں صاف ظاہر ہے۔ تاج الاسلام نے مَرو کے کتب خانے کو کس قدر بافیض مرجع اور منبع پایا۔ اُن کی تصانیف کو سلائے یورپ نے چھاپنا شروع کیا ہے۔ تاج الاسلام کے تذکرے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے بیس جلد کی ایک تاریخ مَرو بھی لکھی تھی جس کا مواد بیشتر مَرو کے کتب خانوں سے حاصل کیا گیا تھا۔

سنجر عمر بھر فتح نصیب رہا لیکن ۵۴۸ھ میں اُس نے قبیلۂ اوغوز کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اس شکست کا یہ نتیجہ ہوا کہ خراسان کے علماء اور مشائخ کی ایک بڑی تعداد قتل ہو گئی اور کتب خانے نذرِ آتش ہو کر محو و نابود ہو گئے۔

۶۱۶ھ میں علاء الدین محمد خوارزم نے بھی سخت ہزیمت کا منہ دیکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ملک ویران کر دیا گیا۔ نہ مسجدوں کا کوئی نشان رہا نہ مدرسے، نہ کتب خانے اور اس فاجعہ سے وہاں کی زندگی بالخصوص حیاتِ علمی پر آخری اور کاری ضرب پڑی[3]۔

یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ سنجر کے زمانے میں اور سنجر کے نام معنون ہو کر ہر علم و فن میں کتابیں تصنیف ہوئی تھیں۔ لیکن کاتب چلپی نے اپنے کشف الظنون جو کتب اسلامیہ کے متعلق سب سے قیمت دار تصنیف ہے۔ زیج السنجری کے سوا کسی اور کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ استنبول کے کتب خانوں میں بھی ہم نے کافی تحقیقات کیں مگر افسوس کہ اس کا ثمرہ بہت کم ملا۔ بے حد تلاش و جستجو کے بعد ہمیں صرف اِن کتابوں کا پتہ چلا ہے:-

السنجریہ فی کائنات العنصریہ:۔ مصنفہ عمر بن کملان الساوجی۔ آج کل کے تقسیم علوم کے حساب سے اس کتاب میں

---

[1] تحفۃ الملوک فارسی مختصر فی الطب لابی بکر بن... حمد اولی الحمد للہ الذی اکرم عبادہ باشرف آلاتہ الخ ذکر فیہ انہ وجدہ خزانۃ السلطان سنجر سنہ ۵۴۶ھ (کشف الظنون)

[2] بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ، ص ۵۴، مصر طبع۔

[3] اس فاجعہ کی دلدوز تصویر ترکی مصنف ناسق کمال بے نے اپنے مشہور ڈرامے "جلال الدین خوارزم شاہ" میں کھینچی ہے۔ یہ ترجمہ اُردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے (مرتب)

طبقات الارض، حکمتِ طبیعیہ اور ہیئت سے بحث کی ہے۔

اسماء و العالم:۔ یہ قدیم یونانیوں کے سماء و عالم کے متعلق تحقیق ہے اور امام غزالی کی —
نصیحت الملوک:۔ جس کا ہم اُوپر ذکر کر آئے ہیں، اس کے علاوہ —!
تحفۃ الملوک:۔ نام بھی ایک کتاب دستیاب ہوئی ہے جو غالباً سنجر کے زمانے ہی میں تالیف ہوئی تھی اور اُس کے کتب خانے میں موجود تھی۔ یہ فنِ طب سے متعلق ہے۔ سنجر اپنے زمانے شعرا کا بھی خاص طور سے سر پرست اور مربّی رہا ہے۔ چنانچہ دولتِ سلجوقیہ کے شعراء میں سے بدیع الدین کو اسنجری، ضیا السنجری، فرید الدین جاسوس الاخلاکی العلی المنجم السنجری، شمس الدین مبارک شاہ ابن الاعز السنجری، اس کے پروردۂ فیض و کرم تھے۔ جس سے ادیب صابر، رشید وطواط، عبدالواسع جبلی، فرید کاتب، انوری، قادری، ملک المبادی، زروفی، سید حسن غزنوی بھی کچھ کم بہرہ ور نہیں ہوئے۔

ہم اس مضمون کو تمام کر چکے تھے کہ مستشرقِ روس بار تولد کی کتاب "ترکستان بہ زمانۂ استیلائے مغول" ہماری نظر پڑی۔ فاضل مصنف نے اپنی کد و کاوش کے تمام ماخذ و مرجع اس کتاب میں بالتفصیل بیان کئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سنجر کے کاتب منتجب الدین بدیع اتابیک کے عتبہ کتبہ نام ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جس کا ایک نسخہ صرف پطرس برگ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ عتبہ کتبہ مجموعۂ رسائل ہے۔ اس میں رمضان ۵۲۷ھ کا لکھا ہوا ایک خط موجود ہے جو اس ذی اقتدار انشار پرداز منتجب الدین کے زورِ قلم کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں اُن کی زبانی سنجر کے پڑھنے لکھنے سے بے بہرہ ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔
تمام مؤرخ جس بادشاہ کی علم دوستی اور معارف پروری کے بارے میں متفق ہوں، جس کے نام پر سینکڑوں علماء نے زبردست تصانیف معنون کی ہوں، اُس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ پڑھنا لکھنا بھی نہ جانتا تھا، غرابت سے خالی نہیں[1]

---

[1] محققین یورپ اس بارے میں اکثر پُر لطف تحقیقات کیا کرتے ہیں۔ مثلاً انگریز مؤرخوں کی تحقیق ملاحظہ ہو جو انہوں نے عالمگیر کے متعلق کی ہے۔ عالمگیر نے اپنے اکثر رقعات میں اپنے گناہگار ہونے کا اعتراف کیا ہے اور خوف کھاتا ہے کہ حشر میں وہ نامعلوم کس پاداش کا سزاوار ٹھہرایا جائے۔ مورخین اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خود اورنگ زیب کو اپنے ظالم اور سفاک ہونے کا اقرار تھا اور اُس کا ضمیر اُسکی ملامت کرتا تھا۔ یورپ کی خود ستا ذہنیت اس بات کو سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتی کہ نیک شخص بھی اپنی بشریت کی بنا پر اپنے تئیں ہر وقت گناہگار اور خطاوار خیال کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک دوست نے ایک لطیفہ بیان کیا جس کا یہاں نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا — ایک صاحب بہادر عربی و فارسی سیکھنا چاہتے تھے۔ ایک رئیس سے جو اُنکے سلام کو حاضر ہوا کرتے تھے اُنھوں نے اس ارادے کا ذکر کیا اور کہا آپ کسی مولوی کا نام بتا سکتے ہیں جو قابل ہو اور مجھے پڑھا بھی سکے! رئیس نے کہا "حضور فلاں مولوی صاحب بہت قابل ہے"۔ مولوی کو بلایا گیا۔ صاحب نے کہا "ول! فلاں رئیس نے ہم سے کہا ہے کہ تم بہت قابل ہو"! مولوی صاحب نے ازراہ انکسار عرض کیا "یہ اُنکی قدر افزائی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم! میں محض ایک جاہل آدمی ہوں"! صاحب نے کہا "اچھا رخصت"! اور دوسرے دن اُن رئیس صاحب کو بُلا کر سخت ڈانٹا کہ تم نے ہم کو سخت دھوکا دیا۔ وہ مولوی کہتا ہے کہ وہ بالکل اَن پڑھ ہے"! موسیو بارتولد کی تحقیق بھی اسی زمرے میں شمار کرنا چاہیئے۔ (مترجم)

یہ قطعاً ثابت ہے کہ وہ جاہل نہ تھا۔ اگرچہ علومِ اسلامیہ منقول و شفاہی رہے ہیں اور جیسا کہ التدوین فی اخبار قزوین میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ علمِ حدیث میں ایک بلند پایہ عالم تھا۔ اس بنا پر شاید یہ کہا جائے کہ اُس کا علم بیشتر صحابۂ کرام کی طرح جو لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے، حافظے سے تعلق رکھتا ہے۔ دیانت و تقویٰ میں جو علومِ اسلامیہ کا بہترین ثمرہ ہے، وہ سب سے فائق تھا۔ سنجر ذوقِ ادب بھی بدرجۂ کمال رکھتا تھا۔ چنانچہ خود اُس کے شعر ہمارے خیال کی تائید کرتے ہیں[۱]۔

ماہ ملک خاتون، سنجر کی چہیتی بیٹی تھی۔ اُس کی وفات سے سنجر اس قدر متاثر ہُوا کہ اُس نے رو رو کر اپنا نورِ بصر زائل کر لیا۔ بخارا کے مشہور مرثیہ گو عمق کو اپنے پاس بُلا کر اور اُس کے مرثیوں کو سُن کر سنجر اپنے غم کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ آدغوز سے شکست کھا کر وہ اُن کا قیدی ہو گیا تھا۔ اُس کی بیوی ترکان خاتون بھی اُس کے ساتھ تھی۔ جب تک وہ زندہ رہی اُس نے فرار ہونے کی کوشش نہ کی۔ ترکان خاتون کی وفات کے بعد ایک نہایت آسان طریقے سے وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا[۲]۔

ان دونوں واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے عیال و اولاد سے کس درجہ محبت کرتا تھا اور اُس کی گھر کی زندگی کیسی خوشگوار تھی۔ سنجر اپنی قومی زبان (ترکی) کا کس قدر دلدادہ تھا اس کا اندازہ اس واقع سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے ایک شخص تغلدبک کا شعری کو جو ترکی کے علاوہ اور کوئی زبان نہ جانتا تھا، وزارت کے رتبے تک پہنچایا!

سیّد سجاد حیدر یلدرم

---

[۱] به زخمِ تیغ جهان‌گیر و گرزِ قلعه‌کشای — جهان مسخرِ من شد چو تن مسخرِ رای
بسی قلاع کشودم به یک اشارتِ دست — بسی مصاف شکستم به یک فشردنِ پای
چو مرگ تاختن آورد هیچ سود نداشت — بقا، بقای خدایست و ملک، ملکِ خدای

[۲] حبیب السیر۔ ج ۱، ۳ جز ۴

کلامِ یلدرم

سر سیّد احمد خان مرحوم

۱

دُور دل سے اب خیالِ زحمت و آلام کر
کوثر و تسنیم سے شیریں دہان و کام کر
واسطہ اللہ کا اس وقت اتنا کام کر!
جانشینوں کو ذرا تفہیم کر افہام کر
خوب محنت کر چکا آرام کر آرام کر!

۲

مشکلوں کا ہم پہ گر باراں ہے تو تجھکو کیا
قالبِ قومی اگر بے جان ہے تو تجھکو کیا
ایک عالم ششدر و حیراں ہے تو تجھکو کیا
خانہ جنگی کا اگر ساماں ہے تو تجھکو کیا:
گر قیامت ہو یہاں برپا تو تجھکو کیا خبر!

۳

اب مسلمانوں میں ایسا درد والا کون ہے
طلعتِ اسلام کا شیدا و والہ کون ہے
بہتری کا جس نے ایسا ڈھنگ ڈالا کون ہے
اپنے سر پر بار کا یوں لینے والا کون ہے
کون ہے جو دے دعا دشنام دیں اسکو اگر

۴

رحمتیں تجھ پر کہ تو اب کام اپنا کر چکا!
کام اپنا کر چکا اور نام اپنا کر چکا!
اپنے ہم عصروں سے اونچا بام اپنا کر چکا
کلفتیں بھی سب سہیں آرام اپنا کر چکا!
تیری رُوحِ پاک پر ہو حق کی رحمت کا گزر

(اگست ۲۷ء)

غزل (فارسی)

رفتم اے دل من ازیں بزم شتاباں رفتم
گلہ مند از کرم و مہر کریماں رفتم!
داشتم سینہ و دل پر ز ہزاراں ارماں،
کس نہ گوید کہ تہی کیسہ و داماں رفتم
در جبینم چہ نوشتست بگو نجم شناس
بخت من ہر چہ دہد، خرم و شاداں رفتم
دل گرفتہ نہ روم پیش کس غنچہ مثال
نکہت افشاں چوں دم بادِ بہاراں رفتم
چوں نہ دیدم ز عزیزاں کرم و لطف و وفا
بہ درِ خانۂ اغیار غزل خواں رفتم

(جولائی ۲۹ء)

عائشہ صدیقہ کے عقد کے موقع پر

عصمت کا دُرِ حیا کا صدف علم و فن کا پھُول
گوہر یمن کا ایسا نہ باغِ ارم کا پھول
صدقہ میں اس شرف کے کہ ہے بنت فاطرؓ
پاکیزہ سیرتی میں ہے وہ یاسمن کا پھُول
آنکھوں میں نور اس سے معطر مشامِ جان
وہ شمع انجمن بھی ہے اور انجمن کا پھُول
یارب ہمیشہ طرہ و دستار ہی رہے!
غربت میں جا رہا ہے ہمارے وطن کا پھُول

اے سروِ باغ حضرت مہرِ جناں مقام!
ہم آج تم کو دیتے ہیں اپنے چمن کا پھُول

(۲۲ر جولائی ۲۹ء)

عذرا حیدر کے نکاح کے موقع پر

آج چمن میں ہے بہار گل بھی ہیں اور گلعذار
مجھ سے خطیب شاخسار کہہ رہی ہے یہ بار بار!
نکلیں گی کیسی حسرتیں دل میں ہیں اس کی کاہشیں
اس پہ کروں گا نالشیں شیخ حرم ہو ہوشیار!
نشہ میں جھومتے ہیں سب سرخوش بادۂ طرب
اذن ہے محتسب کا اب کر لو گناہ بے شمار!
کس کو خیال عز و جاہ، کس کو خیال رسم و راہ
مَیں تو ہوں رند بے پناہ چھیڑو نہ مجھ کو زینہار!
توبہ شکن ہے مے فروش چار طرف ہے نا و نوش
شرعِ مبیں کا کس کو ہوش کیوں ہوں نہ میں بھی بیکسار
آج ہے مجھ کو انتظار حسرت دید روئے یار
اے کہ ستم تراشعار گاہ زہد یاد آر!
راحت جاں بے قرار آ کہ مجھے بھی ہو قرار
اب نہیں تاب انتظار کچھ تو ہو عہد استوار!
ہجر میں کیا تھیں حالتیں کیسی سہی تھیں کلفتیں
مَیں نے اٹھائی زحمتیں جانتے ہیں وہ راز دار!
گرچہ رہا میں غم بدوش، آہ نہ کی رہا خموش
کعبۂ دل سیاہ پوش کیا کہوں کیا تھا حال زار!
شکر کہ آج آگیا، خانۂ دل بسا گیا!
رُوح پہ میری چھا گیا، آج تو مَیں ہوں بختیار!
مجھکو خوشی ایک اور ہے، لانا تو ایک جام مے
تخت کیان و تاج کے، ایسی خوشی پہ سب نثار!
آج سعید ہے سعید آج کے روز اپنی عید
غنچۂ آرزو دمید، نخل مراد بار دار!
ایک وحیدۂ زماں صاحب علم بے کراں
مایۂ ناز دختران، علم و حیا کی تاجدار!
آج ہے ان کا ازدواج عرش پہ گفتگو ہے آج
ملک وفا کا تخت و تاج ان کو ملا بہ اعتبار
گلشن دہر میں بسیں تا بہ ابد وہ خوش رہیں
دیکھ کے ان کو سب کہیں ہوتے ہیں ایسے بختیار

ان کا نصیب کامگار، ان کا زمانہ سازگار
غنچۂ دل کھلیں ہزار، ان کی چمن میں ہو بہار!

ٹونک راج
ار جولائی سنہ

انتہائے یاس

گر تمناؤں کو اس دل کے سوا کچھ نہ ملا — حسرتوں کو نہیں دنیا میں کوئی اور جگہ
تھا یہی لکھا اگر سارے ہوں ارماں یکجا — خواہشیں وار کریں دل پہ ہر اک شام و پگاہ
تو مجھے عذر نہیں

مجھ کو قسامِ ازل نے نہ دیا کچھ جز یاس — نا امیدی کیلئے میں ہی تو ہوں خاص الخاص
دل شکستہ ہوں، سیہ بخت ہوں اور ہوں بے آس — مجھ پہ ہی پڑتے ہیں، تیر ستم و تیغ قصاص
یہ بھی ہوتا ہے کہیں

رخصتِ نالہ و فریاد، نہ فرصتِ آہ — خون دل خون جگر، کھانا ہے ہر وقت صباح
فی المثل غم ہے اگر کاہ ربا میں ہوں کاہ — چین اک لحظہ، ایک لحظہ کو امیدِ فلاح
اپنے حصہ میں نہیں

کاش معلوم ہو مجھ کو کہ ملی کیوں یہ حیات — سارے عالم کا الم اور یہ چھوٹی سی بساط
اپنی ہستی میں تو شاید نہ ملے ان سے نجات — لاکھ کوئی کہے مجھ سے کہ ہے عالم میں نشاط
کون کرتا ہے یقیں

دست و پا اپنے ہی جب ہو گئے اپنے غماز — تو ہی اے خاک چھپا لے ہمیں ہو کر فیاض
اب تو اس عالم عصیاں کی ہوا ہے ناساز — ہم سے خالی ہو کہیں جلد یہ دنیا کی بیاض
لے اجل جان حزیں!

اپنے دوست سید محمد عباس کی شادی کے موقع پر

اب کے تنہا نہ مرے حضرت عباس گئے! — آ گئے اور ساتھ لئے دانۂ الماس آئے
علم کے چونکہ ہمیشہ سے رہے ہو عاشق — آپ کے پھر پری علم نہ کیوں پاس آئے
لکھنؤ آنے کو آتے ہیں مگر یہ نہ آنا — جیسا آیا ہے جوانوں کو یونہی راس آئے

دل ہی ہے رازِ محبت کا حقیقی رہبر
رہنمائی کے لئے حضرت الیاس آئے

عذرا و سعید[1]

چہ روز مسرت چہ روز سعید — بفضلِ خداوند مارا رسید
سعید جگر گوشہ ام نور عیں — عروسی او ہست یا جشن عید
چناں بر زمیں زہرہ آمد ز چرخ — خمید و چمید و دمید و رمید
چو پرسیدم از وے چہ حالست گفت — چرا من نہ رقصم بطرزِ جدید!
بخوانم، برقصم بہ نازم ہما — کہ یزداں مرا بریں آفرید!
سرشتم طرب نغمہ روح من است — زمن عشق و مستی بباید خرید!
من و چنگ و بربط من و رنگ و نے — من و ساز عشرت کہ وقفش رسید
بسے منتظر بودم ایں روز را، — دلم ہر چہ خواست آمد پدید
کنوں از ازدواج سعید است ہاں — بیا تا رسانم بہ ہر کس نوید!
بہ ہر کس صلا ہر چہ خواہی بکن، — مباح است ہر شے، ز من ایں نوید
بلے شرع شد مرتفع گفت باز، — خمید و چمید و دمید و رمید
چو پرسیدم از دل فغاں کرد گفت — چہ ہاتف ندا کرد باید شنید

"خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید!"

امتیاز حیدر کی شادی پر

کیا تعجب ہے اگر میں پھر غزل خواں ہوگیا
پھر خدا کے فضل سے عشرت کا ساماں ہوگیا

عشق کے کوچے میں ہم کھاتے ہیں ٹھوکر دیکھ کر — وہ بھی کیا رہرو ہے جو چلتا ہے سنبھل کر، دیکھ کر
کھیلتے ہو، کھیلو اس سے رہنا لیکن ہوشیار — یہ نہیں ہے برف، یہ ہے دل کا اخگر، دیکھ کر!
یہ بہارِ ابر و باراں، یہ فضائے جاں فزا — میکشو بیٹھے ہو کیوں، مینا و ساغر دیکھ کر

---

[1] اپریل سنہ ۱۹۴۱ء میں یلدرم کی بے حد چہیتی بھتیجی عذرا خاتون (جو ان کے منجھلے بھائی سید نصیر الدین حیدر کی صاحبزادی ہیں) کی شادی یلدرم کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید وحید الدین حیدر کے بیٹے سعید الدین حیدر سے ہوئی تھی۔ نظم نمبر ۴ "آج چمن میں ہے بہارِ گل بھی......" اور یہ نظم بھی اسی وقت کہی گئی تھیں۔

ساقی و مے، مطرب و نے اور رندوں کا ہجوم
کاش ناصح بھی چلے آئیں یہ منظر دیکھ کر!
فکر انساں تک نہ پہنچے رہ گئے رُوح الامیں
اپنے بازو تول کر اور اپنے شہپر دیکھ کر!
وہ بھی ہیں جو منتظر رہتے ہیں وصل یار کے
ہوش میرے اُڑ گئے دلبر کو گھر پر دیکھ کر!

حج کے بعد

شکر ایزد ملا شرف یہ مجھے
جس سے محروم تھے مرے اب و جد
کر لیا میں نے حج بیت اللہ
یہ جبیں اور بارگاہ صمد!
دیکھ آیا مزار پاک رسولؐ،
بن کے رشک اویسؓ تا بہ ابد
لیکن آں حالتیست حالت من،
کہ من و او را ضمیر من سنجد!
پرتو نور او چو نیست بہ قلب
چہ شود گر کسے جبیں ساید
"خر عیسیٰ اگر بہ مکہ رود،
چوں بیاید ہنوز خر باشد!"

غزل

بے حس ہے گرچہ داغ بظاہر قمر میں ہے
غم کی کسک ہمارے ہی داغ جگر میں ہے
طفلی میں تیری بخت تو پیری میں تیرہ بخت
کیا فرق ہم نشیں مرے شام و سحر میں ہے
ایواں آرزو ہی میں ہے شان آرزو
جبتک ہے دل میں تب ہی تک انکی نظر میں ہے
کیوں اہل درد ہوتے ہیں اس درجہ اہل راز
حیرانی ایسی کس لئے اہل خبر میں ہے
سجاد بے قرار لئے قلب بے قرار
ہر وقت رہ نورد ہمیشہ سفر میں ہے!

ساون

قافلہ حسرت و ارمان کا گھٹا ساون کی
کارواں دل کی امنگوں کا ہوا ساون کی
تا قیامت رہے قایم یہ سیہ مستیٔ ابر،
یا الہیٰ نہ جوانی کو گھٹا ساون کی

آج تو بخل نہ کر تیری کریمی کے نثار — جھومتی آتی ہے ساقی وہ گھٹا ساون کی!
چشم بد دُور یہ ہے ابر کہ چشم مجنوں — آہ عاشق ہے نہیں ہے یہ گھٹا ساون کی

لڑکھڑاتی وہ چلی دیکھو مری توبۂ صبح!
آنکھ شرمائی ہوئی منہ پہ ردا ساون کی

(۱۹۲۳ء)

آسماں

مجھ کو اے آسمان نافرجام — آج کیوں جھک کے کر رہا ہے سلام
سرکشی ہے ازل سے تیری سرشت — آج تک تو ہُوا کسی سے رام؟
قیس و فرہاد و لیلیٰ و شیریں — تیرے ہاتھوں رہے سدا ناکام
میں کہاں اور وہ حبیب کہاں — یوں پریشاں ہوں منتشر اجسام
پس محقق ترا سلام ہے طنز — خاکساری ہے تیری مکر تمام

تفرقہ تو نے یہ جو ڈالا ہے
ہاں اسی کی خوشی کا ہے یہ سلام!

غزل

اگر ایں نیم نفس از قفس آزاد کُنم، — عمر خود صرف بہ بدنامی صیاد کُنم!
بہ گرفتاری و تنہائی خود می گریم، — ہمرزناں یاد ز سرو و گل و شمشاد کُنم!
اے خوش آں روز کہ در محضر شاہنشہ گل — جور صیاد بیاد آورم و داد کُنم!
باغباں ریزہ خور نعمت صیاد بود — من دیوانہ عبث ایں ہمہ فریاد کُنم!
خود بخود از آمدن پیک اجل می خندم — زندگی بیں کہ بمردن دل خود شاد کُنم
کشور جاں مرا یاد بہ اغیار فروخت — بے سبب من بہ رقیباں ز چہ ایراد کُنم
دیگر آزادی من سود نہ دارد چوں عمر، — نیست کافی کہ روم لانۂ آباد کُنم

حاصل مدرسہ جہلت و ضلالت اے شیخ
سوئے میخانہ بیا تا منت ارشاد کُنم!

(۱۹۲۱ء)

تاج و حجاب

اس میں کچھ نکہت ارمان فزا آتی ہے — ناز کرتی ہوئی جو باد صبا آتی ہے
للّٰہ الحمد تجرد کی ہے تاریکی ختم — عیش مشروع کی اب شمع ہدیٰ آتی ہے
واہ کیا خوب ہے زہرہ و عطارد کا یہ عقد — وجد میں جس سے کہ روح ادبا آتی ہے
ہیں تخیل کے درخشندہ ستارے دونوں — ان سے اقلیم صحافت میں ضیا آتی ہے
قیس و لیلیٰ کو سکھائیں گے یہ درس الفت — ان کو تفسیر رہ و رسم وفا آتی ہے
کتنا بے چین رہا آرزوؤں سے لے دل! — تیری بے تابی کو لے آج دوا آتی ہے
لائیں گے تم کو جو آئین کشش ہے قائم — جا کے حسرت انہیں یہ بات سنا آتی ہے
نہ سُنی ہو تو اسے سُن لو حجاب اسماعیل — تاج کے دل سے یہ ہر لحظہ صدا آتی ہے

"بے حجابانہ بیا از در کاشانۂ ما!
کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانۂ ما!"

۱۹۳۳ء

مرثیۂ داغ

مجھ کو مسرت نہیں، گر ہے ہوا مشکبار — مجھ کو غرض ہے کیا، اگر چاروں طرف ہے لالہ زار
پاس نہ آئے مرے، اب نہیں اس کا دماغ — پھیلی ہے پھیلا کرے، نکہت مشک تتار!
میرے لئے اس کے بل، افعی و کژدم کے بل — اب نہ پریشان کرے مجھ کو کبھی زلف یار!
مَیں تو سمجھتا ہوں ہے، خندۂ گل زہر خند — سوگ میں ہیں سبز پوش باغ کے سب برگ و بار!
اپنے ہی جب باغ کی ہو گئی چُپ عندلیب — اپنی نواسنجیاں، اب نہ سُنائے ہزار!
آنسوؤں کی ہو جھڑی آنکھ سے جب لگی ہوئی — واسطے مجھ کو ہے کیا، دہر میں ابر بہار!
تجھ کو چھپا دے گا آج، میرا یہ سیلانِ اشک — دجلہ! نہ طغیانی کر، حد سے بڑھ زینہار!
واسطہ اللہ کا، اے بلغائے عرب! — تم کو نبی کی قسم، اے فصحائے تتار!
آج ذرا کے لئے چپ رہو، خاموش ہو — رونے دو دل کھول کر، دل میں بھرا ہے بخار
تم کو بتاؤں میں کیا، روتا ہوں کیوں اس طرح — دل سے نکلتی ہے کیوں آہ حزیں بار بار!
آہ! کہ گھٹی میں جو اپنی پڑی تھی زبان — جس پہ میں دل سے فدا جس پہ میں دل سے نثار

شاعرِ بے مثل آج اس کا جہاں میں نہیں!
خالی مکاں ہے، مکیں، ہائے، مکاں میں نہیں!

کس کو سُناؤں یہاں اپنی حزیں داستاں — کوئی نہیں ہم نوا، کوئی نہیں ہم زباں —!

نذرِ بلبل بہت، مینا کی قلقل بہت   غیر کی یہ انجمن، غیر ہی کا بوستاں!
انکو ہنسی سے ہے کام، عیش سی ہیں وہ بامراد   پوچھتے ہیں کہ تیری کیوں آنکھیں ہیں خونچکاں
پرسشِ احوال کا، کتنا ہوں منت پذیر   آپ کا یہ پوچھنا، ہے سببِ امتناں
کیسے بتائیں تمہیں کا ہے کا ہے غم ہمیں   ہوگیا خاموش آہ! بلبلِ ہندوستاں
نالہ مرا دل خراش، آہ مری نارسا پاکش   تم ہو مگر نابلد، بہرے ہیں کر دو بیاں
زہد و ریا شاد ہیں، روتے ہیں پر حسن و عشق   اُٹھ گیا ان کا جیر، چل دیا وہ مدح خواں
خاکِ دکن تو نے آہ، لے لئے آغوش میں   بھیجے تھے قدرت نے دو، اُردو کے دو باغباں
ایسے کہاں ہم نوا، ایسے کہاں ہم صفیر!   باغ میں خاموشی ہے، گنگ ہیں اہلِ زباں
باغ میں خاموشی ہے، مَیں نے غلط یہ کہا   شور ہے فریاد ہے، نالہ و آہ و فغاں:
اُردو کے گلشن میں بس باقی تھی اک عندلیب   وہ بھی نہیں آہ آج، اُڑ گئے سوئے جناں!

زاغ و زغن شاد ہو، جو کرو آزاد ہو
خوب کرو کائیں کائیں خوش رہو آباد ہو

اس سے بھلا فائدہ، کیوں ہے یہ سب اہتمام   میرے لئے عمر بھر اب تو ہے ماہِ صیام
ساقی اگر وہ نہیں، مَیں نہ پیوں گا شراب   پھینک دو، رکھتے ہو کیوں سامنے مینا و جام
آئے وہ پیرِ مغاں، خالی ہے بزمِ جہاں   جامِ سخن بھر کے دے، پھر چلے دورِ مدام
شعر و فصاحت کا نہیں، لطف سلاست کا نہیں   ہائے اجل تجھ سے لیں کس کا بتا انتقام
تیرا بھی اے شاعری، دَور تھا، یہ آخری   آج تو رخصت ہوئی، ہند کو کر کے سلام
مٹ گئی، مٹ جانے دو، شعر کی گر آبرو   اس پہ یہ احساں کرو، دل سے بھلا دو یہ نام
میں بھی ہوں خوش اے عدو، کیف نہ گر اتنا ہو   جانتا ہوں دل کا داغ، رہ گیا بے التیام
آپ کو معلوم ہے، اے شہِ ملکِ دکن؟   آپکو کچھ ہے خبر آج حضورِ نظام؟
آپ کے دربار کے ہو رہے ہیں سب نو رتن   ایک نہیں ہے مگر شاعرِ شیریں کلام!
اس کے نہ ہونے سے ہے آپکا دربار گنگ   جتنے ہیں ممکن نہیں ان سے حصولِ مرام
آپ کا دربار کیا ملک ہے اب بے زباں   آتی ہے دل سے صدا، ہند سے یہی مدام

داغ نہیں دہر میں، دل ہے مرا ایک داغ!
شعر کا ویران ہے گھر، نظم کا گل ہے چراغ!

(بغداد سے ۔ ۱۹۰۵ء)

کشمیر و حُسنِ کشمیر

یا انہیں نخرِ حسیناں نہ بنایا ہوتا
یا انہیں جامۂ شاہانہ پہنایا ہوتا

تو نے جنت جو یہ دُنیا میں بنا رکھی ہے
کاش شیطاں کبھی اس میں نہ آیا ہوتا!

مملکت یہ جو ہے پریوں کی، سلیمانوں کی
اہرمن نے تو یہاں دخل نہ پایا ہوتا!

قیس وارفتۂ لیلیٰ ہی رہا، صحراء میں
یہ مرقع تو کبھی اس کو دکھایا ہوتا

مجھ کو طوبیٰ کا نہیں چاہیئے سایہ ہرگز
ان چناروں ہی کا فردوس میں سایہ ہوتا

حوضِ کوثر کے عوض چشمۂ شاہی ہی ملے
یہ نہیں ہوگا تو منعم سے ہمیں ہونگے گِلے

میں نہ جاؤنگا، نہ جاؤنگا جو کشمیر نہیں
لاکھ جنت ہو پہ ایسی تو وہ تعمیر نہیں

حوریں بن جائیں گی واں جا کے بتانِ کشمیر
ورنہ فردوس عجوزوں ہی کی جاگیر نہیں

ان کو بزدل نہ سمجھنا ہیں بلا کے سفاک
پاس گو کہنے کو شمشیر نہیں تیر نہیں

اپنے قیدی کے لئے زلف ہی کیا کچھ کم ہے
گرچہ ان کے پاس سلاسل نہیں، زنجیر نہیں

کیا عجب گر ہوئے بھی پیر بتانِ کشمیر
ہیں یہاں سب جوان نام کو بھی پیر نہیں!

پر غضب ہے کہ یہاں موت چلی آتی ہے
غربت امراض کو بھی ساتھ لگا لاتی ہے

ہم کو اس عالمِ بالا کی خبر ہے معلوم
جسکی مدت سے دُنیا میں پڑی ایسی دھوم

بیش ازیں نیست کہ کشمیر کی ہوگی اک نقل
وہ بھی دھندلی سی پریشاں سی مثالِ موہوم

جب میں سمجھوں گا کہ بر آئی تمنائے دلی
ایک کشمیری ہو، خنجر ہو، مرا ہو حلقوم!

تجھے جو لایعنی صنم انکی پرستش ہوئی منع،
نہیں کشمیر میں اصنام پرستی مذموم!

پاؤں پر دخترِ دہقاں کہ وہ رکھ دیتا سر
کبھی کشمیر میں آجاتا اگر قیصرِ روم!

مَیں بھی اے کاش کسی وادی ہی میں کھو جاؤں
یا کسی حُسن کی دیوی پہ فدا ہو جاؤں۔!

ہماری مطبوعات!

No. 5 A.I.N.E.C. Office: 2224 Res. : 4793 P.—68.

میں کیوں سوچوں

میں کیوں سوچوں

جوگندر پال

جوگندر پال

ADBISTAN—E—URDU, Hall Bazar AMRITSAR.

Price Rs. 3/-

ادبستان اردو